PAKISTAN
سرزمینِ بے آئین
پاکستان کی تباہی اور بربادی کے منظر اور پس منظر
میں حقیقی کرداروں پر لکھا جانیوالا یادگار ناول
انور ایوب راجہ

انتساب

احمد اور ابراہیم

کے نام

جو حالات کے طوفان میں کھو گئے

میں ۔اور۔ وہ

پچیس ہزار پونڈ سالانہ کے علاوہ اڑھائی ہزار پونڈ ہر چھ ماہ بعد اضافہ۔۔۔۔۔

کام ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بطور براڈ کاسٹر اور اینکر پرسن، تفریحی پروگراموں کی میزبانی اور پروڈکشن کے علاوہ چھٹی جانے والے میزبان خواتین وحضرات کی نمائیندگی اور پروڈیوسر خواتین وحضرات کی ضرورت پڑنے پر مدد۔۔۔۔۔

معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے میں بھول گیا کہ اگر میں بیمار پڑ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ معاہدے میں میری بیماری یا ایمرجنسی کی کوئی شق موجود نہ تھی اس لئے اللہ نے برطانیہ کے دوسرے بڑے براڈ کاسٹنگ کے ادارے میں نوکری کے دوران مجھے صحت مند ہی رکھا اور کسی بیماری یا ایمرجنسی سے دوچار نہ ہوا۔

معاہدے کی رو سے اگر ادارہ مجھے نوکری سے نکالنا چاہئے تو تین بار وارننگ پھر چارج شیٹ اور آخر میں شکریے کا خط لکھ کر نوکری سے برخاستگی۔۔۔۔۔

اگر میں خود نوکری چھوڑنا چاہوں تو تین ماہ قبل ادارے کو نوٹس اور تیسرے ماہ کے آخر میں ادارے کی طرف سے کام پر نہ آنے کا خط اور معاہدے کی منسوخی۔

جاب سنٹر یعنی بیروزگاروں کو زندہ رہنے کیلئے خوارک کیلئے پچاس پونڈ ہفتہ نہ دینے والے ادارے کے باہر درجنوں لوگ کھڑے تھے۔ گورے، کالے، ایشیائی اور افریقی۔ کچھ لائن میں تھے اور کچھ لائن سے باہر تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت سے پاکستانی، ہندوستانی اور بنگالی مجھے ملنے آئے۔ گوروں اور کالوں نے میرے طرف دیکھا اور آپس میں کھسر پھسر کی۔ شائد پوچھ رہے ہوں کہ یہ کیسا بیروزگار ہے جس سے ملنے اتنے بیروزگار جمع ہوگئے ہیں۔

کوئی درجن بھر بیروزگاروں نے آٹو گراف بھی لئے اور میرے پروگراموں کی تعریف کی۔ جنہوں نے میری کتابیں اور کالم پڑھے تھے اور پہلی بار مجھے دیکھ رہے تھے وہ بھی خوش ہورہے تھے۔ کسی کو میری تصنیف ''سربکف'' پسند تھی تو کسی کو'' لینٹھا'' تو کسی کو''ہلال کشمیر''۔ میرے طویل مضمون اسلامی جمہوریہ انگلستان اور کشمیر برائے فروخت سبھی کو پسند تھے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ لوگ بیروزگار تو ہیں بیکار نہیں۔ بیروزگاری کا حل ہے بیکاری کا نہیں۔ بیکار انسان مفلوج ہوجاتا ہے یا پھر ماردیا جاتا ہے۔ اگر خود نہ مرے تو دوسروں کو مارتا ہے۔ بیروزگار اور کچھ نہیں تو کتابیں، اخباریں اور رسالے پڑھتے ہیں، ریڈیوں سنتے ہیں، ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور باخبر رہتے ہیں۔ باخبری میں ذہن تندرُست اور سوچ مثبت رہتی ہے جبکہ بے خبر انسان دوسروں کا محتاج اور تہی دست ہوتا ہے۔ تہی دستی اور محتاجی ایک موذی مرض ہے۔ محتاج انسان حوصلہ اور ہمت ہی نہیں عزت اور غیرت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ محتاجی اور مفلسی صرف معاشی ہی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسیاتی بھی ہوتی ہے۔ آج دنیا کی کئی امیر ترین اور صحت مند اقوام اور ان کے لیڈر مادی دولت کی فراوانی کے باوجود مفلس اور محتاج ہیں۔ انسان انسانیت کی عظمت و معراج سے گر گیا ہے۔ اپنی ہی نسل کشی پر تلا بیٹھا ہے۔ سائنسی ترقی اور تحقیق اپنے عروج پر ہے مگر انسان اخلاق و آداب جیسی اصطلاحات سے بیزار ہے۔ فرد سے لیکر معاشرے اور ریاست تک اخلاقی برائیوں اور بیماریوں میں مبتلا ہیں مگر کسی کے پاس اس کی دوا ہے نہ علاج۔ برطانیہ اور امریکہ میں آج جاب سنٹروں اور تھنک ٹینک سے زیادہ علاج، کردار اور اخلاق سنٹروں کی ضرورت ہے۔

میرا انٹرویو سب سے آخر میں ہوا یعنی آج کے دن کا میں آخری بیروزگار تھا۔ انٹرویو کرنے والوں کے پاس شاید کافی وقت تھا یا پھر میرے انٹرویو میں اپنا اوور ٹائم لگا رہے تھے۔ دراصل دونوں پارٹیوں کے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ میں ریڈیو پر دو گھنٹے کا پروگرام کرتا تھا اور ایک گھنٹہ ٹیلی ویژن پر۔ ریڈیو پر میں موسیقی اور بات چیت کا پروگرام کرتا تھا۔ یہ ایک لائیو پروگرام تھا جس میں میں سننے والوں کی ٹیلیفون کالوں کے جواب دیتا جن میں موسم، سیاست، مذہب گھریلو مسائل، ملکی اور غیر ملکی حالات، شادی، منگنی، پیار، نفرت، کاروبار سے لیکر قسمت کے حال تک سبھی باتیں ہوتیں اور پھر آخری کالر کے مزاج اور خواہش کے مطابق ایک گیت۔ پھر باتیں پھر گیت اور آخر میں نمستے، سلام، سرستیہ کال اور گڈ بائی۔

روزانہ مجھے ڈیڑھ سو سے دو سو لوگ کال کرتے اور تقریباً اتنے ہی ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ

پر پیغامات بھجواتے۔ لائیو کالیں پندرہ بیس ہی ہوتیں باقی آف ائیر رہتیں۔ میں رانی، کرن، دیپالی، شبنم، ولی، اظہار، زوار، افتخار، طاہرہ، بانو، نینا اور روپ کور کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے میرا ہر پروگرام سنا، مثبت تنقید اور حوصلہ افزائی کی۔ روپالی جموں میں، ولی اللہ پشاور میں اور روپ کور پیرس میں بیٹھ کر مجھے سنتے اور میری خوشیوں میں شریک رہتے۔ جس شخص کے پاس اتنی یادیں اور پیار کرنے والے رفیق ہوں وہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا اور نہ ہی بیکار رہتا ہے۔ بیروزگاری وقتی مسئلہ ہے حل ہو جاتا ہے بس تھوڑی سی ہمت اور محنت سے مگر بیکاری ایسا جھال ہے جس سے نجات آسان نہیں۔

تم ایک پڑھے لکھے، تندرُست وتوانا نوجوان ہو، میڈیا، بینکنگ، مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزنگ میں تجربہ رکھتے ہو تو کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔

انٹرویو کرنے والے نے کہا۔

ہر جگہ سی وی بھجوائی ہے جس دن کام مل گیا چلا جاؤنگا مگر فی الحال کوئی کام میسر نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

انتظار کیوں نہیں کرتے؟

انتظار ہی تو کر رہا ہوں۔

پھر یہاں نام مت لکھواؤ۔

نام نہیں لکھواؤنگا تو کھاؤں گا کہاں سے؟ میں نے کہا۔

تم اتنی بڑے تنخواہ لیتے تھے وہ کہاں گئی۔

تیرہ فیصد ٹیکس میں باقی مکان کی منتقلی اور بلوں میں چلی گئی۔ میں نے کہا۔

تم نے اتنا اچھا، مہنگا اور صاف علاقے میں مکان کیوں لیا تھا۔ کسی سستے علاقہ میں معمولی مکان میں رہتے؟ گورے نے کہا۔

میرے پاس پیسہ تھا، کام تھا اور جان پہچان والے لوگ تھے۔ جب انسان کو اللہ دے تو اسے اپنے پر اور اپنوں پر خرچ کرنا چاہئے۔

یہ بھی ٹھیک ہے ہر اچھا کمانے والے کو اچھی اور صاف ستھری زندگی گزارنے کا حق ہے۔

تمہارا باپ، ماں، بہن بھائی کوئی ایسا نہیں جو تمہاری کفالت کرے؟

ماں باپ یہاں نہیں رہتے۔ بہن کوئی نہیں دو چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ بھی یہاں نہیں رہتے

اور دونوں طالب علم ہیں۔

مجھے افسوس ہوا۔ گورے انٹرویو کرنے والے نے کہا۔

اور کوئی عزیز یا رشتہ دار۔۔۔۔۔

درجنوں کے حساب سے ہیں مگر اچھے وقت اور خوشگوار موسم میں ملتے ہیں۔

''آئی ایم سوری اگین۔''

اچھا یہ بتاؤ تمہارا کوئی اچھا دوست یا جان پہچان والا ہے۔

جان پہچان والے تو ہزاروں ہیں اور دوست اور غم خوار کوئی چھ کے قریب ہیں۔

کسی نے تمہاری مدد کیلئے ہاتھ نہیں بڑھایا؟

جان پہچان والوں کو میری نوکری چھوٹنے کا دکھ ہوا ہے۔ میرا آخری ریڈیو پروگرام بڑا جذباتی تھا۔ میرے سننے والوں کو بہت دکھ ہوا۔ بہت سی خواتین ریڈیو اسٹیشن کے باہر مجھے ملنے آئیں۔ مالی مدد کی آفر کی، کھانے کی دعوت دی، بہت سے دیگر خواتین وحضرات کے ایسے ہی جذبات ہر روز مجھ تک پہنچ رہے ہیں مگر وہ سب میرے چاہنے والے ہیں۔ ان کا اظہار محبت ہی میرا سہارا ہے۔

تم یقیناً ٹھیک کہتے ہو۔ اور وہ تمہارے آدھا درجن پر خلوص غم خوار دوست کہاں گئے؟

روپ پیرس میں ہے۔ دو بچوں کی کفیل اور خود بھی بیروزگار ہے۔ اس کا باپ اور بھائی مدد کرتے ہیں۔ شبلی ریسرچ سکالر ہے۔ دو دن ہوئے اس نے بھی بیروزگاری کلب کی ممبر شپ لی ہے۔ چوہدری عبدالجبار مدت سے بیروزگار ہیں، وہ پیار کرتے ہیں، خلوص بانٹتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ طاہرہ اور افتخار کھانا بھجواتے ہیں۔ چوہدری حبیب میرے ٹوٹے پھوٹے مکان کی مفت مرمت کرتا ہے۔ جب بھی آتا ہے اپنے لیے اور میرے لئے کھانا گھر سے پکا کر لاتا ہے۔ وہ خود شوگر کا مریض ہے۔ ایک ہفتہ کام کرتا ہے اور ایک ہفتہ ریسٹ کر کے پھر سے اپنے آپ کو کام کیلئے تیار کرتا ہے۔

ویری سیڈ۔۔۔۔۔

اور تمہارا باپ۔۔۔۔

ریٹائیرڈ فوجی ہے اور افغانستان میں سیاسی پناہ لیے ہوئے ہے۔

افغانستان میں کیوں وہاں تو قدم قدم پر خطرہ ہے؟

اکثر لوگ امریکہ اور یورپ میں سیاسی پناہ لیتے ہیں۔شاید تمہارا باپ دنیا کا واحد پناہ گزین ہے جس نے افغانستان کو سیاسی پناہ کے لئے منتخب کیا۔آخر کیوں؟ وجہ بتا سکتے ہو؟

آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر جہاں زیادہ خطرہ ہو وہی جگہ محفوظ ہوتی ہے۔آدمی ہمیشہ چوکنا رہتا ہے۔افغانستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کسی حکومت سے پوچھ کر پناہ نہیں لی جاتی۔نہ کہیں نام لکھوانا پڑتا ہے۔نہ ویزہ اور نہ ہی روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے۔مائن فیلڈ، گن پوزیشن اور نومینز لینڈ ایسی جگہیں جنگ میں بھی محفوظ تصور کی جاتی ہیں اور جو لوگ ایسی جگہوں پر رہنے کے عادی ہوں انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

وہاں جانے اور رہنے کا پروسیجر کیا ہے؟

کچھ بھی نہیں آپ جس کے گھر رہیں وہ ہی کھانا دیتا ہے۔بستر دیتا ہے۔حفاظت کرتا ہے۔نماز کیلئے پانی گرم کر کے دیتا ہے اور خطرے سے پہلے آگاہ بھی کر دیتا ہے۔

ویری نائیس۔

تمہارے باپ نے افغانستان میں سیاسی پناہ کیوں لی۔کسی اور ملک میں کیوں نہیں گیا۔کیا امریکہ برطانیہ یا پھر یورپ وغیرہ اسے پسند نہیں؟

اس کی جان کو خطرہ تھا۔

کس سے؟

کچھ ججوں سے، سیاستدانوں سے، پولیس سے اور ایک ریٹائیرڈ جرنیل اور اس کے ساتھیوں سے۔۔۔۔

دراصل جج، جرنیل اور پولیس والے ایک سیاستدان کی حمائت کرتے ہیں اور اس کی مرضی کے سامنے بے بس ہیں۔اس نے سیاست اور کرپشن سے اتنا پیسہ بنایا ہے کہ کوئی عدالت، جج، جرنیل یا پولیس اسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی حتیٰ کہ پولیس بھی اس کے خلاف لکھنے اور بولنے سے عاجز ہے۔وہ جسے چاہے مار سکتا ہے۔جب حکومتیں، عدالتیں اور ادارے کسی غنڈے یا ڈاکو کے سامنے بے بس ہوں اور اس کی خوشنودی کیلئے کام کریں تو وہاں سے ہجرت کرنا ہی بہتر ہے۔

پھر؟

سیاستدان میرے قبیلے کے قبرستان پر قبضہ کر کے وہاں اپنا پلازہ تعمیر کرنا چاہتا تھا۔میرے

باپ نے اس کی مخالفت کی تو جرنیل کے حکم سے اس پر بیشمار مقدمات بن گئے۔ ججوں اور پولیس والوں نے اسے گرفتار کر کے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

ویری سرپرائیزنگ۔

کیا تمہارے ملک میں لوگ قبرستانوں کا احترام نہیں کرتے؟ کیا وہاں مردے قبروں میں بھی محفوظ نہیں؟

نہیں ایسا بھی نہیں۔ کچھ قبرستان ایسے ہیں جن کا احترام کیا جاتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جہاں مردے بلکل محفوظ ہیں اور وی وی آئی سٹیٹس انجوائے کرتے ہیں۔ لاہور میں میانی صاحب کا قبرستان محفوظ ہے۔ پاکستان میں کنٹونمنٹ کے قبرستان بھی محفوظ ہیں چونکہ وہاں جرنیلوں کی قبریں ہوتی ہیں۔ لاڑکانہ میں نوڈیرو کا قبرستان اور اسلام آباد کا وی آئی پی قبرستان بھی بلکل محفوظ ہے اور وہاں پر دفنائے گئے خواتین وحضرات نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ خوش وخرم بھی ہیں۔ ان قبرستانوں میں آنے والے وزٹرامیر کبیر اور اعلیٰ عہدیدار ہوتے ہیں اور خوب بن سنور کر آتے ہیں۔ وہ انگریزی میں روتے، باتیں کرتے اور دعائیں مانگتے ہیں جو ان مردوں کے سٹیٹس، سابقہ زندگی اور مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ان قبرستانوں میں پارکنگ کا بندوبست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قبرستان سوشلائیزیشن کے کام بھی آتے ہیں جہاں ان وی آئی پی خواتین وحضرات کے بچے اور پوتے پوتیاں ایک دوسرے کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہروں کے عام قبرستان تقریباً ختم ہوگئے ہیں۔ وہاں اب پلازے، مارکیٹیں اور بڑے لوگوں کی کوٹھیاں اور بنگلے تعمیر ہوگئے ہیں۔ دیہاتوں کے وہ قبرستان جو سڑکوں کے کنارے ہیں وہ بھی محفوظ نہیں ان پر سیاستدانوں اور قبضہ گروپوں کی نظریں ہیں۔ جس طرح میرے گاؤں کے قبرستان کو مسمار کر کے سیاستدان اور اس کا قبضہ گروپ ججوں، جرنیلوں اور پولیس کی مدد سے اپنا پلازہ، پٹرول پمپ اور پارٹی آفس تعمیر کرنا چاہتا تھا۔

اگر تمہارے ملک میں سیاستدان اور ان کے حامی جج اور جرنیل قبرستانوں پر قابض ہورہے ہیں تو وہاں دفن مردوں کا کیا کرتے ہیں۔ ان کا کوئی ڈسپوزل ہے یا ہڈیاں پھینک دیتے ہیں؟

یہ لوگ مردوں کو بیچ دیتے ہیں۔

مردے کون خریدتا ہے؟ گورے نے پوچھا۔

ہمارے ہاں اس کا باقائدہ کاروبار ہوتا ہے۔ ہڈیاں تول کر بیچ دی جاتی ہیں۔ ان سے

جیلیٹین، چیونگم اور ٹافیاں بنائی جاتی ہیں۔کیمیکل میں بھی ہڈیوں کا سفوس استعمال ہوتا ہے۔شوگر ملوں میں چینی کا رنگ سفید کرنے کیلئے جو کیمیکل استعمال ہوتا ہے اس میں بھی ہڈیوں کا پاؤڈر ملایا جاتا ہے۔ٹوتھ پیسٹ، جیلی اور جل میں بھی ہڈیاں استعمال ہوتی ہیں۔ میرے ملک میں ہڈیوں کی جتنی ڈیمانڈ ہے اس تناسب سے قبرستان کم ہیں۔اس کمی کو پورا کرنے کیلئے افغانستان سے بے گوروکفن مردے درآمد کئے جاتے ہیں۔اس سلسلہ میں افغان وارلارڈ امریکہ اور نیٹو فورسز پاکستان کی بھرپور مدد کر رہے ہیں۔ پرویز مشرف نے تو جذبہ خیر سگالی کے تحت مردوں کے بدلے میں کچھ زندہ پاکستانی امریکیوں کو دیے تاکہ وہ ان پر درندوں جیسا ظلم کر کے ذہنی آسودگی حاصل کر سکیں۔اس انسانیت سوز گفٹ میں ایک نام ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا بھی ہے جو امریکہ کے کسی ٹارچر سیل میں پڑی اہل پاکستان واہلیان اسلام کی غیرت پر آنسوں بہا رہی ہے۔

ہاؤسلی۔۔۔

تمہارے ملک کے سارے جرنیل، جج اور پولیس مین اس کاروبار میں ملوث ہیں؟

سبھی نہیں۔۔

میرے ملک میں بڑے بہادر اور دلیر جرنیل بھی ہوئے ہیں۔انصاف کرنے والے جج بھی کچھ ہیں البتہ پولیس والے شاید ہی کچھ ہوں۔ کچھ سیاستدان اور جرنیل زندہ لوگوں کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ ہمارے جرنیل صدر نے امریکہ سے یہ کاروبار کیا اور بہت سے بچے عورتیں اور مرد بیچ کر کروڑوں ڈالر کمائے ہیں۔

اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے ملک میں کسی کو سچا انصاف چاہئے ہو تو وہ کیا کرے؟

وہ حاجی منگل باغ آفریدی، مولوی فضل اللہ یا پھر صوفی محمد کے پاس چلا جائے۔ وہاں ایک ہی دن انصاف مل جاتا ہے۔مگر اس کی بھی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ انصاف تو کر دیتے ہیں مگر اس کے بدلے میں ایک بچہ لیتے ہیں جسے وہ خودکش بمبار بناتے ہیں اگر بچہ نہ ہو تو ایک تھیلا دیتے ہیں کہ اسے کسی مسجد، مدرسے یا پھر دفتر وغیرہ میں رکھ کر ثواب حاصل کرو۔

یہ لوگ تو دہشت گرد ہیں؟

ہاں دہشت گرد تو ہیں مگر انصاف بھی کرتے ہیں۔جج اگر انصاف کریں، پولیس والے مردوں کا کاروبار چھوڑ کر مجرموں کو پکڑیں۔ جرنیل کرپٹ ججوں، سیاستدانوں اور افسر شاہی کی

پشت پناہی چھوڑ دیں اور اپنی شاہانہ مراعات اور معیار زندگی میں تھوڑی سی کمی کر لیں تو کوئی شخص ان دہشت گردوں کے پاس نہیں جائے گا اور پاکستان سے طالبانائیزیشن بھی ختم ہو جائے گی۔

او کے۔

اس کا مطلب ہے کہ تمہارا باپ تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ گورے نے کچھ سوچ کر کہا۔

بلکل نہیں کر سکتا میں نے جواب دیا۔

اچھا یہ بتاؤ تم نے اتنی اچھی نوکری کیوں چھوڑی؟

یہ سوال تو پہلے ہونا چاہئے تھا۔

پہلے اور آخری سوال کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ گورے نے کہا۔

میں نے نوکری نہیں چھوڑی بلکہ مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔

وجہ؟

وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔

تمہارے پاس کنٹریکٹ تھا؟

بلکل تھا۔

تم کورٹ میں کیوں نہیں گئے؟

وکیلوں کی فیس کیلئے ہزاروں پونڈ اور فیصلے کیلئے لمبی مدت کا انتظار اور پھر کیا ضمانت کے فیصلہ میرے ہی حق میں ہو۔ میرے پاس اتنی رقم اور وقت نہیں۔

جب تمہیں نوکری سے نکالا گیا تو ادارے کے باقی ملازمین کے کیا تاثرات تھے؟

سبھی دکھی تھے۔ کچھ کے آنسو نکل آئے۔ خاص کر سردار سیوک سنگھ، سردار اجیت سنگھ، ایکا، دل باغ سنگھ، لیلیٰ، ایمان، بانو اور انجلی کو بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا، دعائیں دیں اور ہمت و استقلال سے جینے کو کہا۔

تمہارے ساتھ واقعی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ میں تمہیں بطور برطانوی بیروزگار رجسٹر کرتا ہو۔ اگلے جمعے کو اپنا بیروزگاری کارڈ لے جانا اور پھر ہر دوسری جمعرات تمہیں ایک سو پونڈ بیروزگاری الاؤنس ملے گا۔ ہاں تم نوکری تلاش کرتے رہنا قومی خزانے پر بوجھ بڑھانا اچھا نہیں۔ بیس لاکھ لوگ پہلے ہی بیروزگار ہو چکے ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔ انٹرویو کرنے والے نے کہا۔

کسی کو بیکار کرنا، بیروزگار کرنا، تکلیف دینا، اذیت پہنچانا کتنا آسان ہے۔ بیکار اور بیروزگار

کو روزگار دینا، خوشیاں بانٹنا، دکھی دل کی ڈھارس بندھانا، نیکی کرنا کتنا مشکل ہے اس کا احساس انسان کو تبھی ہوتا ہے جب وہ خود اس اذیت میں مبتلا ہو۔ لوگ دین و مذہب کے نام پر، علاقے اور قبیلے کے نام پر، رنگ و نسل کے نام پر ظلم کرتے ہیں، قتل و فساد برپا کرتے ہیں، جرائم کرتے ہیں اور پھر ان کا پرچار بھی کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ سکھی اور محفوظ رہیں۔ ان کی دولت، کاروبار، عیش و آرام میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ وہ دوسروں کو جلتا، مرتا، بھوکا ننگا، روتا چیختا دیکھیں اور کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھے۔ وہ اپنی حفاظت اور سکون کیلئے ظلم کیے جاتے ہیں، خون بہاتے ہیں دوسروں کے دکھوں، پریشانیوں، آنسوؤں اور آہوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر حقیقتاً وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک برتر اور طاقتور ہستی ان کے سروں پر ایک آہنی پنجہ لہرا رہی ہے جو کسی بھی لمحے انہیں اپنی گرفت میں لیکر ان کا سب کچھ مکھی کی طرح مسل دے گی مگر پھر بھی ہٹ دھرم اور متکبر ہیں۔ مصر کے اہرام، امریکہ کے پہاڑوں، وادیوں اور جنگلوں میں پھیلے انکا تہذیب کے آثار، بابل و نینواں، ہڑپہ اور منجوڈارو کے قدیم آثار، بنارس کے مندر، چین کے قدیم پگوڈے اور کھنڈرات، یونان کی قدیم بستیوں کے آثار اور صحرائے عرب کے سینے پر پہاڑوں اور سنگلاخ چٹانوں میں ترشیدہ حفاظت گاہیں چیخ چیخ کر ظالموں، جابروں اور متکبر انسانوں کو درس عبرت دے رہی ہیں مگر کسی کو اپنے انجام کا احساس نہیں۔ دولت مند اور سرمایہ دار دولت کے انبار لگا رہے ہیں۔ تاکہ ان کی اولادیں عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر اُن کی لوٹ مار اور حرام کی کمائی کو اپنی تباہی و بربادی کا وسیلہ بنائیں۔ ظالم، کرپٹ اور بے انصاف جج بھول رہا ہے کہ ایک دن اس کا بیٹا بھی قتل ہوگا اس کی بیٹی یا پوتی درندگی کا نشانہ بنے گی اور وہ دنیا سے انصاف کی بھیک مانگے گا مگر کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔ یہی حال ظالم حکمرانوں اور اقوام کا بھی ہوگا چونکہ یہ دنیا کی رسم اور دنیا بنانے والے کا قانون ہے جو بدل نہیں سکتا۔

میرے گرو جی نے کہا تھا کہ وقت کا احساس کرو۔ یہ میری نہیں وقت کی آواز ہے۔ سُکھ بانٹو اور دکھوں پر مرہم رکھو۔ یہ آسان اور سہل ہے اور اسی میں امن و سکون اور دائمی حفاظت ہے۔ سردار سیوک سنگھ ٹیلیفون پر بول رہے تھے اور ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ہم بے وزن اور بے حیثیت وجود ہیں۔ ہمیں اپنے خلوص کا وزن بڑھانا ہے اور اپنا تجزیہ اور اپنی حیثیت کا تعین کرنا ہے۔ پیچھے مت دیکھنا پیچھے سب ناکامیاں اور مایوسیاں ہیں۔ آگے دیکھنا اور سمت کا تعین

کرنا۔ مجھے پوری امید ہے کہ تمہیں منزل ضرور ملے گی۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ ایک شخص کی سوچ نہیں۔ بارہ سالہ کبیر سنگھ نے اپنے انداز میں یہی کہا۔ سمرن اور روپ نے بھی اور ریسرچ اسکالر شبلی نے بھی۔ ولّی نے بھی اور خلوص ومحبت کی نیاز بانٹنے والے عبدالجبار چوہدری نے بھی چونکہ ہم سب ایک جیسے انسان ہیں۔ اگر ہم فریب اور فساد کی جادونگری سے نکل کر سچ اور حقیقت کے آئینے میں دیکھیں تو ہماری سوچیں اور احساس یکجا ہو کر وقت کے براق پر سوار امن اور شانتی کی جنت میں جا اتریں۔ ہم میں احساس کا مادہ ہے مگر مادی اور شیطانی خواہشات نے احساس پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ دیکھ مایوس نہ ہونا سردار سیوک سنگھ نے پھر کہا۔

سردار سیوک سنگھ نے فون بند کیا تو کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں کہا۔

ہیلو میرا نام نینا ہے۔

نینا کماری۔

کیا سوچ رہے ہو؟

کچھ بھی نہیں ایک دوست سے بات کر رہا تھا۔

مگر تم تو رو رہے تھے؟

ہاں۔ وہ جو بات کر رہا تھا وہ بھی رو رہا تھا تو مجھے بھی رونا آ گیا۔۔ میں نے کہا۔

لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ میں تو تمہیں نہیں جانتا۔

میں تمہیں جانتی ہوں۔ تمہاری فین ہوں۔ تمہارا ریڈیو پروگرام سنتی ہوں اور روزانہ تم سے فون پر بات بھی ہوتی ہے۔

شکریہ مگر اب میں ریڈیو پر نہیں ہوں۔

مجھے پتہ ہے! نینا نے کہا۔

دوروز پہلے تم نے بتایا تھا کہ وہ تمہارا آخری پروگرام تھا۔

اچھا یہ تو بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا۔ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں ریڈیو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ میرا آخری پروگرام ہے۔ ہم سب بہت اداس ہوئے۔ میری سب سہیلیاں اداس ہوئیں اور ہمیں بھی رونا آ گیا۔ میری آنٹی نے تمہیں فون پر بتایا بھی تھا۔ وہ بوڑھی ہیں اور تمہارے لئے

جاب ڈھونڈ رہی ہیں۔کل وہ انڈین ایمبیسی بھی گئی۔انڈین ہائی کمیشن تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا مگر ان کی مجبوری ہے وہ ایک پاکستانی کو اپنے سفارتخانے میں نہیں رکھ سکتے ورنہ وہاں بھی تمہارے بہت سے فین ہیں۔آنٹی نے پاکستانی ہائی کمیشن سے رابطہ کیا تو انہیں مایوسی ہوئی۔خیر چھوڑو۔ ہم سب دکھی ہوئے۔تم چپ کر کے چلے جاتے اور ہم پوچھتے رہتے کہ مسٹر راجہ کہاں گیا اور ریڈیو والے کہتے وہ ہالیڈے پر ہے۔تمہیں پتہ ہے انتظار میں کتنا مزہ آتا ہے۔نینا نے بات جاری رکھی۔

تم جب ٹیلی ویژن پر بریکفاسٹ شو کرتے تھے تو تمہاری اور ہر پریت کی جوڑی بڑی اچھی لگتی تھی۔پھر تم دونوں اچانک غائب ہو گئے۔سبھی لوگ ٹیلی ویژن والوں سے پوچھتے تھے اور وہ بتاتے تھے کہ ہالیڈے پر ہیں۔پھر تم دوسرے چینل پر آ گئے اور ساتھ ہی ریڈیو پر بھی تو تمہیں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔

ہاں میری سہیلی نے تمہیں ویک انڈ پر پیرس میں دیکھا تھا۔وہاں کیوں گئے تھے۔نینا کماری نے وقفہ کیا مگر پھر خود ہی جواب دینے لگی۔

شاید وہاں تمہاری گرل فرینڈ ہو گی۔ہے نا؟

نہیں ہے۔میں نے جواب دیا۔

میں نہیں مانتی۔

نہ مانو۔میں نے کہا۔

تو پھر کیوں گئے؟

مستنصر حسین تارڑ اور پاسکل سے ملنے۔میں نے کہا۔

تمہارے کزن ہیں؟

نہیں تایا تائی ہیں۔

تمہاری فیملی پیرس میں بھی ہے۔ویری نائس۔نینا نے خوش ہو کر کہا۔

تاؤ جی ملے۔تائی کیسی ہیں۔بوڑھے ہونگے۔

نہیں ملے۔تاؤ نے جو جگہیں بتائی تھیں وہاں گیا۔ابھی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ نینا آ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔مجھے مت بناؤ۔یہ ٹرخانے کا بہانہ ہے۔میں نے مستنصر حسین تارڑ کا سارا لٹریچر پڑھا ہے اور پاکستان میں ہر اس جگہ کو تارڑ سے

پہلے دیکھا ہے جسے اس نے سفرناموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ تارڑ میرا پسندیدہ رائیٹر ہے چونکہ کافی حد تک سچ لکھتا ہے۔ ہاں وہ تمہاری پاسکل تائی کو چھوڑ کر جپسی کے ساتھ چلا گیا تھا اور پھر اندلس میں بھی اجنبی نہیں تھا۔ مرسیڈس کے علاوہ پانچ چھ تائیاں اور بھی تھیں اس لئے انہیں ڈھونڈنے نکلو گے تو عمر بیت جائے گی۔ مستنصر صرف لکھاڑی ہی نہیں فنکار اور کھلاڑی بھی ہے۔ لکھنے والا جب فنکار بھی ہو تو پھر اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ فنکاری کر رہا ہے یا حرفوں کی چتر کاری اس لئے تارڑ کے افسانے اور سفرنامے میں فرق کرنا مشکل ہے۔ لٹریچر کے معاملے میں میں خود کفیل ہوں اس لئے پھر مجھے بنانے کی کوشش نہ کرنا۔ خیر چھوڑو۔ تمہارے پاس گاڑی ہے۔ نینا نے پوچھا۔

نہیں کسی کے ساتھ آیا تھا۔

میرے پاس ہے۔ میں لندن سے سیدھی تمہیں ملنے یہاں آئی ہوں۔ میں لندن میں اپنا کاروبار کرتی ہوں۔ ہماری فیملی گروسری کے کاروبار میں ہے۔ پتا جی گزر گئے تو میں نے او ر بھائی نے الگ الگ دُکانیں لیکر اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ پتا جی کی وصیت تھی چونکہ والدین اپنی اولاد کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے باپ کو پتہ تھا کہ ہم کس نیچر کے ہیں۔ بھائی مجھ سے دو سال بڑا ہے اور اچھا دوست بھی ہے مگر روپے پیسے کا معاملہ الگ ہے۔ یہ آج کی بات نہیں۔ جب سے انسان نے کاروبار شروع کیا اور روپے پیسے کی قدر بنی تو لالچ نے بھی جنم لیا۔ رشتے کتنے ہی پیارے کیوں نہ ہوں، دوستی سمندر سے گہری اور ہمالیہ سے بلند کیوں نہ ہو۔ لالچ اور ہوس کا ایک ذرہ دل کے کسی نہاں خانے میں قائم رہتا ہے۔ کوئی کس پر اپنی دولت نچھاور نہیں کرتا، چاہئے والدین ہوں، اولاد ہو یا دوست یار ہوں۔ نینا نے کہا۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں میں نے۔ جواب دیا۔

نہ سہی۔۔۔۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں یہ میرا تجربہ ہے اور کاروبار اور کھیتی باڑی میرا خاندانی پیشہ ہے۔ تم کتابی باتیں کرتے ہو۔ جذبات سے سوچتے ہو اور مفروضات پر یقین رکھتے ہوں۔ چونکہ تمہیں زندگی کا تجربہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی اپنے آپ کو دھوکہ دینا چاہئے۔ فریب کی دنیا میں جینا چاہے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلے۔ خشک جھاڑی پر گھونسلا بنائے اور دریا کنارے منجی ڈال کر سو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

دیکھو۔ ماں باپ اولاد پر خرچ کرتے ہیں۔ انہیں اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق تعلیم

دیتے ہیں۔اچھی تربیت دیتے ہیں۔اچھی خوراک اور لباس مہیا کرتے ہیں۔دین و دنیا اور رسم و رواج سے روشناس کرواتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بچے ہر لحاظ سے مثالی اور نمایاں ہوں اور کامیاب زندگی گزاریں۔یہ سب کیوں؟

یہ سب اس لئے کہ وہ خود نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔وہ اپنی کمی اور کمزوری کو دور کرتے ہیں۔وہ اپنی اولاد کو وہ سب کچھ دینا چاہتے ہیں جو خود انہیں نہیں ملا ہوتا۔ یہ سب انوسٹمنٹ ہے۔نینا نے ایک وقفہ کیا، چائے کا گھونٹ لیا اور پھر بولی۔

یہ والدین کی ایک قسم ہے جو اپنے پیسے کی اچھی انوسٹمنٹ چاہتی ہے جبکہ دوسری قسم کے والدین کو اس سے غرض نہیں ہوتی۔وہ جو کچھ کماتے ہیں جمع کرتے ہیں۔بچوں پر اتنا ہی خرچ کرتے ہیں جس سے ان کی واجبی سی تعلیم ہوجائے۔جینے کیلئے روٹی مل جائے اور وہ کسی طرح جوان ہوکر اپنا رزق خود کمانے کے قابل ہوجائیں۔۔۔۔ میں کہوں گی یہ ایک ڈیوٹی ہے جو والدین کسی نہ کسی طرح ادا کرکے اولاد سے چھٹکارا حاصل کرلیتے ہیں۔

ایک مرد اپنی بیوی یا پھر گرل فرینڈ پر پیسہ کیوں خرچ کرتا ہے؟نینا نے پوچھا۔

تم ہی بتادو میں نے جواب دیا۔

وہ خیرات نہیں کرتا بلکہ انوسٹ کرتا ہے۔وہ بیوی کو بناتا سنوارتا ہے تا کہ وہ خوش رہے، اس کی خدمت کرے اور اسے احساس رہے کہ اس کا خاوند اسے بہت چاہتا ہے اور اس کے علاوہ اس کا کسی سے تعلق نہیں۔وہ جتنا بیوی پر خرچتا ہے اس کا ریٹرن بھی چاہتا ہے۔میں بھارت، نیپال، بنگلہ دیش، ایران، افغانستان اور پاکستان کے دیہاتوں کی بات نہیں کررہی۔میں دنیا بھر کی ان دو فیصد روائتی خواتین کی بات بھی نہیں کررہی جن کا تعلق دینی، روحانی یا پھر قدیم خاندانی رسم و رواج سے جُڑا ہوا ہے۔میں جدید ریاست اور معاشرے کی بات کررہی ہوں جس میں امیر، غریب اور درمیانے طبقے کے لوگ شامل ہیں۔جہاں ہر مرد کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت سے تھوڑا آگے بڑھ کر اپنی عورت کو پیش کرے تا کہ اس کا مقام اور معیار تسلیم کیا جائے۔ کاروباری طبقے میں عورت مرد کے کاروبار کا حصہ ہے۔ایک امیر سیٹھ یا کاروباری شخص اپنے پروڈکٹ کو ماڈل گرل کے ذریعے متعارف کرواتا ہے اور اپنی بیوی کے ذریعے اسے دوسرے سیٹھ کے گھر اور گودام تک لے جاتا ہے اور پھر سیلز گرل کے ذریعے اسے فروخت کرتا ہے۔ جہاں اس کی منکوحہ کام نہیں آتی وہاں خوبصورت سیکرٹری یا پھر گرل فرینڈ راستہ بنالیتی ہے۔بحر

حال عورت کے پاؤں سے لیکر سر کے بالوں اور چال ڈھال تک سب مرد کے کام آتا ہے۔ اگر تم دنیا بھر کی انڈسٹری کی فہرست بناؤ تو بیس فیصد جنگی ساز وسامان، پچاس فیصد عورت اور باقی تیس فیصد عام اشیاء کے کارخانے ہیں۔ بوفورگن ہو یا جنگی جہاز۔ جدید کار ہو یا کمپیوٹر۔ بکنی اور منی سکرٹ والی لڑکیاں ان کی اشتہاری مہم میں ضرور ہونگی۔ کپڑا، کاسمیٹکس، گھر، سفری سامان، کچن کا سامان تو ہے ہی عورت کی جاگیر۔ علاوہ اس کے عورت کے جسم کے ہر حصے کی ایک قیمت ہے۔ پاؤں کے ناخنوں کی پالس الگ ہے اور ہاتھوں کی الگ، پاؤں کے مساج کی کریم اور ہے اور ہاتھوں کی اور، گھٹنوں، ٹخنوں، پنڈلیوں، پسلیوں، چھاتیوں، چوتڑوں، بازووں کی مالش اور مساج کی الگ الگ کریمیں، لوشن اور تیل ہیں۔ جسم کے ہر حصے کے بالوں کی صفائی اور حفاظت کے اپنے اپنے سامان ہیں۔ عورت کے بدن کے نکھار اور سنگار کے ساڑھے تین ہزار نسخے ہیں جبکہ دنیا بھر میں انسانی علاج ومعالجے کے پچاس سے زیادہ شعبے نہیں۔ یہ ساڑھے تین ہزار نسخے صرف ایک ننگے بدن کے لئے ہیں جبکہ کپڑوں اور زیور کی مارکیٹ الگ ہے۔ ہر کمپنی کا اپنا پروڈکٹ ہے اور ہر پروڈکٹ کی سینکڑوں کمپنیاں ہیں۔ ہر کمپنی کی اپنی اپنی ریسرچ لیبارٹریاں ہیں جو نئی چیزیں دریافت کرنے میں لگی ہیں۔

میں کہہ رہی تھی کہ عورت کے جسم کے ہر حصے کی قیمت ہے۔ بالوں کا اپنا ریٹ ہے اور سٹائل کی الگ الگ قدریں ہیں۔ گردن، آنکھ، ناک، ہونٹ، پشت، پیشانی، چھاتی، پیٹ، ران، سالم ٹانگ، ہاتھ، بازوں، انگلیاں اور پاؤں الگ الگ بکتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ایک سالم، صحت منداور کپڑوں سے ڈھکی عورت کی کوئی قیمت نہیں۔ جانتے ہو کیوں؟ نینا نے پوچھا۔

نہیں۔

اس لئے کہ سالم عورت پروڈکٹ نہیں ہوتی۔ وہ ماڈل گرل، سیکرٹری، گرل فرینڈ، سیلز گرل، سیکس ورکر، نمائیشی بیگم کے درجے سے گر کر واپس اپنی مٹی میں مل جاتی ہے اور پھر سے ایک جنم لے کر اپنے اعلیٰ وارفع مقام پر کھڑی ہوتی ہے۔ وہ واپس اپنے وکٹری سٹینڈ پر آجاتی ہے جو اس کی برتری اور بڑائی کا اصل مقام ہے۔ عورت جب وکٹری سٹینڈ پر کھڑی ہوتی ہے تو ساری کائنات کا حسن اس کے چہرے پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے حسن و جمال میں جلال ہوتا ہے جس کی تاب لانے والے مرد کو جرأت واستقلال کے ہتھیار سے لیس ہونا پڑتا ہے۔ ایک بیوپاری، ایک بنیا، ایک دوکاندار اور ایک جسم فروش یا دلال اس کے حسن کی تاب نہیں لاسکتا اور نہ ہی اس

کی قیمت دے سکتا ہے۔

کیا عورتیں بھی انوسٹ کرتی ہے۔کاروبار کرتی ہیں۔مردوں پر خرچ کرتی ہیں۔میں نے پوچھا۔

ہاں کرتی ہیں اور وہ بھی مفت میں نہیں کرتی۔میں یہاں تک آئی ہوں۔آج میری دوکان پر صرف سیلز مین ہے۔دوسری دوکان کا میں نے وزٹ نہیں کیا۔پر کاش اچھا بزنس پارٹنر ہے مگر پھر بھی ایک بار دیکھنے سے تسلی رہتی ہے۔میں یہاں مفت نہیں آئی۔مجھے تم سے ہمدردی ہے۔میں تمہاری فین ہوں۔مگر تم پر مرتی نہیں ہوں۔کوئی کسی کیلئے پچاس پونڈ کا پٹرول اور دن بھر کا کام سیکریفائیز نہیں کرتا۔میں کاروباری عورت ہوں اور کاروبار میں نفع نقصان خوب سمجھتی ہوں۔میں سبزیوں، پھلوں، اور پھولوں کا کاروبار کرتی ہوں جو بڑا ہی نازک اور رسکی ہے۔پھول، پھل اور سبزیاں فیکٹریوں میں نہیں، کھیتوں اور باغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔پہلے کھیت اور کیاریاں تیار ہوتی ہیں۔یہ بڑا ہی نازک اور باریکی کا کام ہے۔اگر کھیت اور کیاری اچھی طرح تیار نہ ہو تو فصل پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔تمہیں پتہ ہے زمین کو دھرتی ماں کیوں کہتے ہیں؟

تم بتا جو رہی ہو تو یہ بھی بتا دو۔میں نے کہا۔

کھیت اور کیاریاں عورت کی طرح ہوتی ہیں۔ان کے بھی ناز نخرے ہوتے ہیں۔کچھ ویسے ہی سُدھ اور ذرخیز جیسے گاؤں، دیہاتوں اور پہاڑوں میں رہنے والی صابر شاکر اور باہمت عورتیں۔یہ جو ذرا نخریلی اور چنچل ہوتی ہیں۔محنت مانگتی ہیں۔انہیں پہلے ہموار کرنا پڑتا ہے۔پھر پانی دے کر کچھ دیر کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔پانی خشک ہوجائے تو کھاد ڈالتے ہیں۔پھر ہل چلاتے ہیں اور بیج ڈالتے ہیں۔پھر ہلکا پانی دیتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔بلکل عورت والا معاملہ ہے۔ہر پھل، ہر سبزی اور پھول کیلئے الگ الگ زمین، الگ الگ تیاری اور پھر حفاظت۔۔۔۔

ہاں یہ جو پھل درختوں پر لگتے ہیں جیسے آم، سیب، انار، کھجور، مالٹے، سنگترے یہ بھی نخریلے ہیں۔ان کی باقائدہ گوڈی ہوتی ہے۔ہر درخت کے گرد الگ کھالہ بنتا ہے۔وقت پر گوڈی، وقت پر کھاد اور پانی ورنہ چھٹی۔کھجوریں تو بلکل زنانیاں ہوتی ہیں۔مادی نر سے باقائدہ ملاپ مانگتی ہے۔

وہ کیسے میں نے پوچھا۔

نر کا سفوس یعنی پولن مادیوں پر ڈالا جاتا ہے اور اس کا ایک متعین وقت ہوتا ہے تبھی جا کر میٹھی اور لذیز کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔ ضیاء الحق کے دور کی بات ہے میں اپنی دوست شاہدہ شیخ کے ساتھ ملتان گئی تھی۔ ہم سندھ اور پھر بھاولپور گئے۔ سندھ میں ہم سکھر، خیر پور اور نواب شاہ گئے۔

وہ کیوں؟

کھجوروں کے باغات دیکھنے۔ اس سٹڈی کے دوران میں کیسانوں اور باغبانوں سے ملی اور ہم لسبیلہ بھی گئے۔ رینٹھے، چیکو اور شریفے کے کھیت دیکھے۔ ہر طرف وڈیروں اور نوابوں کی اجارہ داری ہے اور کسان بدحال ہے۔ ٹھٹھہ میں ہمارے بھی کیلے کے باغات ہیں اور ملیر میں فالسے کا کچھ رقبہ ہے۔ مگر ہم کسان کو پورا معاوضہ دیتے ہیں۔ سندھ کے کیلے اور آم کی تو بات ہی الگ ہے۔ سندھ کا کیلا انتہائی لذیز اور خوشبودار ہوتا ہے جبکہ آموں کی درجنوں اقسام ہیں جو دنیا بھر میں کہیں نہیں۔ کشمور، کندھ کوٹ اور جیکب آباد میں ایک خاص قسم کا چاول بھی ہوتا ہے جس کی مخصوص خوشبو اور ذائقہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایسا ہی خوشبودار چاول جموں میں بھی ہے جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ میری زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا کہ مجھے چاولوں کا نشہ ہو گیا۔

چاولوں سے کوئی شراب بنتی ہے؟ میں نے پوچھا۔

بنتی ہو گی مگر مجھے چاولوں کی خوشبو کا نشہ تھا۔

اب نہیں ہے۔ میں نے پوچھا۔

ہے مگر وقت بدل گیا ہے۔ نینا بولی۔

وہ کیسے؟

میں صبح سورج نکلنے سے آدھا گھنٹہ پہلے جیکب آباد سے کندھ کوٹ، کشمور اور پھر گدو بیراج تک جاتی۔ چاول کے کھیتوں پر سورج کی گرم کرنیں پڑتیں تو کھیت مہک اٹھتے۔ ایک عجیب اور مست خوشبو ہر طرف پھیل جاتی۔ اگر سلو ڈرائیو کرتے ہوئے خاموشی سے اس روڈ پر سفر کرو تو ہر طرف فطرت کا حسن دیکھائی دیتا ہے۔ ایک عجیب سماں ہوتا ہے جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا چاولوں کی خوشبو کا نشہ اپنے جوبن پر ہوتا جیسے رات کے بارہ بجے بار میں ہر کوئی خاموش اور مکمل خمار میں ہو۔ آئی لو اٹ اینڈ مس اِٹ۔۔۔۔

میں سمجھا نہیں۔

دیکھو دین اور مذہب کا وطن سے تعلق نہیں ہوتا ایک ملک بہت سے ادیان کے ماننے والوں

کا وطن ہوسکتا ہے اوران کو اپنی مٹی، اپنی دھرتی سے یکساں پیار ہوتا ہے مگر لوگوں نے اسے مذہب سے جوڑ لیا ہے۔۔۔۔نینا بولی۔

میں نے بڑے بڑے دانشوروں، سیاست کے فن سے آراستہ بے فکروں، مولویوں پروہتوں، گروؤں اورشری مانوں کو سنا ہے۔ ہر کوئی عالمگیریت کی بات کرتا ہے مگر اس پر ایمان نہیں رکھتا۔سب منافقت کرتے ہیں۔ بھارتی نیتا کہتے ہیں بھارت ایک سیکولر سٹیٹ ہے مگر کوئی پاکستانی وہاں جا کر تو دیکھے۔ ہندو اور سکھ تھانے کی اور مسلمان جیل کی ہوا کھاتے ہیں۔تمہارے پاسپورٹ میں، ویزے میں اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے نقص نکال کر ذلیل و خوار کرتے ہیں تاکہ آئندہ کوئی اس طرف رخ نہ کرے۔ برطانیہ ہمارا دوسرا وطن ہے مگر گورے اور کالے میں فرق ہے۔ برطانیہ دنیا کی عظیم ڈیموکریسی ہے مگر نسلی اور مذہبی تعصب موجود ہے۔ یہ صرف عدالتی نظام ہی ہے جس نے برطانوی جمہوریت، بادشاہت، پارلیمنٹ اور شہری حقوق کو اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے اور برطانوی نظام کی عظمت کو چار چاند لگے ہیں۔امریکہ کو دیکھو کہنے کو کچھ اور عملاً کچھ ہے۔کونسا ملک ہے جہاں تعصب نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا ہر ملک نسلی اور مذہبی تقسیم پر قائم ہے۔ ہر ملک اور ریاست بنیاد پرست اور نیرو مائینڈڈ ہے۔

تم سندھ کی بات کر رہی تھی میں نے کہا۔

ہاں میں سندھ کی بات کر رہی تھی۔ جہاں چاولوں کی مہک ہے۔ جہاں کیلوں اور آموں کے باغ نہیں بلکہ جنگل ہیں۔ جہان میٹھے آم اور پپیتے، فالسے، شریفے اور چیکو ہوتے ہیں مگر اب وہ بات نہیں رہی اور دہرتی کا حسن ماند پڑھ گیا ہے۔جمہوریت کے نام پر ڈاکو راج قائم ہے اور انسانی حقوق کی آڑ میں انسانیت کی تذلیل ہو رہی ہے۔عارفوں، سالکوں اور عابدوں کی دہرتی پر بربریت بپا ہے اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔خیر چھوڑو۔۔میرا دل جلتا ہے۔

تم نے کبھی پلہ مچھی کھائی ہے؟

نہیں۔میں نے جواب دیا۔۔

سندھ کی پلہ اور سوات کی ٹراؤٹ۔

کیا ذائقہ اور مستی تھی مگر اکیلے کھانے کا مزہ نہیں تھا۔۔۔۔ساتھی کا ساتھ ہو تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔کھاتے جاؤ۔مچھلی کی تعریف کرو اور باتیں کرو۔

کس سے۔میں نے کہا۔

ساتھی سے۔

یہ ساتھی کون ہے۔مچھلی ہے کیا؟

نینا ہنس پڑی۔۔۔نہیں۔۔۔۔بکری ہے۔خیر چھوڑو۔ پھر بات کرینگے میں یہاں تمہیں ملنے اورتم سے باتیں کرنے آئی ہوں خودکودکھی کرنے نہیں۔

تم سندھ میں تھی؟ میں نے پوچھا۔

تھی نہیں۔اب بھی ہوں۔ میں سندھ میں اور سندھ مجھ میں ہے مگر کرپٹ اور مفاد پرست سیاسی لٹیروں نے میرے سندھ کے حسن کو داغدار کر دیا ہے۔گدو بیراج سے کشمور، کندکوٹ، شکارپور، جیکب آباد، بیل بھٹ، جھٹ پٹ، سبی، ہرنائی اور خوست تک میں گھومتی تھی اور مستی میں سرشار رہتی تھی۔تمہیں پتہ ہے کہ میں وہاں کی راج کماری تھی۔

کس دور میں؟ میں نے تو نہیں پڑھا۔

یہ پڑھنے کی بات نہیں۔کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں لکھا۔ ہرلڑکی اپنی زندگی میں آٹھ سال تک راج کماری ہوتی ہے۔ مذہب، دین، ملک، قوم، قبیلے، برادری کے بندھنوں سے بلکل آزاد۔اپنی سوچوں میں مگن، من کی دنیا میں خیال کے مست گھوڑے پر سوار خیالوں اورخوابوں کے سبزہ زاروں میں گھومتی راج کماری۔اب تم پوچھو گے کہ یہ آٹھ سال کب شروع ہوتے ہیں۔

ہاں پوچھنے ہی والا تھا۔

چودہ سے بائیس سال کی عمر کے آٹھ رنگین سال، ہرراج کماری کے اپنے آٹھ سال۔

نینا! شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔تم عورت ہو۔ان آٹھ سالوں کے سفر سے گزرکر آئی ہو۔مگر ہرگھر کی لڑکی پر شاید یہ جنون طاری نہیں ہوتا۔ ہرگھر کی اپنی کہانی ہے۔ ہرمعاشرے اور ماحول کے اپنے رسم ورواج ہیں۔امیری اورغریبی کے اپنے اپنے اصول اورضابطے ہیں اوروہ جو چودہ یا پھر سولہ سال ہی میں بیاہی جاتی ہیں اور بائیس سال تک چار پانچ بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔

وہ جو دن بھرمحنت مزدوری کرتی ہیں اورمشکل سے پیٹ بھرتی ہیں۔جنہیں سونے کو چٹائی اور پہننے کو کپڑا میسر نہیں ہوتا۔ جو دوسروں کا جوٹھا کھاتی اور اترن پہنتی ہیں۔کیا وہ بھی راج کماریاں ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا نینا نے بات کاٹ دی۔

بلکل ہیں۔ غربت ، امارت، گھر، جھونپڑا ،محل، رسم و رواج، کھانا، پینا اوڑھنا بچھونا کسی کے خواب نہیں چھین سکتا۔ کسی کی امید اور آس کو نہیں مار سکتا۔ کسی کی آرزوؤں، خواہشوں اور چاہتوں پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اگر یہ سب ہو جائے تو دنیا جل کر بھسم ہو جائے۔

یہ دنیا ایٹمی ہتھیاروں، جدید جنگی جہازوں، ایٹمی قوت سے چلنے والے بحری بیڑوں، کمپیوٹروں اور سٹیلائیٹ کے جدید نظاموں، ڈالروں اور سونے چاندی کے ڈھیروں پر نہیں کھڑی ۔ یہ دنیا خواہشوں، اُمیدوں اور آرزوؤں کے ستونوں پر استوار ہے۔ خواہشیں، آرزوئیں، امیدیں، چاہتیں، محبتیں اور خواب ۔ چار ستون اور ایک بلند مینار۔ محبت اور عشق کا بلند مینار جس کے عین اوپر عرش پر کائنات کو بنانے ،سنوارنے ،نکھارنے ، پالنے اور حفاظت کرنے والا ربّ رہتا ہے۔

کوئی دولت مند، جابر، ظالم اور حاکم کسی کے خواب نہیں لوٹ سکتا۔ آرزؤں، امیدوں اور چاہتوں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی عشق و محبت کی بلندی کو چھو سکتا ہے۔ حرام کی دولت کمانے والا، ظلم کرنے والا اور آرزؤں کو قتل کرنے والا کبھی بلندی پر نہیں جاتا۔ اسے بالآخر پستی میں جاتا ہوتا ہے چونکہ پستی ہی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ دیکھو۔ محبت عشق کی ابتداء ہے اور قربانی انتہا۔ جب غریب کے دل میں محبت کی چنگاری سلگتی ہے تو وہ آرزوؤں ، امیدوں، خوابوں کی قوت کا سہارا لے کر ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ وہ رسم و رواج کی زنجیروں کو توڑ کر عشق کے میدان میں قربان ہونے کا اعلان کرتی ہے اور انجام میں فتح مند ہوتی ہے۔ کبھی کامیابی کا جھنڈا گاڑھ کر اور کبھی گردن کٹوا کر تاریخ کے سنہری اوراق پر۔۔۔۔ محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ ہاں! ناکام نہیں ہوتی اگر محبت ہو تو۔۔۔ ہوس، خودغرضی، بزدلی، لالچ، بے ہمتی اور بے چارگی اور سب سے بڑھ کر بے غیرتی۔۔۔۔۔ یہ محبت نہیں اور نہ ہی اس کی منزل عشق اور انجام کار قربانی ہے۔ عورت کوٹھے پر بیٹھ جائے۔ دھندہ کرے، جسم بیچے اور پھر کہے کہ خاندان کیلئے قربانی دے رہی ہوں۔ پیٹ پال رہی ہوں۔ یہ قربانی نہیں تذلیل ہے۔ اس دنیا میں لاکھوں ایسے کام ہیں جوان پڑھ عورت بھی کر سکتی ہیں۔ خواہشات کی تکمیل اور عیش وعشرت کا نام قربانی نہیں محض بے حیائی ہے۔ میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جنہوں نے مسلسل قربانی دی اور مٹی سے گوہر نایاب تلاشے۔ کبھی اولاد کی صورت میں، کبھی خاوند اور محبوب کی شکل میں

اور کبھی اعلیٰ وارفع مرتبے اور مقام میں۔آسمانی اور تاریخی کتابوں میں ایسی عورتوں کا ذکر خود ربّ کائنات نے کیا ہے اور یہ ہی عورت کے خوابوں کی تکمیل ہے۔

نیناتم سبی کے ریلوے اسٹیشن پر تھیں۔۔۔۔شائد۔۔۔۔۔۔میں نے کہا۔

نہیں کسی اور جگہ تھی مگر سندھ کی دھرتی پر تھی۔دیکھو راجہ۔ہمارا اصل وطن تیراہ ہے۔پشاور سے ایک سڑک باڑہ جاتی ہے۔جو خیبر ایجنسی میں ہے اور وہاں سے تیراہ وادی کو راستہ جاتا ہے۔ایک راستہ جمرود سے بھی اور ایک علی مسجد سے جاتا ہے۔تیراہ کے جنوب میں ہنگو کا علاقہ ہے۔جو کوہاٹ سے متصل ہے۔سمانا اس علاقے کا سب سے بلند مقام ہے۔سمانا سے شمال کی جانب تیراہ وادی ہے۔تیراہ سے شمال میں کوہ سفید ہے۔اسی سلسلہ کوہ میں تورہ بورہ کا پہاڑ اور گاؤں ہے جو امریکیوں کے اعصاب پر عرصہ تک چھایا رہا۔تیراہ وادی سے مغرب میں کرم ایجنسی ہے اور وہاں سے ایک راستہ پارہ چنار اور پھر آگے افغانستان کے صوبہ ننگرہار، میدان اور کابل کی طرف جاتا ہے۔تیراہ وادی اونچے پہاڑوں کے درمیان گھنے جنگلوں، بہتے چشموں اور لہلاتے سرسبز کھیتوں پر مشتمل جنت کا ایک ٹکڑا ہے۔تیراہ میں پھلوں اور پھولوں کی بہتات ہے۔اور سردیوں میں کوہ سفید سے اترنے والی برف کی چادر ساری وادی کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔تیراہ میں آفریدی قبائل آباد ہیں یہ وادی قدرت کی رعنائیوں کے ساتھ ساتھ انسانی حسن، مردانگی، شجاعت اور دلیری کی نعمت سے بھی مالا مال ہے۔مغلیہ دور میں خوشحال خان خٹک نے بغاوت کی اور مغلوں سے جنگوں کا طویل سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔خوشحال خان کو جب اپنے علاقہ سے نکلنا پڑا تو تیراہ کے قبائل نے خوشحال خان خٹک کو اپنے ہاں پناہ دی۔خوشحال خان خٹک نے اپنے کلام میں آفریدی قبائل کی دلیری اور جرأت کے علاوہ تیراہ کی حسیناؤں کے حسن و جمال کو بھی زد قلم کیا۔

آفریدیوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی صدیوں سے اس دھرتی پر مقیم ہیں۔یہ لوگ جس قبیلے کے ساتھ رہتے ہیں اسی کا حصہ ہوتے ہیں۔وہ قبائل کی باہم لڑائیوں میں شامل نہیں ہوتے اور نہ ہی قبائل دشمنی کا حصہ بنتے ہیں۔البتہ ہندوؤں اور سکھوں کی حفاظت ان قبائل کی ذمہ داری ہے جسے یہ لوگ جان پر کھیل کر بھی نبھاتے ہیں۔ہندوؤں اور سکھوں کو قبائلی علاقوں میں جو آزادی اور مراعات حاصل ہیں وہ مقامی قبائل کو نہیں۔ہندو اور سکھ تجارت اور حکمت کے پیشے سے منسلک ہیں۔سکھ حکیم اور وید صدیوں سے مختلف بیماریوں کے ماہر معالج مانے جاتے ہیں اور

ان کے پاس علاج کی غرض سے برطانیہ، امریکہ، بھارت اور سنٹرل ایشاء سے بھی لوگ آتے ہیں۔ یہ لوگ کپڑے، جیولری اور خوشبویات کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ میں نے باڑہ اور پشاور کے قریب کارخانو مارکیٹ اور لنڈی کوتل میں ان کے بڑے بڑے وئیر ہاؤس دیکھے ہیں جہاں کروڑوں ڈالر کا سامان رکھا گیا ہے۔ ہندو اور سکھ تاجر اپنی ایمانداری اور کھرے پن کی وجہ سے بھی مشہور ہیں اور لوگ ان کے ساتھ تجارتی معاملات طے کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔ میری ماں کہتی تھی کہ ان کے سسر یعنی میرے دادا سکھ تھے۔ انگریزی دور میں ایک گورے میجر کو آفریدیوں نے پشاور سے اغوا کر لیا اور اسے تیراہ لے گئے۔ گورا میجر اکھڑ تھا اور پشاور میں آنے والے قبائلیوں کی بے عزتی کرتا تھا۔ اس میجر کا تعلق برطانیہ کی پولیٹیکل سروس سے تھا جو قبائل سے ڈیل کرتا تھا۔ حکومت نے ملکوں، مولویوں اور پولیٹیکل انتظامیہ کے ذریعے قبائل سے معاملہ طے کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میجر کا تعلق رائل فیملی سے تھا اس لئے اس کی موت حکومت آفورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ میرے دادا علاقہ کے ماہر حکیم اور عزت دار آدمی تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ اور گورنر نے انہیں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کو کہا جو کامیاب رہا اور گورا میجر آزاد ہو گیا۔

حکومت نے اس خدمت کے عوض میرے دادا کو آرڈر آف برٹش ایمپائیر کا تمغہ، تعریفی سند اور بیس مربع زمین سندھ میں آلاٹ کی جو اب بھی ہماری ملکیت ہے۔ دادا کی موت کے بعد میرے باپ نے اپنے بھائیوں سے بٹوارہ کر لیا۔ چونکہ وہ سندھ جا کر زمینداری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میرے چچا حکمت اور دوکانداری کو پسند کرتے تھے اور انہیں سندھ کے صحرائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرے دو چچا تیراہ میں، تین جلال آباد میں، تین خوست میں اور ایک کابل میں مقیم ہوئے اور مختلف قسم کے کاروبار کرنے لگے۔ میری ماں نے بتایا کہ میرے دادا کے گیارہ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ میرے دادا کا گیارہواں بیٹا مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ ایڈورڈ کالج پشاور میں پڑھتا تھا۔ جہاں اسے کسی مسلمان لڑکی سے پیار ہو گیا۔ میرا چچا اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جو کالج میں پڑھنے گیا تھا۔ اس نے اپنا عشق کسی سے چھپایا نہیں اور نہ ہی دھرم کی تبدیلی کو راز رکھا۔ اس نے تیراہ آکر باپ اور بھائیوں سے مشورہ کیا اور انہیں نتائج سے بھی آگاہ کیا۔ اسے پتہ تھا کہ قبائلی رسم رواج کے مطابق اس کا مسلمان ہونا تو اچھی نگاہ سے دیکھا جائے گا مگر لڑکی کے قبیلے والے دشمنی پر اتر آئینگے اور قبائل میں جنگ ہوگی۔ لڑکی چارسدہ یا پھر مردان کے کسی اچھے

گھرانے کی تھی۔ میرے دادا نے میرے مسلمان چچا کا حصہ اسے نقدی اور زیورات کی صورت میں دے دیا اور دونوں میاں بیوی کو اپنے مسلمان دوست کے پاس بنگال بھیج دیا۔ تقسیم کے بعد چچا اپنے خاندان کے ساتھ امریکہ چلا گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد اس کا رابطہ اپنے خاندان سے منقطع ہو گیا۔

میرا باپ سندھ آ گیا اور زمینداری کرنے لگا۔ وہ کھیتی باڑی کا ماہر تھا۔ اس نے شادی بھی کشمور کے ایک ہندو گھرانے سے کی جو چاول، گڑ اور اچار کے مشہور بیوپاری تھے۔ میرے ماموں اور خالائیں، کندھ کوٹ، شکار پور، ٹھٹھہ، جیکب آباد، گڑھی یٰسین، سبی، کوئٹہ اور ہرنائی میں رہتی تھیں اور اب بھی ان کی اولادیں وہاں مقیم ہیں۔ میرے ددھیال کی طرح ننھیال بھی بڑا وسیع ہے۔ یہ لوگ غلے، پھلوں، اون اور قالینوں کا کاروبار کرتے ہیں۔

میرے باپ نے اپنی زمینوں کا اچھا انتظام کیا۔ زرعی تحقیقاتی اداروں کی مدد سے مٹی کے نمونے ماہرین کے پاس بھجوائے اور عمدہ خوشبودار چاولوں کی کئی اقسام پیدا کیں۔ میرے والد نے اپنے سسرالی رشتہ داروں کی مدد سے ٹھٹھہ اور نواب شاہ میں بھی زمینیں خریدیں جہاں سبزیوں کے علاوہ آم، کیلے اور کھجور کے باغات لگوائے۔ ہمارے کچھ رقبے پر گندم، گنا اور کپاس بھی ہوتی ہے۔ مگر بڑی فصل چاول ہے۔ زمینوں کی دیکھ بھال اور کاشتکاری کے جدید نظام کے ساتھ ساتھ ٹھیکیداری کا نظام متعارف ہوا تو میرے باپ نے اپنی زمینیں اور باغات پنجابی ہاریوں اور ٹھیکیداروں کو دے دیں۔ اس طرح میرے باپ کو لاکھوں روپے سالانہ گھر بیٹھے آمدنی ہوتی جس سے اس نے لندن اور مانچسٹر میں پھلوں اور سبزیوں کا کاروبار کیا اور ہم لوگ برطانیہ شفٹ ہو گئے۔ دراصل میرا باپ، ماں اور بھائی شفٹ ہوئے تھے۔ بھائی تب ایک سال کا تھا جبکہ میری پیدائش مانچسٹر میں ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ کثیر اولادیں پیدا کرنے والے گھرانوں سے تعلق رکھنے والوں کے صرف دو ہی بچے ہوئے۔ جو بچہ دیس میں پیدا ہوا وہ مکمل بدیسی بلکہ پورے کا پورا ولائتی ہو گیا اور جو یعنی میں جو ولائت میں پیدا ہوئی مکمل دیسی بلکہ عشق کی حد تک اپنی مٹی میں گندھ گئی۔ شاید یہ میری جنس کی وجہ سے ہے۔ عورت کی جڑیں مٹی میں ہوتی ہیں اور مرد کی روزی ہوائی ہوتی ہے۔ کشمور میں رہتی خالہ کہتی تھی۔ عورت گھر کی رانی اور مرد اس کا محافظ ہوتا ہے۔ پرانے لوگوں اور باتوں میں بڑا وزن تھا۔ صدیوں کے تجربوں کے بعد یہ باتیں اور ان کے الفاظ وجود میں آئے مگر ہم نے اپنے آپ کو ماڈرنائیز کرنے کے چکر

میں ان تجربوں اور لفظوں کی اہمیت بھلادی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جو جانور کھونٹے سے کھل جائے اور جو شخص اپنی روایات سے ہٹ جائے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ اچھی، روایات، اخلاق و اخلاص سب کچھ ختم ہورہا ہے۔ اب تو احساس بھی باقی نہیں رہا۔ ٹارگٹ کلنک، بم دھماکے، خودکش حملے، اغوا برائے تاوان، سربریدہ اور بوری بند لاشیں اور طالبان جیسی نئی نئی اصطلاحیں وجود پذیر ہورہی ہیں۔ جس ریاست کی حکومت ڈاکوؤں، چوروں، لٹیروں، سمگلروں اور غنڈوں کے ہاتھ ہو۔ عدالتوں اور اداروں پر قانون شکنوں کا قبضہ ہو تو ایسے ملک اور معاشرے میں احساس، رواداری، رسم ورواج، خلوص اور ہمدردی کیسے پروان چڑھ سکتی ہے۔

تمہیں پتہ ہے یہ سب کیوں ہورہا ہے؟

میں نے سوشیالوجی نہیں پڑھی۔ میں تو میڈیا کا آدمی ہوں۔ میں نے کہا۔

اس میں پڑھنے کی کوئی بات نہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

معاشرے کی پہلی اور مضبوط کڑی فرد ہے گھر نہیں ہے۔ میں نے پھر کہا۔

نہیں۔ شائد تم نے اقبالؒ نہیں پڑھا۔ نینا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"فرد اکائی ہے کڑی نہیں۔۔۔ ایک کمزور اکائی۔۔۔۔ گھر ایک کڑی ہے۔۔۔۔ علامہؒ نے فرمایا۔ فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں۔

انسان سوشل اینیمل ہے جو دیگر انسانوں میں رہ کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ اپنی تکمیل کیلئے گھر بناتا ہے۔ چٹان میں۔۔۔ پہاڑ میں۔۔۔۔۔ ٹیلے کی اوٹ میں ایک غار کھودتا ہے اور اس کے آگے ایک دیوار کھڑی کرتا ہے تاکہ جانوروں اور انسانوں کی غار میں فرق محسوس ہو۔ پھر اس گھر میں ایک عورت لاتا ہے تاکہ اس کی تنہائی ختم ہو۔ وہ اپنی نسل پیدا کرتا ہے اور انہیں جینے کے گر اور ہنر سکھلاتا ہے۔ وہ اس گھر کو اور اپنے آپ کو سنوارتا ہے۔ جب گھر سنور جاتا ہے تو معاشرہ بنتا ہے اور جب فرد سنورتا ہے تو وہ اپنی ذات کے پہلوؤں پر غور کر کے زندگی کے مقصد کو پاجاتا ہے۔ نینا نے لمبا وقفہ کیا۔۔۔ پانی کا گھونٹ لیا اور پھر بولی۔۔۔۔ تمہیں پتہ ہے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟

شاید ہم زندگی کی ایک ویولنتھ پر نہیں ہیں۔ ایک آسودہ حال اور زندگی کی ظاہری آسائیشوں سے مطمئن شخص کی سوچ وہ نہیں ہوتی جو ایک مفلوک الحال اور مجبور شخص کی ہوتی ہے۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔

تبھی میں نے کہا کہ جب فرد سنورتا ہے تو ظاہر کی حقیقت سے مطمئن ہوتا ہے اور باطنی دنیا کا پہلا دروازہ اس کیلئے کھل جاتا ہے۔ زندگی کا اصل مقصد اس پہلے دروازے کو کھولنا ہے جو ہر کسی پر کھلتا نہیں۔ کوئی مسجد میں، کوئی مندر اور گردوارے میں، کوئی مے خانے میں، کوئی قوال کے حال اور طبلے کی تال پر اس دروازے کی چابی ڈھونڈتا ہے مگر کام ہے کہ بنتا نہیں۔ بنے بھی کیسے جب مقصد کا حصول ہی درست نہ ہو۔

کئی پیر سائیں لوٹ رہا ہے تو کئی پروہت سب کا مشن اور مقصد لوٹنا ہے اور عام آدمی کا کام لٹنا ہے۔ ہر ایک دھوکہ دے رہا ہے اور دھوکہ کھا رہا ہے مگر سنبھلتا کوئی بھی نہیں۔ خیر چھوڑو یہ عام بات نہیں یہ خاص بات ہے اور خاص مواقع اور خاص لوگوں کیلئے ہے۔ کبھی اس پر بھی بات کریں گے۔۔۔۔ میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میں یہاں برطانیہ میں پیدا ہوئی اور ابتدائی تعلیم کے بعد میں واپس پاکستان چلی گئی۔ میں نے فیصل آباد زرعی یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا اور اس دوران پاکستان، افغانستان، بھارت، نیپال، ایران، بنگلہ دیش، ترکی، شام اور سنگاپور کی سیر کی۔ وہاں کے عام لوگوں سے ملی۔ کھیتی باڑی اور باغبانی کے طور طریقے دیکھے۔ سبزیوں، پھلوں اور غلے کی مارکیٹنگ کا نظام دیکھا۔

سنگاپور ایک جزیرہ اور چھوٹا ملک ہے۔ وہاں کیا کھیتی باڑی ہوتی ہوگی۔ میں نے پوچھا۔

تھوڑی بہت ہوتی ہے مگر مارکیٹ اچھی ہے۔ چینیوں کے علاوہ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک خاص تعداد وہاں مقیم ہے۔ وہاں کراچی اور شکار پور کے ہندو گھرانے دیکھے ہیں جو آسودہ حال اور اچھے تاجر ہیں۔ جن دنوں میں وہاں گئی تھی۔ بلانکو کورٹ نامی ملٹی سٹوری بلڈنگ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی بیشمار دکانیں تھیں جو جدید ساز و سامان سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس وقت چائنہ کا دروازہ نہیں کھلا تھا اس لئے جاپان، چین، کوریا، تائیوان اور ہانگ کانگ کا سارا مال سنگاپور کی مارکیٹوں میں بھرا ہوا تھا جہاں افغانیوں کے علاوہ پاکستان کے ٹرائبل علاقوں کے شنواری اور آفریدی تاجروں کا میلہ لگا رہتا۔ میں چاہتی تھی کہ ان ملکوں میں پاکستانی مصنوعات کی مارکیٹ بناؤں اور موسمی پھلوں، سبزیوں اور دالوں سے اپنے ملک کیلئے اور اپنے لئے مال کماؤں۔

مال کمایا؟ میں نے پوچھا۔

یہ بھی خاص بلکہ خاص الخاص بات ہے۔ پاکستان میں آپ اپنے لئے جتنا چاہئیں مال کما

سکتے ہیں۔مگر ملک کے لئے نہیں۔تمہیں پتہ ہے پاکستان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ نینا نے پوچھا۔

بھارت۔۔۔میں نے کہا۔

نہیں یہ روائتی باتیں ہیں اور اس میں ایران اور افغانستان بھی شامل کیے جاسکتے ہیں مگر ایسا نہیں۔ پاکستان کی اصل دشمن پاکستان کی کرپٹ نوکر شاہی، کرپٹ اور بے حس سیاسی قیادت اور خود بے ہمت عوام ہیں۔ نینا نے کہا۔

اگر عوام میں جرأت ہو، عقل ہو، لکیر کے فقیر نہ ہوں تو وہ ان دشمنوں کو شکست دیکر ایک جدید پاکستان کی تعمیر کرسکتے ہیں جسے کوئی بیرونی دشمن میلی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کریگا۔ جب عوام کی ذہنیت غلامانہ ہو۔ان کا قبلہ لاڑکانہ، نوڈیرو، کنگری ہاؤس، نت ہاؤس، نائن زیرو، باچہ خان ہاؤس اور رائے ونڈ کے جاتی عمرہ فارمز ہوں تو ان کا ہر کوئی دشمن ہوگا۔ مثل مشہور ہے کہ جب ہاتھی بیمار ہوتا ہے تو جنگل کے سارے درندے اس کے قریب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہاتھی کی موت پر سارے جنگل کو کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا ہے۔ اگر ہاتھی تندرست ہو جائے تو درندے واپس اپنی کچھاروں اور کمین گاہوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہی حال ملکوں اور قوموں کا ہے۔ جب کوئی ملک اور قوم ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہوا سے جلد از جلد انجام تک پہنچانے کیلئے دوسرے ملک اور اقوام بھی میدان میں اتر آتے ہیں۔

نینا نے کچھ سوچا اور پھر بولی۔ بدقسمتی سے پاکستان آج کل سخت بیمار ہے۔ ایک بڑا اور قوی ہاتھی جو ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہے۔ایک عظیم ملک جہاں دنیا کے بڑے اور عظیم پہاڑ ہیں۔ جہاں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں اور وسیع میدان ہیں، جہاں دنیا کے سب سے بڑے گلیشئر اور دریا ہیں۔ جہاں جنگل، باغات اور زرعی زمینیں ہیں۔ قدرت کی کونسی نعمت ہے جو اس ملک میں نہیں مگر دنیا کی سب سے بڑی کرپٹ بیوروکریسی اور سیاسی جتنا اس کی حکمران اور منتظم ہے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی کہنا چاہئے کہ دنیا کے سب سے زیادہ بے حس، لکیر کے فقیر اور غلامانہ ذہن رکھنے والے اٹھارہ کروڑ عوام بھی اس ملک میں بستے ہیں جنہیں خدا پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر بھروسہ ہے جو انہیں دن رات لوٹ لوٹ کر یورپ میں اپنے بینک بھر رہے ہیں۔ اپنی آنے والی نسلوں کیلئے فارم ہاؤس، جاگیریں۔ محلات اور پلازے خرید رہے ہیں مگر سب جانتے ہوئے بھی عوام بے حس ہیں اور ان ہی کی ظالمانہ حکمرانی اور لوٹ مار کو جمہوریت کہتے

ہیں۔

اس کا حل کیا ہے میں نے پوچھا۔

اس کا حل ۔۔۔ہاں۔۔۔ اس کا حل ایک گہرا ہل۔جیسے راجہ ہل۔پھر ایک سہاگہ۔پھر تپتی دھوپ۔پھر ایک ہل۔پھر تمام فالتو اور ناکارہ جڑی بوٹیوں اور جھاڑ جھنگاڑ کی صفائی اور پھر کھاد اور پانی۔۔نینا نے ایک منجھے ہوئے کیسان کی طرح بات کی۔

میں سمجھا نہیں۔

تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔

تم سکرپٹ رائیٹر اور ریڈر ہو۔تم صرف اتنا جانتے ہو جتنا بول سکتے ہو۔تم ہر پروگرام کی ایک سکرپٹ تیار کرتے ہو اور اسے پڑھتے ہو اور پھر ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر بول دیتے ہو۔اچھا اینکر وہی ہوتا ہے جو اپنے موضوع سے نہ ہٹے اور دیے ہوئے وقت میں اسے سمیٹ لے۔

کیسان اور لیڈر کے اوصاف مشترک ہوتے ہیں۔بلکل ویسے ہی جیسے ماں اور دھرتی ہیں۔ ماں اور دھرتی میں جو گہرائی ہے کیسان اور لیڈر میں اسی قدر وسعت ہے۔کیسان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایک بنجر اور چٹیل میدان کو اپنی محنت سے سرسبز کرتا ہے۔وہ فالتو اور بیکار چیزوں کو تلف کر کے کارآمد اور رسیلی چیزیں پیدا کرتا ہے۔۔۔تم نے میاں بخشؒ کو پڑھا ہے۔۔۔۔نینا بولی۔

ہاں تھوڑا سا۔زیادہ نہیں۔میں نے جواب دیا۔

ضرور پڑھنا۔

میاں محمد بخشؒ کے پنجابی کلام میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔بابا فریدؒ، وارث شاہؒ بھلے شاہؒ، سلطان باھوؒ، اور شاہ لطیفؒ کا کلام بھی بے مثال ہے مگر ان سب کی تشریح سیف الملوک میں ہے۔میاں محمد بخشؒ کا مشہور شعر ہے کہ مالی کا کام پانی دینا ہے اور ربؒ کا کام پھل اور پھول لگانا۔اگر تم پودوں اور درختوں کی پیدائش اور پرورش پر غور کرو اور سمجھو تو تمہیں انسان کی پیدائش اور پرورش سمجھ آجاتی ہے۔پودوں کی بھی نفسیات ہے۔وہ ایک ماحول میں جیتے ہیں اور پھلتے ہیں۔اگر انہیں ماحول میسر نہ ہو تو جل جاتے ہیں۔جس طرح کیسان پودوں کی نفسیات سمجھتا ہے اسی طرح ایک لیڈر عوام کی نفسیات کو سمجھ کر انہیں ایک ماحول میں ڈھالتا ہے اگر لیڈر کی نیت صاف اور جذبہ سچا ہو تو ربؒ کی طرف سے مدد آ ہی جاتی ہے۔پھر ملک مضبوط اور قومیں خوشحال

ہوتی ہیں۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم نے لٹیروں کو لیڈر تصور کر لیا اور ان کی قیادت پر تکیہ کیا ہے۔ ہمارے ملک کے سیاسی ماحول میں اتنا جھاڑ جھنگاڑ ہے کہ اللہ معاف کرے خوف آتا ہے۔اس کے باوجود ہم ایٹمی قوت بن گئے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔

تم کسی انقلات کی بات کر رہی ہو شائد۔۔۔میں نے پوچھا۔

تم درست سمجھے۔ نینا نے کہا۔ایک خونی یا پھر فکری انقلاب کے علاوہ اس کے کوئی دوسری صورت نہیں۔ میں کسی فلسفی کا قول نہیں دھراؤنگی۔ یہ ایک فیشن ہے اور لوگ اپنی علمی دھاک بٹھانے کیلئے قرآن وحدیث سے لیکر ھیگل، ٹائن بی، ابن خلدون اور دیو جانسن تک کے حوالے دیتے ہیں۔ جو انصاف نہیں کرتا وہ عمر ثانی بن جاتا ہے۔ جو عیاری اور مکاری پر ایمان رکھتا ہے وہ فقر وفکر کا مبلغ ہے۔زندگی کا کوئی پرت اٹھاؤ اس پر منافقت کی سیاہی سے لکھا ایک حوالہ ضرور ہوگیا۔فلسفیوں کی بات اپنی جگہ درست مگر ہر کھیت گنا، چاول، کیسر اور کپاس پیدا نہیں کرتا۔ ہر خطے، ملک اور معاشرے کے مسائل الگ ہیں اور ان کا حل بھی الگ الگ ہے۔ یونانی، مصری، ہندی، رومی، ایرانی اور چینی تہذیبوں میں فرق ہے۔فلسفیوں کے قول سچے ہیں مگر ہر مرض کی دوا نہیں۔ یہ قول واقوال ورکشاپوں، سیمیناروں اور تقریروں کی زینت بڑھاتے ہیں اور تحریروں کے حسن کو نکھارتے ہیں مگر کھیت کی صفائی، فصل کی بیجائی اور کٹائی کے کام نہیں آتے۔ہمیں ایک اچھا اور ہموار کھیت تیار کرنا ہے جو چار صوبوں، اضلاع اور دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ہم نے اس کھیت میں موسم کے مطابق اچھی اچھی اور صحت مند فصلوں کے بیج بونے ہیں انہیں پانی دینا ہے اور کیڑے مار اور مضر بوٹیاں تلف کرنے والی ادویات چھڑکنی ہیں۔ چوروں، ڈاکوؤں اور جنگلی درندوں کے حملوں سے اپنی فصل کو بچانا ہے تاکہ ملک سے غربت، بھوک اور بیماری ختم ہو۔ ہمارے مسائل کا حل ٹائن بی، روسو اور ہیگل کے فلسفوں میں نہیں۔ ہماری مٹی میں بھٹائیؒ، اقبالؒ اور میاں محمد بخشؒ جیسے مفکر اور درویش پیدا ہوئے اور ہمیں ان ہی کے اقوال وافکار میں اپنے مسائل کے حل ڈھونڈنے ہیں۔

تم پاکستانی اخبارات پڑھتے ہو؟

نہیں۔

پڑھا کرو۔ نینا نے کہا۔ پچھلے دنوں ایک بحث چل رہی تھی کہ کیا اقبالؒ کا فکر وفلسفہ ہمیں گیس، بجلی اور روٹی دے سکتا ہے۔۔

پھر۔۔۔میں نے پوچھا۔

پھر کیا۔لوگوں نے ڈکشنریاں نکالیں۔کمپیوٹر آن کر لئے اور بحث چھڑ گئی۔کسی نے کہا دے سکتا ہے۔کسی نے کہانہیں۔وہ جو اقبالؒ شناسی کا دعویٰ کرتے ہیں ناشناسوں سے الجھ پڑے اور کافی دنوں تک ایک فضول بحث چلتی رہی۔فضول اس لئے کہ جو اقبالؒ شناس ہیں وہ بھی ناشناس ہی ہیں چونکہ جس بحث سے عام آدمی کا فائدہ نہ ہوا سے سمجھ نہ آئے وہ فضول ہوتی ہے۔یہ بحث ایک مخصوص طبقے نے چھیڑی اور دوسرے مخصوص طبقے نے اسے وقت گزاری کا وسیلہ بنالیا اور وقت گزر گیا۔اقبالؒ خواص کا نہیں عوام کا شاعر تھا۔اقبالؒ ایک تحریک اور فکر کا نام ہے جسے سمجھنے کیلئے انگریزی دان ہونا ضروری نہیں۔قائداعظمؒ انگریزی میں تقریر کرتے تھے تو لوگ روتے تھے۔یہ لوگ بھی سیالکوٹ کے تھے جس کی مٹی سے اقبالؒ کاخمیر اٹھا۔کسی نے پوچھا روتے کیوں ہوتمہیں کچھ سمجھ آرہی ہے۔سیالکوٹ کے دیہاتوں سے آئے ان پڑھ کیسانوں نے کہا انگریزی سمجھ نہیں آرہی جذبات سمجھ رہے ہیں۔یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے اور سچی بات دل پر لگتی ہے۔یہ ہمارے دل کی بات کر رہا ہے۔قائداعظمؒ وہی بات کر رہے تھے جو اقبالؒ نے کی۔اقبالؒ نے جو کہا وہ بھی نیا نہیں تھا۔جو اقبالؒ نے کہا وہی سعدیؒ نے فارسی میں کہا،میاں محمد بخشؒ نے پنجابی میں کہا،بھٹائیؒ نے سندھی میں کہا۔خوشحال خان خٹک اور رحمٰن باباؒ نے پشتو میں کہا۔

سب نے کہا!اے غافلو جاگو، ہمت کرو،غلامی نے نجات پاؤ،غلامانہ ذہنیت چھوڑو اور محنت کرو۔بحث چھیڑنے والے نے سچ کہا کہ اقبالؒ کے پیغام میں بجلی،گیس اور روٹی نہیں۔اسے کیا پتہ کہ اقبالؒ کون تھا۔ہاورڈ اور آکسفورڈ میں تو اقبالؒ نہیں پڑھایا جاتا۔اب تو پاکستانی تعلیمی اداروں میں بھی اقبالؒ اور جناحؒ کی جگہ آصف زرداری،نواز شریف اور پرویز مشرف نے لے لی ہے۔سرحد میں باچا خان کی تصویر قائداعظمؒ کی جگہ سرکاری دفاتر میں دیکھائی دیتی ہے اور ایوان صدر میں ہر طرف بھٹو خاندان نظر آتا ہے۔سندھ میں الطاف بھائی ہیں اور بلوچستان میں کوئی بھی نہیں۔امیر اور حکمران خاندانوں کو کیا پتہ کہ اقبالؒ کا پیغام بے حمیت اور بے ہمت لوگوں کیلئے نہیں۔اقبالؒ کے پیغام میں غیرت اور جرأت تھی جو ہم نے چھوڑ کر اغیار کی غلامی اختیار کی ،باہمی اختلافات اور عداوتیں پال لیں۔اقبالؒ نے اپنے پیغام میں نہیں کہا کہ ڈیم نہ بنانا،بجلی پیدا نہ کرنا۔کرپشن کرنا اور کرپٹ سیاستدانوں کو لیڈر مان کر ان کی پوجا کرنا۔اقبالؒ کا پیغام جرمنوں اور ایرانیوں نے سمجھا اور ان کے پاس بجلی بھی ہے اور کپڑا بھی،گیس بھی ہے اور غیرت

بھی، بات صرف سمجھنے کی ہے جسے سمجھ آجائے۔ اقبالؒ کا پیغام غیرت مندوں کیلئے تھا اور غیرت اب ہماری میراث نہیں۔

ہمارے ملک میں ترقیاتی پروگرام، سکیمیں اور پروجیکٹ بھی ایسے ہی بنتے ہیں۔ وقت گزاری کے لئے۔ میں نے پوچھا۔

ہاں وقت گزاری کیلئے۔۔

پروجیکٹ، پروگرام اور سکیمیں۔ ترقی اور خوشحالی کے لئے نہیں بلکہ کک بیک، کمیشن، غبن اور کرپشن کے لئے بنتی ہیں۔ جس ملک میں حج سکیم میں کرپشن ہو۔ رشوت ہو، غبن ہو، اقربا پروری ہو وہاں اور کس چیز کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ دیکھو دو باتیں یاد رکھو۔

کونسی دو باتیں؟ میں نے کہا۔

پہلی بات یہ کہ فکر و فلسفہ ایک بنیادی چیز ہے۔ کنفیوشس کے فکر و فلسفہ نے ایک افیونی اور سست قوم کو دنیا کی عظیم اور ترقی یافتہ قوم بنادیا۔ میں چین کا حوالہ دے رہی ہوں۔ کوریا، تائیوان، سینگاپور اور جاپان بھی اسی فکر و فلسفہ پر کار بند ہیں مگر چین دشمنی میں اس کا اظہار نہیں کرتے۔

چین میں وقت گزاری کے لئے کنفیوشس اور ماؤ کے افکار پر فضول بحث نہیں ہوتی چونکہ وہاں لوگوں کو کام سے فرصت نہیں اور نہ ہی وہاں بیرونی طاقتوں کے تنخواہ دار، دانشور اور قلمکار ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کا فلسفہ و فکر خودداری، قومی غیرت، جذبہ ایثار و قربانی اور انتھک محنت اور لگن پر مبنی ہے۔ ہمارے ملک کے شیدے اور میدے سیاستدان اور حکمران کہتے ہیں کہ خودداری اور غیرت سے جینے کا مطلب امریکی امداد کی بندش اور بیرونی دوروں اور خیر خیرات پر پابندی ہے۔

ویسے شیدے کی بات میں وزن ہے۔ میں نے کہا۔

وزن تو من موہن سنگھ، ایل کے ایڈوانی اور سونیا گاندھی کی باتوں میں بھی ہے۔ وزن امریکی تھنک ٹینک اور نیو کانز کی باتوں میں بھی ہے۔۔۔ اگر امداد اور خیرات پر ہی جینا ہے تو امریکہ اور بھارت کی باتیں مان لو۔ بلوچستان، پختونستان، سندھو دیش، جناح پور کو بننے دو۔ فوج اور ایٹمی پروگرام کو ختم کرو اور پنجاب کا نام پاکستان رکھو اور خوشحالی سے جیو۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے کہا۔

تو پھر شیدے، میدے اور فیدے سے نجات حاصل کرو۔ امریکی امداد کو مسترد کرو اور ایک بار دیوالیہ ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اگر ایک بار ہمت کا مظاہر ہو گیا تو نہ امریکی امداد بند ہو گی، نہ ملک دیوالیہ ہو گا بلکہ شیدوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ امریکہ افورڈ ہی نہیں کر سکتا کہ پاکستان چین کے اور قریب ہو جائے اور کلی طور پر چین پر انحصار کرے۔ سعودی عرب بھی پاکستان سے قطع تعلق نہیں کریگا اور بہت سے ملک پاکستان کے قریب ہو کر اس کی نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرینگے۔

اس کا مطلب؟ میں نے پوچھا۔

مغرب اور امریکہ کی مکمل شکست اور دنیا میں نئی ہلچل۔ ایک نئی طالبانا ئیزیشن اور ایک خونی انقلاب اور سیلاب جو پاکستان، افغانستان اور ایران کے دریاؤں سے بہتا ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر سب کچھ بھسم کر دے گا۔ جب سمندروں کو آگ لگے گی تو کوئی ایٹمی قوت، بحری بیڑہ، بندرگاہ، ملک اور قوم اس کی تپش سے بچ نہ پائے گی۔ یہ امریکہ کو بھی پتہ ہے اور اہل مغرب کو بھی۔ سندھو دیش، جناح پور، پختونستان اور گریٹر بلوچستان والے خود فہمی کے نشے میں ہیں۔ انہیں پتہ نہیں کہ ٹہنی شاخ سے کٹ کر درخت نہیں بنتی۔ گملے، گلدان اور باغ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ گملوں میں موسمی پھول اور گلدانوں میں کٹی ہوئی شاخیں سجائی جاتی ہیں۔ گلدانوں میں پھول اور ٹہنیاں بدل دی جاتی ہیں اور گملوں کے پھولوں کی عمریں مختصر ہوتی ہیں۔

دوسری بات کیا تھی؟ میں نے پوچھا۔

دوسری بات پہلی بات کی تشریح ہے۔ نینا نے کہا۔

دوسری بات خودداری سے جیو۔ خود انحصاری کا مظاہرہ کرو، ظالم کا ہاتھ روکو اگر نہیں رکتا تو توڑ دو۔ عدل مانگو نہیں ملتا تو بے عدل کو عدالت سے باہر نکالو۔ انصاف کرو اور انصاف مانگو۔

یہ تو سول نافرمانی کی باتیں ہیں۔

نہیں۔ یہ سول نافرمانی نہیں بلکہ خودداری اور غیرت کی باتیں ہیں۔

کیا پولیس گردی کا شکار ہو کر جیل جانے اور باہر آ کر چور، ڈاکو اور سمگلر بننے سے بہتر نہیں کہ ظالم اور کرپٹ پولیس والے کا مقابلہ کیا جائے۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے کہا۔ مگر۔۔۔۔۔

مگر کیا۔

مگر ایسا ممکن نہیں اگر ظالم پولیس والے کا مقابلہ کرو گے تو صفحہ ہستی سے نہ صرف خود مٹ جاؤ گے بلکہ سارے خاندان کو ساتھ لے ڈوبو گے۔ ہر سیاسی جماعت میں کرپٹ سیاستدان، سمگلر، ڈاکو، گدی نشین پیر اور مخدوم تو ہوتے ہی ہیں مگر ان سب کے علاوہ کچھ ججوں، جرنیلوں، سول بیوروکریسی اور صحافیوں کی خاموش ممبرشپ بھی ہوتی ہے جو اس کرپٹ نظام کو چلاتے ہیں اور اپنا اپنا حصہ لیتے ہیں۔ پولیس ان ہی خاموش سیاسی ممبروں اور کارکنوں کے اشاروں پر سیاسی گھرانوں اور ان کے جیالوں اور عدالتوں کی خدمت کرتی ہے۔ ظالم سرکاری اہلکار کو چیلنج کرنے کا مطلب ایک سیاسی جماعت سے ٹکر لینا اور انڈر ورلڈ کے غنڈوں اور لیڈروں کو للکارنا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔۔ نینا نے کہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ شائد میں جذباتی ہوگئی تھی۔ پھر کہنے لگی سندھ میں ایک مشہور ڈاکو تھا نادر جسکانی۔

وہ ایک عام آدمی تھا۔ شائد میں صحیح نہ بتا سکوں مگر میں نے ایسا ہی سنا ہے۔ نادر جسکانی ایک غریب لڑکا تھا اور کہیں سکھر کے علاقہ میں سڑک کے کنارے ہوٹل پر ٹی بوائے کا کام کرتا تھا۔ اس ہوٹل پر پنجاب اور کراچی سے آنے والے ٹرک رکتے تھے اور مسافر کچھ دیر کیلئے آرام کرتے تھے۔ ایک دن ایک ٹرک خراب ہوگیا اور نادر نے ٹرک ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو قریب ہی اپنی جھگی میں رات گزارنے کی دعوت دی۔ ٹرک ڈرائیور نے نادر کی ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور رات کے اندھیرے میں اس کی معصوم بہن اور بیوہ ماں کے ساتھ بدکاری کا مرتکب ہوا۔ نادر کو پتہ چلا تو اس نے بدلہ لیا اور ٹرک ڈرائیور کو ہلاک کردیا۔

پھر۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔

نادر پر قتل کا مقدمہ بنا اور پولیس نے نادر پر ہر طرح کا ظلم کیا۔ پولیس والوں نے اس کی ماں اور بہن کو کئی بار اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر کسی نے شائد پولیس والوں نے ہی اس کی بہن کو قتل کردیا اور ماں علاقہ چھوڑ کر روپوش ہوگئی۔ نادر کسی طرح پولیس کے شکنجے سے بھاگ کر کچے میں چلا گیا اور ڈاکوؤں کے جھتے میں شامل ہوا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ نادر نے چن چن کر پولیس والوں، بدمعاش ڈرائیوروں اور اپنے مخالفین کو قتل کیا۔ ٹرک، بسیں اور گاڑیاں لوٹیں اور سارے سندھ میں دہشت کی علامت بن گیا۔ نادر جکانی کو پکڑنے اور مارنے کے لئے پولیس ناکام ہوئی تو فوج طلب کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار نادر کے ایک ڈی ایس پی دوست نے اسے گھر بلا کر قتل کردیا اور لاش ریلوے پھاٹک پر لا کر پولیس مقابلہ ظاہر کردیا۔

ریلوے پھاٹک پر کیوں؟ میں نے سوال کیا۔

ڈی ایس پی نے کہا کہ اسے مخبر نے بتایا تھا کہ نادر جسکانی اس راستے سے بھیس بدل کر گزرے گا لہٰذا انے میں پھاٹک پر ناکہ لگایا اور نادر کو دھرلیا۔ نادر کے متعلق کئی قصے اور کہانیاں گھڑی گئیں۔ نادر کا تعلق الذولفقار نامی تنظیم سے جوڑا گیا۔ نادر کو بیرونی قوتوں کا ایجنٹ بتایا گیا اور جب بے نظیر کی پہلی حکومت آئی تو نادر سمیت تمام ڈاکوؤں کو سیاسی ورکر اور جمہوریت کی راہ پر قربان ہونے والے ہیروز بنا دیا گیا۔

دیکھو اگر پولیس انصاف سے کام لیتی تو نادر کی ماں اور بہن سے زیادتی کرنے والوں کو عدالت میں لاتی اور انہیں سزا دلواتی تو نادر قاتل نہ بنتا۔ اگر سیاستدان اور میڈیا ذمہ داری کا ثبوت دیتے تو اصل حقائق کو سامنے لاتے اور ڈاکو اور قاتل سیاسی ورکر اور جمہوریت کی راہ پر جان نچھاور کرنے والے ہیرو نہ بنتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سیاستدان، ان کا ہمنوا میڈیا، جرائم پیشہ عناصر اور پولیس ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

اس کا کوئی حل بھی تو ہوگا۔ میں نے نینا سے پوچھا۔

اس کا حل خونی انقلاب، ایک سول نافرمانی کی تحریک یا پھر مثبت اور تعمیری سوچ۔

مثبت اور تعمیری سوچ کو کس طرح اجاگر کیا جائے کہ سول نافرمانی اور خونی انقلاب سے بچا جا سکے۔ میں نے کہا۔

سیاسی بت پرستی کو ترک کر کے اچھے اور عام لوگوں کا چناؤ جیسے ایران، ملائشیا، روس اور ونزویلا کے عوام نے کیا۔ آزاد وخود مختار اور سیاسی وابستگی سے مبرا اور کرپشن سے پاک عدلیہ۔ سیاستدانوں، جاگیرداروں اور بیوروکریسی کا شفاف اور کڑا احتساب۔ صوابدیدی اختیارات، صوابدیدی کوٹے اور استحقاق کا خاتمہ۔ سینیٹروں، اسمبلی ممبروں اور وزیروں مشیروں کے پروٹوکول اور عیاشیوں کا خاتمہ۔ ورنہ صرف اور صرف تباہی و بربادی اور غلامی۔

مگر نینا یہ ممکن نہیں۔ وزیر کو سیکیورٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔

برطانیہ میں بھی وزیر ہیں۔ چین اور امریکہ میں بھی سینیٹر اور کانگریس کے ممبر ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں حکومتی اور سرکاری لوگ ہوتے ہیں۔ کیا ان ملکوں کی پولیس کا کام صرف اور صرف وزیروں، مشیروں، سرکاری اہلکاروں اور اسمبلی ممبروں کی حفاظت ہوتا ہے۔ جسے خود پر بھروسہ نہیں، جسے عوام میں پذیرائی نہیں، جس کے عمل و کردار کی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ، جس نے

لوٹ مار کا مال جمع کر رکھا ہے اور عوام میں رہتے ہوئے خوف آتا ہے وہ الیکشن نہ لڑے اور نہ ہی وزیر بنے۔ اسے چاہیے کہ اپنے گھر میں رہے اپنی حفاظت خود کرے اور مزے سے جیئے۔

اس سے آدھے مسائل حل ہوجائینگے۔ حکومت قانون سازی کرے اور صرف مناسب سیکورٹی کے علاوہ پولیس کو اپنا کام کرنے دے تاکہ ملک میں قانون کی حکمرانی ہو اور ہر شخص کو تحفظ ملے۔ اگر پولیس سیاستدانوں کی حفاظت پر ہی لگی رہے گی تو یقیناً غنڈہ گردی بڑھے گی اور عوام میں بد دلی اور بے چینی ہوگی۔ کرپشن میں اضافہ ہوگا اور عوام کا حکومتی اداروں سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ عدلیہ میں کرپٹ اور سیاسی جج ہونگے تو فیصلے با اثر لوگوں کے حق میں ہونگے اور عوام حاجی منگل باغ آفریدی، فضل اللہ، صوفی محمد اور بیت اللہ مسعود جیسوں کی طرف دیکھیں گے۔ اگر یہ مرگئے یا ماردیئے گئے تو ایسے درجنوں اور پیدا ہوجائینگے چونکہ فضل اللہ اینڈ کمپنی کرپٹ سیاسی اور عدالتی نظام کا ری ایکشن ہے۔ یہ فیصلہ بھی عوام کو کرنا ہے کہ انہیں ایک صاف ستھرا سیاستدان، عدل کرنے والا جج اور حفاظت کرنے والا پولیس مین چاہیے یا ایک خودکش بمبار یا منگل باغ آفریدی۔

عدالت، پولیس اور سیاستدان سے منگل باغ کا کیا تعلق؟ میں نے پوچھا۔

میں نے کہا ناں کہ منگل باغ اور فضل اللہ معاشرتی اونچ نیچ، غنڈہ گردی، سیاسی دہشت گردی، نا انصافی اور پولیس گردی کا ری ایکشن ہے۔ لوگ ججوں سے عاجز آکر طالبان کے پاس چلے گئے، انہوں نے فضل اللہ، منگل باغ اور مسعود کو اپنا لیڈر مان لیا اور ان کے حکم پر لوگوں کے گلے کاٹنا اور خود کو بارود سے اڑانا شروع کردیا۔ اگر آج یو این او کی نگرانی میں آزاد اور شفاف الیکشن ہوں تو لوگ زرداری، میاں برادران اور چوہدریوں کے مقابلے میں منگل باغ، مولوی عبدالعزیز اور فضل اللہ کو زیادہ ووٹ دینگے۔

کیا یہ لوگ ملک بھی چلالینگے؟ میں نے پوچھا۔

نہیں۔ ملک تباہ کردینگے۔

زرداری، میاں اور چوہدری آہستہ آہستہ تباہ کرینگے اور اپنا اپنا حصہ امریکہ، کوریا، برطانیہ، فرانس وغیرہ لے جائینگے۔ جیسے پرویز مشرف، شوکت عزیز اور سینکڑوں روشن خیال اور ان کے ہم خیال لے گئے۔ زرداری، میاں اور چوہدری غیر محسوس طریقے سے اور چند سالوں میں جو کام کریں گے۔ مولوی، ملاں اور طالب چند دنوں میں کردینگے جیسے انہوں نے سوات اور بونیر

میں کیا۔

پھر؟

پھر وہی آزاد عدلیہ، ذمہ دار بیوروکریسی، مڈل کلاس اور پڑھی لکھی سیاسی قیادت۔ ورنہ منگل باغ اور فضل اللہ۔ نینا نے کہا۔

یہ لوگ تو جلد مارے جائینگے۔ فوج انہیں ختم کردے گی۔ حکومت سے لڑنا مشکل ہے۔ چاہے امریکہ، روس، اسرائیل اور بھارت طالبان کی کتنی ہی مدد کیوں نہ کریں۔ امریکہ اور اہل مغرب کا دوغلہ پن بھی زیادہ عرصہ نہیں چلے گا اور نہ ہی غیر ملکی امداد پر چلنے والی تحریک طالبان لمبی مدت تک اپنا وجود قائم رکھ سکے گی۔ میں نے کہا۔

تم ٹھیک کہتے ہو مگر یہ ابتداء ہے۔ موجودہ تحریک طالبان ایک بنیاد ہے کچھ لوگ ان سے لاتعلق بھی ہوجائینگے اور نفرت بھی بڑھے گی چونکہ ان کے رویے میں درندگی اور سفا کی ہے۔ مگر آنے والے طالبان ایسے نہیں ہونگے۔ وہ قرآن سمجھنے والے اور نرم رویہ رکھنے والے ہونگے۔ ان کا طریقہ مختلف ہوگا۔ وہ سوات کے جنگلوں میں نہیں پارلیمنٹ ہاؤس اور گورنر ہاؤس کے سامنے ہونگے۔ تم نے چاؤسیسکو کا اختتام دیکھا تھا۔ نینا نے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

وہ بھی ایک طالبنائیزیشن ہی تھی۔ جیسے ایران میں ہوا۔

اگلی صف میں طالب علم، دوسری میں مزدور کیسان اور محنت کش، تیسری میں پروفیسر، استاد اور عام لوگ۔

ڈکٹیٹر کے جج، جرنیل اور کارندے چند روز بھی ان طالبان کے سامنے کھڑے نہ رہ سکے اور دیکھتے ہی دیکھتے رومانیہ خون کی بارش میں نہا گیا مگر ہمارے حالات مختلف ہیں۔ ہم کشت وخون سے بچ سکتے ہیں۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

جج ڈٹ کر اور کھل کر سچا انصاف کریں۔ توہین عدالت کے ہتھیار سے اپنی کرپشن اور مظالم کو تحفظ نہ دیں۔ جج اپنے حقیقی اثاثے سامنے لائیں اور حکومت سے لئے ہوئے پلاٹ اور زمینیں واپس کردیں۔ جرنیل بھی اتنا ہی لیں جتنا ایک عام فوجی کو ملتا ہے۔ جرنیل کالونیاں، وسیع زرعی زمینیں اور سٹڈ فارمز ختم کریں۔ جرنیلوں، ججوں اور سیکرٹریوں کی خصوصی مراحات ختم ہوں اور وہ

عام انسانوں کی طرح جئیں۔

جرنیل، سیکرٹری اور جج عام انسانوں کی طرح نہیں جیتے کیا؟ میں نے پوچھا۔

نہیں۔ ان لوگوں نے اپنا آئین، قانون اور معاشرہ تشکیل دے رکھا ہے۔ یہ لوگ ریٹائر ہونے سے پہلے اتنا جمع کرتے ہیں کہ آنے والی نسلیں بھی عیش کرتی ہیں۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ ریٹائیر ہوتے ہی نہیں بلکہ ایک نوکری سے دوسری پر منتقل ہوجاتے ہیں اور قبر میں منتقلی تک نوکری کرتے ہیں۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

میری کچھ سہیلیاں ہیں جن کے باپ سرکاری ملازم تھے۔ ایک جرنیل کی بیٹی ہے اور دوسری بریگیڈیئر کی۔ بریگیڈیئر کی بیٹی کا سسر جج ریٹائیرڈ ہوا ہے اور جرنیل کی بیٹی ایک سیکرٹری کی دوسری بیوی ہے۔

پہلی کہاں گئی؟ میں نے سوال کیا۔

پہلی ایک سیاستدان کی گرل فرینڈ تھی آج کل شائد اُسی کی بیوی ہے۔ نینا نے کہا۔

میں ایک بڑے زمیندار گھرانے سے ہی نہیں بلکہ کاروباری طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ سندھ میں ہماری زمینیں سونا اگلتی ہیں اور برطانیہ میں ہمارا کاروبار پونڈوں کی بارش برساتا ہے۔ یہاں ہماری زندگی نارمل ہے کسی کو ہمارے پیسے اور سٹیٹس کی پرواہ نہیں۔ یہاں کون کیا کھاتا ہے، کیا کماتا ہے، کیسے رہتا ہے، کسی کو غرض نہیں۔ اور یہی اس معاشرے کی خوبصورتی ہے۔ پاکستان کے تمام اعلیٰ سرکاری افسروں، زمینداروں، سمگلروں، نو دولتیوں، سرکاری خزانہ لوٹنے والوں، زمینداروں اور جاگیرداروں کے مکان، فلیٹ، فارمز اور کاروبار یہاں موجود ہیں چونکہ یہی ان کا اصل وطن ہے۔ سیاستدانوں کا اپنا سٹائل ہے اور ان کی رہائش گاہیں دنیا کے ہر ملک میں ہیں۔ پاکستان میں جو شخص ایک بار ایم این اے، ایم پی اے یا سینیٹر بن جاتا ہے وہ اگلے برس برطانیہ، سپین، فرانس اور اب شائد آسٹریلیا میں ایک اچھا اپارٹمنٹ یا گھر خریدنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ میں جس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اسے وڈیرا، جاگیردار، زمیندار یا پھر کاروباری طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ اس طبقے کا رشتہ افسروں، نو دولتیوں اور کرپٹ سرکاری ملازمین سے بھی جڑتا ہے جو کہ ایک فطری عمل ہے۔ پیسہ حلال کا ہو یا حرام کا پیسہ پیسے کو پہچانتا ہے اور ایک تعلق قائم کرلیتا ہے۔ پیسے اور پیسے والے کا کوئی مذہب، دین اور دھرم نہیں ہوتا۔ پیسہ نام ہی

ایک رشتے، ایک دین، ایک دھرم اور ایک گہرے تعلق کا ہے۔ پیسے والے پاکستانی طبقے کے لوگ جب یہاں برطانیہ آتے تو انہیں اپنی دولت کا دکھلاوا کرنے کے لئے ایک ایسے ہی طبقے کی ضروت ہوتی ہے جو پہلے سے یہاں سیٹل ہو اور جس کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ لوٹ مار اور کرپشن سے کمائے ہوئے مال سے میچ کر سکے۔ میری یہ دونوں سہیلیاں جب بھی برطانیہ آتی ہیں آنے سے پہلے پورا پروگرام ترتیب دیتی ہیں۔ پہلے پیرس۔۔ پھر نیویارک اور آخر میں ایک ماہ لندن۔ واپسی پر دوبئی۔ وہاں سے سعودی عرب۔ عمرہ اور واپس کراچی یا پھر اسلام آباد۔

یہ تفصیل بتانے کی وجہ؟

ذہنی آسودگی۔ دیکھو وہ اپنی دولت کا شو آف کرتی ہیں کہ ان کے پاس کتنا مال ہے اور وہ ہر سال کتنا خرچ کرتی ہیں۔ مہنگے سٹور، کلب اور ہوٹل ان ہی کے دم سے چلتے ہیں۔ پاکستانی شہزادے اور شہزادیاں بعض اوقات عرب شہزادوں کے مقابلے پر آجاتے ہیں۔ اور دل کھول کر دولت لٹاتے ہیں۔ عرب سے جو شہزادے اور شیخ آتے ہیں انہیں اپنی پسند کی عورتیں اور لڑکیاں سارے یورپ میں دستیاب ہوتی ہیں۔ کلبوں، ہوٹلوں اور جوئے خانوں کے مالکوں کو عربوں کے ٹیسٹ، جیب اور وقت کا پتہ ہوتا ہے کہ کس کو کتنا مال اور کتنے دن کیلئے چاہیے اور وہ کتنا وقت اس کے ہوٹل، کلب یا کیسینو میں گزارے گا۔ ان کی خواہش کے احترام میں یورپ، اسرائیل، مصر، لبنان، افغانستان، روس، پاکستان اور بھارت سمیت مختلف ممالک سے خواتین سیزن گزارنے آتی ہیں اور لاکھوں کما کر جاتی ہیں۔ مگر پاکستانیوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ مردوں کے اپنے اور عورتیں کے اپنے شغل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عرب بھائیوں سے صرف جوئے خانوں اور کلبوں میں ملتے ہیں اور دونوں اپنی حلال اور حرام کی کمائی لٹا کر آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ تم پھر پوچھو گے کہ آسودگی کیوں۔ آسودگی اس لئے کہ دونوں کا مال اپنا نہیں ہوتا۔

شیخ اپنا فالتو پیسہ پھینکتا ہے اور خوش ہوتا ہے جبکہ پاکستانی بیوروکریٹ، وڈیرہ، جاگیردار اور سیاستدان پاکستانی قوم کی جیب سے نکالی ہوئی رقم پر ایک امیر کبیر شہزادے یا شیخ کو چیلنج کرتا ہے جس کا وہ ویسے تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ دولت کی چمک سے شیخ کی داشتہ کا ایک بوسہ لیکر فاتح عالم بن جاتا ہے اور آنے والے سال تک اس کا نشہ محسوس کرتا ہے۔ ہاں۔ میں تمہیں جرنیلوں، سیکرٹریوں اور ججوں کی مراعات بتا رہی تھی۔ ہر بریگیڈیئر کو کم از کم چار پلاٹ اور زرعی زمین ملتی

ہے۔ جرنیل کو چار سے آٹھ پلاٹ اور اپنی پسند کا مکان دیا جاتا ہے۔

مکان تو سب ہی افسروں کو ملتا ہے اور وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے ممبر ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔

ہاں وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے ممبر ہوتے ہیں اور ریٹائیرڈ منٹ تک اپنی تنخواہ سے کٹوتی کرواتے ہیں مگر مکانوں مکانوں میں فرق ہوتا ہے۔ بریگیڈیئر کو بڑا اور الگ مکان ملتا ہے تا کہ ریٹائیر ہو کر بھی اس کا سٹیٹس الگ اور نمایاں رہے۔ اسی طرح جرنیلوں کے محل الگ تعمیر ہوتے ہیں۔ لاہور، کراچی، راولپنڈی اور شائد اب اسلام آباد میں باقائدہ جرنیل پورے آباد ہیں جہاں عام آدمی کی پہنچ تو درکنار سوچ بھی نہیں جاسکتی۔ اسی طرح بریگیڈیئروں کی کالونیاں بھی الگ ہیں جہاں صرف جرنیل جاسکتے ہیں۔

جب کوئی بریگیڈیئر، جنرل کے عہدے پر پہنچتا ہے تو اسے الگ سے ایک بڑے سائز کا پلاٹ آلاٹ کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی مرضی کے نقشے کے مطابق اپنا محل نما مکان تعمیر کرتا ہے۔ اسے مکان کی تعمیر کیلئے جی ایچ کیو سے بلاسود قرضہ فراہم کیا جاتا ہے جو وہ آسان قسطوں پر ادا کر دیتا ہے۔ ان آسان اقساط کی بھی اپنی کہانی ہے جس پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ پاکستان کی ہر چھوٹی بڑی چھاؤنی میں ٹرپس ویلفیئر شاپنگ سنٹر، پلازے، بیکریاں، ڈیری فارم اور میٹ اینڈ فش شاپس ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ ٹرپس کی ویلفیئر کے لئے ہے اور آرمی افسروں، جوانوں اور ان کی فیملی کو ہر اچھی اور معیاری چیز چھاؤنی کے اندر دستیاب ہے مگر اس میں بھی بہت سے مگر ہیں جن میں اگر کی بہت گنجائش ہے۔ مگر اگر کبھی ہوتا نہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سیالکوٹ چھاؤنی سے ایک جرنیل صاحب آرمی کے مخصوص کوٹہ پر حج کے لئے تشریف لے گئے تو ان کی غیر موجودگی میں ان کی تبدیلی ہوگئی۔ ان دنوں سیالکوٹ چھاؤنی میں شاپنگ مال کا ایک حصہ زیر تعمیر تھا جسے جرنیل صاحب اپنی موجودگی میں مکمل کروانا چاہتے تھے۔ ارض مقدس پر جرنیل کو جب اپنی تبدیلی کی خبر ملی تو ان پر حج بوجھ بن گیا۔ انہوں نے ساری عبادات ایک طرف رکھ کر دن رات اپنے سٹاف کو فون کرنے شروع کر دیئے اور حکم پر حکم جاری کرنے لگے کہ میری واپسی سے پہلے پہلے شاپنگ مال کی تعمیر مکمل ہونی چاہیے۔ جرنیل کے سٹاف نے شاپنگ مال کو چونڈہ کا محاذ بنادیا اور دن رات کام کروا کر جرنیل کی واپسی تک شاپنگ مال کا کام مکمل کروادیا۔

مگر کیوں؟ میں نے پوچھا۔

اس کا جواب تو وہ ٹھیکیدار یا پھر ایم ای ایس کا نمائندہ دے سکتا ہے جس نے یہ پلازہ تعمیر کیا یا پھر جن کی نگرانی میں ہوا۔ بتاتی چلوں کہ یہ صاحب ایک شریف اور سادہ طبیعت جنرل کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کے دو بیٹے کیڈٹ کالج حسن ابدال میں زیر تعلیم تھے جنہیں کیک، پیسٹریاں اور بسکٹ کھانے کا شوق تھا۔ بچوں کے شوق کے لئے ایک حوالدار ہر ہفتے سیالکوٹ سے بیکری کا سامان لے کر حسن ابدال جاتا اور اس خصوصی سامان کی تیاری پر فوجی بیکری میں خاص توجہ دی جاتی۔

ہوسکتا ہے جنرل صاحب حوالدار کا کرایہ، سفری اخراجات اور کیک پیسٹریوں کی قیمت ادا کرتے ہوں۔

ہاں ۔۔۔ کاش ۔۔۔ اگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ نینا نے ہنس کر کہا۔

میں لاہور اپنی دوست سے ملنے گئی۔ میری دوست کا خاوند گلاس کمپنی میں کام کرتا تھا جس کا باس ایک جنرل کی کوٹھی میں کرایہ پر رہتا تھا۔ یہ ایک وسیع محل نما کوٹھی تھی جو افغانستان سے لائی گئی پختہ اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی۔ جنرل صاحب چونکہ حاضر سروس تھے اس لئے وہاں فوجی گارڈ بھی تعینات تھی۔ خصوصی بات یہ تھی کہ اس محل نما کوٹھی میں افغانستان سے لائی گئی لکڑی، سنگ مرمر اور اینٹوں کا اتنا سٹاک موجود تھا جس سے ایک اور محل تیار ہوسکتا تھا۔ جنرل صاحب نے ریٹائیر ہوکر بھی ملک اور قوم کی خدمت جاری رکھی اور تعلیم اور ریلوے کے محکموں میں انقلابی تبدیلیاں لاکر انہیں جدید تر بنا دیا۔

جرنیلوں کی ایک الگ دنیا ہے پاکستان میں جرنیل ہونا پاکستان کا صدر یا وزیر اعظم ہونے سے کئی بہتر ہے۔ پاکستان میں جرنیلوں کی مراعات سربراہ مملکت جیسی ہیں جو شاید دنیا میں اور کہیں نہیں۔ پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم پانچ سال کے لئے ہوتا ہے اور کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا ہے ۔۔۔ اکثر یہ کام بھی جرنیل خود ہی سنبھال لیتے ہیں اور کبھی گیارہ بارہ سالوں سے پہلے یہ قومی خدمت نہیں چھوڑتے ۔۔۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔۔۔ مگر جرنیل ہر سال پچیس سے تیس بنتے ہیں۔ اگر جرنیلوں کی سہولیات اور مراعات کا یہ سلسلہ جاری رہا تو آنے والے چند سالوں میں ملک کی سارے زمینیں جرنیلوں کی ذاتی زمینوں اور ملک کے سارے صاف ستھرے علاقے جرنیل پوروں میں تبدیل ہو جائینگے۔ میں نے ترکی، جرمنی اور دوسرے کئی ممالک میں

فوجی چھاؤنیاں اور ریٹائیرڈ آفیسروں کی رہائش گائیں دیکھی ہیں مگر جو شاہانہ سٹائل ہمارے ملک میں ہے وہ کہیں اور نہیں۔ میرے پڑوس میں ایک ریٹائیرڈ برٹش جرنیل کی بیوہ رہتی ہے۔ کئی سالوں تک وہ اس مکان کی قسطیں جمع کرواتی رہی اور اب بڑھاپے میں یہ مکان اس کے نام ہوا ہے۔ ترک فوج دنیا کی بہادر افواج میں شمار ہوتی ہے۔ میں نے انقرہ اور استبول میں جرنیلوں کو باوردی اپنی بیگمات کے ہمراہ شاپنگ کرتے دیکھا ہے۔

استبول میں ایک پاکستانی ائیر فورس افسر ٹریننگ کے لئے آیا ہوا تھا۔ توپ کاپی میوزیم میں ہماری ملاقات پاکستانی افسر اور ان کی بیگم سے ہوئی تو انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر دعوت دی۔ ہم ائیر فورس آفیسرز اپارٹمنٹ میں گئے۔ کھانا کھایا تو تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ایک خوبصورت ترک خاتون ایک بڑا سا برتن لے کر آئی۔ ہم سب سے ہاتھ ملایا اور ترکی میں کچھ کہہ کر چلی گئی۔ ہماری میزبان نے بتایا کہ یہ میری پڑوسن ہے۔ ترک فضائیہ کے سربراہ کی بیٹی ہے اور خاوند فائیٹر پائیلٹ ہے۔ اسے پتہ چلا کہ میرے پاکستانی مہمان آئے ہیں تو آپ کے لئے لسی میں کھیر پکا کر لائی ہے جو ترکوں کی پسندیدہ اور انتہائی لذیز ڈش ہے۔ ایک حسین عورت کے ہاتھوں سے پکی کھیر واقعی لذیز تھی مگر حیران کن بات یہ تھی کہ وہ فضائیہ کے چیف کی بیٹی تھی جو عام قسم کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ ہم نے تفصیل جانی تو پتہ چلا کہ ائیر چیف بھی ایسے ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ ترک جرنیل کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے جنرل اسلم بیگ کی بیٹی کی شادی اور طاہرہ انور شمیم کا شاہی سٹائل یاد آ گیا۔ جب تک جرنیل اپنا شاہانہ پن ترک نہیں کرتے۔ اپنے لئے علیحدہ قانون بنانا نہیں چھوڑتے تب تک پاکستان کا کوئی ادارہ، کوئی محکمہ کوئی فرد درست نہیں ہوسکتا۔

جرنیلوں کی زندگیوں سے پاکستانی معاشرے اور ریاست کے دیگر اداروں کا کیا تعلق ہے۔ میں نے پوچھا۔

بڑا گہرا تعلق ہے۔ پاکستانی فوج ایک مضبوط اور سب سے بڑا اور ڈسپلنڈ ادارہ ہے۔ ہر شخص اور ادارہ ایک ایسے ادارے یا شخص کی تقلید کرتا ہے جو قوی اور مضبوط ہو۔ فوج میں کرپشن صرف اوپر کی سطح پر ہے اور یہی طبقہ سب سے نمایاں اور قوت کا سرچشمہ ہے۔ ایک سپاہی سے لے کر اوپر کی سطح کا ماتحت افسر جب اپنے گاؤں، شہر یا گوٹھ میں جاتا ہے تو وہ اپنے جرنیل کی بات کرتا ہے۔ اشکولے سے مند اور خنجراب سے کراچی تک ہر شخص جنرل گل حسن، یحیٰی، شیر بہادر، کلو،

ضرار اور پرویز مشرف کو ان کے کردار کے حوالے سے جبکہ جنرل اکبر، اعظم، موسیٰ، ٹکا، مٹھا، حمید گل اور بابر کو ان کی بہادری، جرأت اور بیبا کی کے حوالے سے جانتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں لوگ ان کی دولت کی وجہ سے جانتے ہیں یا جن کی کوٹھیاں، بنگلے، باغات اور کاروبار مشہور ہیں۔ میں جنرل ایوب اور ضیاء الحق کو علیحدہ رکھونگی چونکہ ان کے عمل اور کردار نے عام آدمی پر ہی نہیں بلکہ پوری قوم کے ذہن پر اثر کیا جس کا خمیازہ قوم کئی نسلوں تک بھگتے گی۔ اگر جرنیل ایک مکان اور ایک پلاٹ پر گزارہ کرنا سیکھ جائیں اور اپنی خود ساختہ مراعات اور عیش و آرام چھوڑ دیں تو ججوں، صحافیوں، سیکریٹریوں اور سیاستدانوں میں جرأت نہیں ہوگی کہ وہ لوٹ مار کا بازار گرم کریں اور من مانیاں کرتے پھریں۔

مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میں نے کہا۔

اگر قومی اسمبلی ایک بل کے ذریعے ہر کسی کے اختیارات اور مراعات کا تعین کر دے تو کسی میں کرپشن کی ہمت نہ ہو۔ اگر آزاد اور خود مختیار عدلیہ کا قیام ہو۔ سیاسی پارٹیاں اور سیاسی لیڈر اپنے چہیتوں کو جج مقرر کرنا چھوڑ دیں تو سارے مسئلے حل ہو جائیں۔

تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ نینا نے کہا۔

ہو کیوں نہیں سکتا؟ میں نے پوچھا۔۔

ہمارے ملک میں دو بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں جو دو خاندان کی ذاتی ملکیت ہیں اور دونوں خاندانوں کے اپنے اپنے خاندانی مسائل ہیں۔ ان کے دوست یار، قبیلہ، برادری، بہی خواہ، جاگیریں، جائیدادیں اور کاروبار ہیں۔ ان کی دوستیاں اور دشمنیاں بھی ہیں جو سیاست کی آبیاری کیلئے اشد ضروری ہیں۔

تم کیا سمجھتے ہو لوگ ووٹ جمہوریت اور جمہوری اقدار کے احترام میں دیتے ہیں۔ نینا نے پوچھا۔

ہاں۔۔۔۔یا۔۔۔۔شاید۔۔۔۔۔۔

موجودہ قائد جمہوریت کا تو یہی فرمان ہے۔ میں نے کہا۔

کونسا قائد جمہوریت؟ نینا نے پوچھا۔

ہمارے ہاں قائد جمہوریت وہی ہوتا ہے جو حکومت کی گاڑی چلاتا ہے۔

اس کا مطلب ہے سکندر مرزا، غلام محمد، ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف

بھی جمہوری قائدین تھے۔ نینا نے برہمی کا اظہار کیا۔

تھوڑی بہت خدمت تو سبھی نے کی ہے۔ غلام محمد اور سکندر مرزا نے ایوب خان بنایا اور ایوب خان نے بنیادی جمہوری نظام متعارف کروایا اور ذوالفقار علی بھٹو بھی بنایا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 73 کا آئین دیا۔ سیاست سے شرافت کا کلچر نکال پھینکا اور جیالہ پن متعارف کروایا۔ فوج میں سیاسی وفاداریوں کی بنیاد رکھی اور سینئر جرنیلوں کو ہٹا کر ضیاء الحق کو سپہ سالار بنایا۔ ضیاء الحق نے بھٹو کو ہٹا کر مسجد سے لے کر مدرسے تک اور پھر کابل سے کراچی تک سب کچھ بدل دیا اور جو کسر رہ گئی تھی اسے پرویز مشرف نے پورا کیا۔ یحییٰ خان نے بھی بہت کچھ کیا۔ الیکشن کروائے اور پھر اسمبلی کا بروقت اجلاس نہ بلا کر بھٹو اور مجیب کو خوش کرنے کے لئے آدھا آدھا پاکستان دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

میں نے تم سے ووٹ کی طاقت سے پروان چڑھنے والی جمہوریت کا پوچھا۔ نینا نے اپنا سوال دھرایا اور پھر خود ہی کہنے لگی۔

کوئی شخص پاکستان میں جمہوریت کے لئے ووٹ نہیں ڈالتا اور نہ ہی اہل پاکستان کو کسی جمہوری نظام کی خواہش ہے۔ دنیا میں ہر شخص کی خواہش ہے کہ اس کے ملک میں ایک ایسی حکومت ہو جو اسے جلد، سستا اور سچا انصاف مہیا کرے۔ کوئی شخص اس کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالے۔ وہ اپنے ملک میں عزت اور آزادی سے جیئے۔ گھومے پھرے، کام کاج کرے اور خوشحالی اور امن کی زندگی جیئے۔ حکمران طبقہ اور نوکر شاہی لوٹ مار اور کرپشن سے قومی خزانہ نہ لوٹے اور اپنی کمائی پر عام لوگوں کی طرح گزارہ کرے۔ پولیس مجرموں کو پکڑے اور مظلوموں کی پگڑیاں نہ اچھالے۔ جج فیصلے کریں اور سیاست اور کرپشن میں ملوث نہ ہوں۔ فوج ملک کی حفاظت کرے اور ملکی اثاثوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ اگر عوام کو یہ سب ایک بادشاہ دے دے تو انہیں اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔

مگر پاکستان جیسے ملک میں یہ ناممکن ہے۔ گلگت اور بلتستان میں ایک انوکھا نظام ہے جو نہ فاٹا ہے نہ پاٹا۔ اس فاٹا اور پاٹا پر میں بعد میں بات کرونگی۔ شمالی علاقوں میں کانا ہے۔ انگریزی میں اسے کشمیر اینڈ نادرن ایریا کہا جاتا ہے۔ مگر اس کی اصل روح اردو کا لفظ کانا ہے۔ یعنی ایک آنکھ والا۔ اگر اردو کے لفظ کانا کے حقیقی معنوں پر غور کیا جائے تو بات بلکل سمجھ میں آجاتی ہے۔ حکومت پاکستان کشمیر اور شمالی علاقہ جات پر ایک آنکھ ہمیشہ بند رکھتی ہے۔ جہاں تک حکومتی اور

پاکستان میں برسراقتدار پارٹی کے مفاد کا تعلق ہو وزارت امور کشمیر و شمالی علاقہ جات کی ایک آنکھ کھلی رہتی ہے اور جب بات عوام کے فلاح و بہبود، عدل و انصاف کی ہو تو آنکھ بند ہو جاتی ہے۔حکومت اپنی مرضی کے افسر، حکمران اور جج لگاتی ہے اور پھر ان افسروں، ججوں اور حکمرانوں کو ظلم و جبر کا پورا اختیار دیکر آنکھ بند کر لیتی ہے۔

تاریخ کے صفحات دیکھو تو کشمیر اور شمالی علاقوں کے ابواب الگ ہیں۔مزید غور کرو تو دونوں خطوں کے اوراق مزید بکھر جاتے ہیں۔مثلاً جموں کی الگ تاریخ ہے اور کشمیر کی الگ، اسی طرح گلگت بلتستان، دیامیر اور کارگل کی داستانیں بھی جدا جدا ہیں۔چلپو، رٹو، استور، گلگت باقائدہ ریاستیں تھیں۔جموں، کشمیر اور کارگل میں بھی بیشمار جاگیریں تھی جو کسی حد تک آزاد تھیں جیسے پونچھ، بھمبھر، مظفر آباد، کرناہ، میرپور اور راجوری وغیرہ۔تاریخ دھراؤ تو ہر جاگیر، ریاست، راجواڑے، پرگنے کی ایک کہانی ہے۔دور حکمرانی کا شجرہ اور عدل و انصاف کی ایک داستان ہے۔تمھیں پتہ ہے تاریخ کیا ہے؟۔نینا نے پوچھا۔

شائد تم بہتر بتا سکو۔میں نے جواب دیا۔

شائد۔۔۔۔۔۔

میرے نزدیک تاریخ کی چار اقسام ہیں پہلی قسم وہ ہے جو لکھی جاتی ہے۔جیسے تزک، بابری، تزک تیموری، تزک جہانگیری وغیرہ۔اپنی تاریخ خود لکھنا ایک مشکل عمل ہے اور بہت کم لکھنے والوں نے جرأت کا مظاہر کرتے ہوئے سچ لکھا ہے۔موجودہ دور میں مجھے سب سے اچھی سوانح یا تاریخ خشونت سنگھ کی سچ، محبت اور تھوڑا سا کینہ لگی ہے۔سکھوں کو خشونت سے سو فیصد اختلاف ہے ویسے خوش تو ہندو اور مسلمان بھی نہیں مگر سکھوں کی نسبت ان کا غصہ کم ہے۔یادوں کی بارات بھی اچھی ہے اور علی پور کے ایلی کا الگ مقام ہے۔

دوسری قسم کی تاریخ وہ ہے جو لکھوائی گئی ہے۔ایوب خان، پرویز مشرف سمیت بہت سے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اپنے کارناموں کو اپنی زندگیوں میں ہی سنہرے اوراق پر لکھوا دیا مگر اس قسم کی تحریروں کو تاریخ نے کبھی اہمیت نہیں دی۔لکھوائی گئی تحریروں میں سب سے عمدہ اور دلنشین تحریر گلبدن بیگم کی ہمایوں نامہ ہے۔جو اس دور کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ادب لطیف ہے۔گلبدن نے اپنی تحریر میں الفاظ کو زبان ہی نہین بلکہ آداب سے بھی سنوارا ہے جو شائد ہی کسی لکھنے والے کا وصف ہو۔

تاریخ کی تیسری قسم سرکاری دستاویزات، شاہی فرامین، سفر نامے، جنگی کارنامے اور حادثات ہیں۔ایسی تحریروں میں لفاظی زیادہ اور حقیقت کم ہوتی ہے۔ ہر لکھنے والے کا اپنا زاویہ نگاہ ہے جس میں ذاتی پسند وناپسند کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔

تاریخ کی چوتھی قسم نصابی کتب پر مشتمل ہے جسے ہر ملک کا محکمہ تعلیم اپنے پسندیدہ قلم کاروں اور تاریخ دانوں کی مالی معاونت کیلئے نصاب میں شامل کرتا ہے۔حکومتی پالیسی کے تابع بہت سے من گھڑت اور تصوراتی واقعات کو تاریخ میں ٹھونسا جاتا ہے اور اصل اور حقیقی واقعات میں سب سے زیادہ کٹوتی کی جاتی ہے چونکہ ایسے واقعات کو چیلنج کرنا مشکل ہوتا ہے۔نصابی تاریخی کتب نے تاریخ کی اہمیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذوق پر حد لگادی ہے۔ایک ہی موضوع پر آپ تاریخ کی دس کتابیں نکالیں ہر صفحے پر دس جگہ تضاد ملے گا۔ مذہبی، روحانی اور دینی موضوعات کی تشریح کی سب سے بہتر جگہیں مسجدیں، مندر، معبد، گرجے، گردوارے، خانقائیں، مزار اور مقبرے ہیں جہاں بیٹھے علماً، سادھوسنت، گرو، پیر، مخدوم، متولی اور خدام بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں اور ہر ایک کی الگ الگ تاویلیں اور تشریحات ہیں۔۔۔ اگر ہم تاریخ کے حوالوں سے سیاسی معاملات کو حل کرنے کی کوشش کریں تو کبھی بھی کسی ایک متفقہ حل پر نہیں پہنچ سکتے۔اگر تاریخی حوالوں سے حل ڈھونڈا جائے تو ایک مضبوط، مستحکم اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ اور ریاست کبھی بھی قائم نہیں ہوسکتا۔تاریخی مطالعے کا مقصد ماضی کے حالات سے سبق سیکھنا، حال کو بہتر بنانا، اور مستقبل کے لئے ایک مضبوط اور مربوط لائحہ عمل تیار کرنا ہے۔تاریخ پہچان کا وسیلہ ہے نہ کہ فتنے فساد اور سیاسی مفاد کا ذریعہ۔ ہماری بدقسمتی کہ پاکستانی سیاستدانوں اور بیوروکریسی نے تاریخ کو دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، حتیٰ کہ عدالتی اور حکومتی تقسیم اور فتنے کا کاروبار بنالیا ہے۔

تاریخ اور تاریخی واقعات سے ووٹ کا کیا تعلق ہے؟ میں نے پوچھا۔

تاریخ اور تاریخی واقعات کا نہیں بلکہ من گھڑت تاریخی حقائق کا ووٹ سے گہرا تعلق ہے۔ بلتستان اور ملحقہ شمالی علاقوں کے عوام کو سیاستدانوں اور بیوروکریسی نے مقامی تاریخ، نسلی برتری اور مذہبی تقسیم میں الجھا کر انہیں ووٹ کے حق سے محروم کردیا۔ **1947**ء سے **1950**ء تک شمالی علاقوں کے عوام نے اہل کشمیر سے مل کر آزادی کی جنگ لڑی اور ڈوگروں کے خلاف بغاوت میں کشمیریوں سے ہم آواز ہوکر آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ڈوگروں سے تو شمالی علاقوں اور

کشمیریوں نے کسی حد تک آزادی حاصل کر لی مگر بھارت اور پاکستان کی سیاسی جنتا اور بیوروکریسی نے ڈوگرہ ریاست کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا اور ایک ہی طرح کا نظام نافذ کر کے ایک ریاست کے چار ٹکڑے کر دیئے۔

بھارتی حکومت نے جموں وکشمیر کو سٹیلائٹ سٹیٹ کا درجہ دیا اور اپنے حواریوں کو جن میں شیخ عبداللہ اور اس کا نیشنل کانفرنسی ٹولہ سرفہرست تھا کو اقتدار سونپ کر وہاں کا کٹھ پتلی حکمران بنا دیا جبکہ لداخ اور کارگل کو بھارت براہ راست اپنے کنٹرول میں لے آیا اور وہاں ڈائیرکٹ رول کا نظام نافذ کر دیا۔ بعد میں بھارتی بیوروکریسی اور سیاسی بازی گروں نے شیخ عبداللہ کو شیر کشمیر کے رتبے سے گھٹاتے گھٹاتے بکری بنا دیا اور پھر بکریوں کے اس ریوڑ سے متفقہ رائے لیکر جموں و کشمیر کی حیثیت کو مزید کم کر کے اسے بھارت کا الگ صوبہ بنایا اور وہاں کانگریس اور بی جے پی سمیت بھارت کی تمام سیاسی پارٹیوں کو اثر و رسوخ کی چھٹی دے کر کشمیریوں کو تاریخی، قبائلی، برادری، مذہبی اور طبقاتی فرقوں اور فتنوں میں الجھا کر ان کے بنیادی حقوق اور آزادی پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بھارتی غلامی کی مہر لگا دی۔

اب دوسری طرف کا سین دیکھیں تو آپ کو ذرہ بھر فرق نظر نہیں آئے گا۔

دوسری طرف سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں نے پوچھا۔

دوسری طرف سے میری مراد آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات ہیں جہاں پاکستانی حکمرانوں نے بھارتی ایکشن کاری پلے کیا۔ مجھے لگتا ہے کشمیر اور شمالی علاقوں کے متعلق دونوں ملکوں کی پالیسی یکساں ہے اور محض سیاسی کاروبار اور سابق ریاست جموں وکشمیر کے عوام کو بیوقوف بنا کر اور انہیں اپنے قابو میں رکھ کر دونوں ممالک کا حکمران طبقہ اپنے ذاتی مفاد حاصل کر رہا ہے۔ تحریک آزادی کشمیر ایک ایسا بزنس ہے جس سے دونوں ملکوں کی بیوروکریسی اور سیاسی کھلاڑیوں کا فائدہ ہے۔ اس کھیل اور کاروبار میں نقصان سابق ریاست جموں وکشمیر کے عوام کا ہے جس سے بھارت اور پاکستان کے حکمرانوں کو کوئی سروکار نہیں۔

بھارت کی طرح پاکستان نے بھی آزاد کشمیر کو ایک باجگزار ریاست کا درجہ دیا اور آزاد کشمیر کے عوام کو برادریوں، قبیلوں اور تاریخ کے جھمبیلوں میں جھکڑ کر انہیں اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیا۔ نیشنل کانفرنس کی طرح مسلم کانفرنس کو آزاد کشمیر میں حکمرانی دی گئی اور آزادی کے لئے مرنے اور مٹنے والوں کو بعد از مرگ مسلم کانفرنسی بنا دیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تحریک آزادی کشمیر ایک

مقامی بغاوت تھی جو ڈوگرہ حکومت اور نظام کے خلاف نفرت کی وجہ سے پروان چڑھی اور ایک خونی تحریک میں بدل گئی۔ مسلم کانفرنس کشمیر کی ایک سیاسی جماعت ضرور تھی جو بعد میں نیشنل کانفرنس کے وجود پذیر ہونے سے دوحصوں میں بٹ گئی مگر یہ کہنا کسی طور پر درست نہیں کہ مسلم کانفرنس یا پھر نیشنل کانفرنس کے کارکنوں نے ہی آزادی کی جنگ لڑی یا پھران دو جماعتوں کا کوئی عسکری شعبہ بھی تھا جسے ڈوگرہ فوج اور بعد میں بھارتی فوج سے ٹکرانے کا مشن دیا گیا۔ آزادی کشمیر پر لکھی جانے والی کتابوں اور دونوں اطراف کی کشمیری قیادت کے بیانات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات قطعی ثابت ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کو مسلح بغاوت میں بدلنے کا سہرا کسی سیاسی لیڈر کے سر نہیں باندھا جاسکتا۔ یہ جنگ علاقائی، مقامی اور منتشر حالات میں لڑی گئی جو اس کی ناکامی کا باعث بنی۔اس جنگ کو ناکام بنانے میں نہرو کی سوچ اور دلیری کے ساتھ ساتھ آزادکشمیر کے سیاستدانوں اور مقامی، عسکری کمانڈروں میں رابطے کا فقدان، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش، لیاقت علی خان اور پاکستان کی اعلیٰ سیاسی اور انتظامی قیادت کی عدم دلچسپی، قبائلیوں کو کشمیر میں جنگ لڑنے کی دعوت اور خودساختہ کشمیری لیڈروں کی ذہنی پسماندگی، علاقائی مفادات کی کشمکش اور تنگ نظری سرفہرست ہیں۔

پاکستانی سیاسی ٹولے اور بیوروکریسی نے آزادکشمیر کے عوام کو گلگت اور بلتستان کے عوام سے دور کرنے کے لئے معاہدہ کراچی کے تحت شمالی علاقوں کو اپنے ڈائیریکٹ کنٹرول میں لے لیا اور اسے مرکزی حکومت کی غلامی میں دے دیا۔ان علاقوں کے عوام کو عدالتی اور انتظامی سہولیات سے محروم کرکے ان سے ووٹ کا حق بھی چھین لیا اور وہاں اپنے نمائندوں کو حکمران بنا کر بٹھا دیا تاکہ حقوق کے لئے اٹھنے والی ہر آواز کو گلے ہی میں دبا دیا جائے۔شمالی علاقے جو ڈوگرہ ریاست کا حصہ تھے اور ڈوگروں سے ہی مقامی لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت جنگ لڑ کر آزاد کروائے تھے۔ جنگ آزادی کے بعد معاہدہ کراچی نے مقامی کمانڈر کرنل حسن مرزا، میجر بابر اور میجر شیر خان کو آزادکشمیر کے لوگوں اور مقامی کمانڈروں سے بے ربط کردیا تاکہ گلگت بلتسان اور آزادکشمیر کے عوام میں کسی قسم کا سیاسی، معاشرتی اور ذہنی رشتہ قائم نہ ہوسکے اور ماضی کی طرح مستقبل میں دونوں خطوں کے لوگ کسی مشترکہ سوچ وعمل پر کوئی لائحہ عمل تیار نہ کرسکیں۔

پاکستانی بیوروکریسی اور سیاسی ٹولے نے شمالی علاقہ جات کے کچھ خاندانوں اور برادریوں سمیت کچھ اشخاص کو نوازنے اور انہیں اپنا ہمنوا بنانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا تاکہ ہر علاقے

میں ایسے لوگ موجود رہیں جو وظیفہ خوری کو آزادی سمجھ کر دوسروں کو بھی مرغوب کرتے رہیں۔ حواری بناؤ سکیم کے تحت کچھ لوگوں کو سرکاری محکموں میں نوکریاں دی گئیں۔صحافیوں کو پلاٹ عطا کئے گے اور کچھ خاندانوں کے بچوں کیلئے میڈیکل کالجوں، کیڈٹ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے آسان بنائے گئے۔ چند لوگوں اور خاندانوں کو نوازنے کے بعد پاکستانی حکمران شمال سے مطمئن ہوگئے اور باقی عوام کو ان کے حال پر چھوڑ کر انہیں پورٹر اور گائیڈ بنکر ملک اور قوم کا نام روشن کرنے کے کام پر لگا دیا۔

آزاد کشمیر کے عوام کی تحلیل نفسی کے لئے پاکستانی حکمرانوں نے سردار ابراہیم خان، مولوی یوسف شاہ اور چوہدری غلام عباس کو باہم دست وگریبان کیا اور ان کی کشمکش کو دشمنی میں بدل کر ان کی قائدانہ اہمیت کو کم کر دیا۔ پاکستانی حکمرانوں نے سردار ابراہیم اور چوہدری غلام عباس کے درمیان خلیج حائل کر کے مجاہد اوّل کو مسلم کانفرنس کی صدارت اور جناب کے ایچ خورشید کو حکومت سونپ کر ان سے شیخ عبداللہ جیسی توقعات وابستہ کر لیں جو ناکام ثابت ہوئیں۔ کے ایچ خورشید اور سردار ابراہیم کے خون میں خود غرضی، لالچ، ضمیر فروشی، برادری ازم، علاقائی تنگ نظری، کرپشن اور ہوس اقتدار سمیت کوئی ایسا مادہ نہ تھا جو پاکستانی بیوروکریسی اور حکمران ٹولے کے لئے کارآمد ثابت ہوتا۔ سردار ابراہیم اور کے ایچ خورشید سے مایوس ہوکر حکمران ٹولے کی لسٹ پر موجود مجاہد اول ہر موسم اور وقت کے لئے موزوں شخصیت ثابت ہوئے اور تھوڑی بہت ترامیم کے ساتھ انہیں تاحیات اور ہر طرح کے اقتدار کے ساتھ نبھا کرنے کے لئے موزوں اور مثبت پایا گیا۔ مجاہد اوّل اور ان کے فرزند اوّل اور عقل کل میں شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان والی ساری خوبیاں موجود ہیں جس سے دونوں ملکوں کی کشمیر پالیسی اور آزادی بزنس سو فیصد کامیاب اور منافع بخش جا رہا ہے۔

پاکستانی حکمران ٹولے نے تاریخی، علاقائی، برادری اور قبیلائی ہتھیاروں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے آزاد کشمیر میں ایک سوچ کو جنم دیا جس کے تحت لوگوں کو باور کروایا گیا کہ کشمیر کی آزادی کی جنگ صرف پونچھ کے لوگوں اور سدھن قبیلے نے لڑی اور اسی قبیلے کے افراد کو سرکاری نوکریوں اور حکمرانی کا حق ہے۔ اس سوچ نے نفسیاتی برتری کا روپ دھار لیا اور پونچھ ہی میں بسنے والے دیگر قبائل اور برادریوں پر سدھن قبیلے کو فوقیت دلا کر نفرت کے خلیج کو مزید گہرا کر دیا تا کہ میر پور، مظفر آباد اور پونچھ کے عوام ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو کر اپنے اصل مقصد اور

مشن کو بھول جائیں۔ پاکستانی سیاسی قیادت اور بیوروکریسی نے ہر قبیلے اور برادری میں اپنے سیاسی ایجنٹ تلاش کئے اور ان ایجنٹوں کو تحریک آزادی کشمیر کا ہیرو بنا کر ان کے ذریعے آزاد کشمیر میں ایک ایسا نظام حکومت رائج کیا جو سراسر استحصالی اور ظالمانہ ہتھکنڈوں پر مبنی خود فریبی کا ایسا جال ہے جسے آزاد کشمیر کے عوام آزادی تصور کیئے غلامانہ زندگی جی رہے ہیں۔ آزاد کشمیر کا ایک عبوری آئین ہے جسے آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت اور عوام کے حمایت یافتہ نمائندوں نے نہیں بلکہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے ایک معتمد خاص اور بھٹو حکومت کے وزیر حفیظ پیرزادہ نے تحریر کیا اور آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی نے بھٹو مرحوم کے حکم پر آنکھیں بند کر کے اس عبوری آئین پر متفقہ ہاں کر دی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق آزاد کشمیر کا عبوری آئین اس خطہ کے عوام کی بنیادی ضروریات اور حقوق کا محافظ نہیں بلکہ ایک ایسا کنفیوژن ہے جسے حل کرنے کیلئے ایک اور آئین کی ضرورت ہے۔ ساٹھ صفحات پر مشتمل یہ دستاویز بہت سے ایسے معاملات پر مکمل خاموش ہے جن کا تعلق آزاد کشمیر نامی اس خطہ کے عوام کے بنیادی حقوق اور آزادی سے ہے۔

1974ء کا عبوری آئین ایک ایسی دستاویز ہے جس کے تحت آزاد کشمیر کے عوام کو کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر کی غلامی میں دے دیا گیا۔ آزاد کشمیر کی سیاسی جنتا اس امر پر خوش ہے کہ ان کے کچھ دوستوں اور کھابہ خوروں کو کشمیر کونسل کی ممبری مل جاتی ہے اور ایک یا دو کو وزیراعظم پاکستان کا مشیر لگوا کر ان کی بدماشانہ شان میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ کشمیر کونسل کی ممبر شپ ایک سیاسی ٹینڈر کے ذریعے نیلام کی جاتی ہے اور جو ممبر زیادہ اور بہتر بولی دے اسے آزاد جموں کشمیر کونسل کا ممبر بنا دیا جاتا ہے۔ پاکستانی سیاسی پارٹیوں سے وابستگی، برادری اور قبیلے کے علاوہ پاکستانی سیاسی قائدین اور ان کے عزیز و اقارب کی مٹھی گرم کرنے سے آزاد جموں کشمیر کونسل کی ممبری، مشاورت یا وزارت تو کیا کشمیر کی بادشاہت اور شہنشاہت بھی مل سکتی ہے۔ آزاد کشمیر کے آئین کے مطابق اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کشمیر کونسل کے ذریعے پاکستان کا چیف ایگزیکٹو کرتا ہے۔ اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی تقرری معمولی بات نہیں چونکہ ان کے ہاتھوں میں عوام کی تقدیر کا کھیل ہوتا ہے۔ اگر اعلیٰ ترین عدالتوں کے جج برادری کے چندے اور سیاسی جماعتوں کی آشیرباد سے منصب بردار ہوں تو ایسی عدالتوں اور ججوں سے بے لوث اور سچا انصاف ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کا قائم مقام وزیراعظم پاکستان میں کسی کو نہ تو اعلیٰ عہدے پر فائز کر سکتا ہے اور نہ ہی ہٹا سکتا ہے مگر بارہا مشاہدے میں

آیا ہے کہ قائم مقام وزیراعظموں نے آزاد کشمیر کی اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کا تقرر کیا جسے کسی بھی عدالت میں چیلنج کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔

جرأت کیسے ہو۔ یہ سب ملی بھگت ،دوستی یاری اور برادری کے مفاد کیلئے ہی تو ہوتا ہے اور برادری والوں کی منشاء ومرضی ہی میں عدالتوں کی مرضی ہوتی ہے۔آزادکشمیر میں کچھ جج صاحبان اپنی ذات میں ہی قانون اور آئین ہیں۔آزادکشمیر کی ایک عدالت میں ایک کرپٹ پٹواری اور نائب تحصیلدار کا مقدمہ اینٹی کرپشن والوں نے پیش کیا تو جج صاحب اپنی برادری کے دو کرپٹ اہلکاروں کو سزا دینے کے بجائے شکائت کنندہ کے بھائی پر برس پڑے اور بھری عدالت میں شکایت کنندہ کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔اس پر بھی جج صاحب کا برادری ازم کے زہر سے بھرا دل ودماغ ٹھنڈا نہ ہوا تو گالی گلوچ پر اتر آئے اور مقدمہ خارج کردیا۔

کیا جج ایسی حرکت کرسکتا ہے۔کیا یہ توہین عدالت نہیں۔میں نے پوچھا۔

شائد کسی اور جگہ ہومگر آزادکشمیر میں نہیں۔یہ آزاد خطہ ہے اور راجوں مہاراجوں سے موجودہ حکمرانوں کو منتقل ہوا ہے۔

مگر نینا۔

مگر کیا۔نینا بولی۔

دیکھو یہ تاریخ کا تسلسل ہے اور انسان کے اجتماعی شعور کی بیداری کا تقاضہ ہے کہ وہ جابرانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائے اور اپنی زندگی کو آزادی اور آسودگی سے سنوارنے کے مواقع پیدا کرے۔اسی اجتماعی شعور اور تاریخی تسلسل کا ایک جز غلامانہ زندگی سے نجات اور آزادی کا سنہرا خواب ہے جس کی تعبیر ایک آزاد ریاست اور باشعور معاشرے کا قیام ہے جہاں انسانوں کو ان کی خواہشات کے احترام میں ایک ایسا نظام حکومت میسر ہو جس میں ان کے حقوق اور آزادی کو ایک قانون و آئین کے تابع ترقی اور خوشحالی سے جینے کا حق ہو۔ایک آزاد ریاست اور معاشرے کی بقا کیلئے جہاں قانون کا احترام ضروری ہے وہی ان قوانین کی تشریح اور نفاذ کیلئے آزاد اور خودمختار عدلیہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔آزاد عدالتی نظام کے بغیر آزاد ریاست اور معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور شائد میری بات کو سمجھ نہیں رہے۔تم سیاسی اصطلاحات کی تشریح میں الجھ گئے ہو یا پھر مجھے الجھا رہے ہو۔دیکھو جو قوم جس آقا سے آزادی حاصل کرتی ہے یا اسے کسی

حادثے کی صورت میں آزادی مل جاتی ہے وہ اپنے آقا کے سٹائل کو ہی اپناتی ہے۔ برصغیر کے لوگوں کو دوسری جنگ عظیم کی تباہی کے نتیجے میں جو آزادی ملی وہ آج بھی برطانیہ کی غلامی سے منسلک ہے۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے لوگ آج بھی برطانوی غلامی پر فخر کرتے ہیں اوران کے دیئے ہوئے نظام پر چلنے میں ہی بہتری سمجھتے ہیں۔ ڈیڑھ ارب لوگوں کے ان تین ممالک میں کچھ بھی نہیں بدلا بلکہ جو بدلا ہے وہ خرابی اور رسوائی کا باعث بنا ہے۔یہی حال آزاد کشمیر کا ہے۔ جولوگ وہاں کے حکمران ہیں ان کا پیشہ سیاست نہیں بلکہ آزادی برنس ہے۔ جو برادری زیادہ پیسہ لگاتی ہے وہ پانچ سال کیلئے حکومت اور عدالت خرید لیتی ہے جس کی خاموش نیلامی اسلام آباد میں ہوتی ہے۔ اگر جج میرٹ پر تعینات ہوں اور عدالتیں آزاد ہوں تو ان کا طریقہ کار بھی شفاف ہو۔جس خطہ کی حکومت ہی شفاف نہ ہو وہاں کسی اور ادارے کا شفاف ہونا مشکل ہے۔اگر پاکستان کا قائم مقام وزیراعظم اپنے ملک میں چپڑاسی بھی بھرتی نہیں کرسکتا تو اسے کیا اختیار ہے کہ وہ آزادکشمیر کے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج تعینات کردے۔ جہاں اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کا یہ حال ہو وہاں ماتحت عدلیہ سے انصاف کی توقع لنڈا گڈ مین کے سیاسی فلسفے کی تعبیر ہی ہوسکتی ہے۔آزادکشمیر نامی خطہ بھی تقسیم ہند کی کوکھ سے جنم لینے والے ایک حادثے کا نتیجہ ہے جسے کچھ لوگوں نے اپنی عیش وعشرت کا اڈا بنا کر اسے آزادی کے بیس کیمپ کا نام دے دیا۔ یہاں عیاش اور بدکردار سیاسی چالباز اپنی کرپٹ کمائی سے پاکستانی سیاسی پارٹیوں سے حکومت، عہدے اور عدالتیں خریدتے ہیں اور پھر اپنی مرضی کے مطابق حکومت اور نام نہاد جمہوریت کی آڑ میں لوٹ مار کرتے ہیں۔ پھران کے زرخرید جج ان کی کرپشن کو جائز اور حلال قرار دے کر اپنا حصہ وصول کرلیتے ہیں۔آزادکشمیر کے عدالتی نظام میں ایسے بھی فیصلے موجود ہیں کہ جج صاحبان نے فرضی اور جعلی پلاٹوں کی آلاٹمنٹ پر بھی جعلسازوں اور چوروں کے حق میں فیصلہ دیکر انہیں کروڑوں کا فائدہ پہنچایا۔بجلی چوروں اور کنڈہ مافیا کو بھی باعزت بری کیا اور محکمہ برقیات کو کروڑوں کا نقصان پہنچایا۔آزادکشمیر کے عدالتی نظام میں ایسا بھی ہوا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے ایک زانی اور زانیہ کو گناہ ثابت ہونے کے باوجود ضمانت پر چھوڑ دیا اور بعد میں اسی عدالت کے جج صاحب نے اسے غلط اور خلاف قانون قرار دے کر انہیں پھر پابند سلاسل کیا مگر فیصلہ دینے والے جج صاحب میں اخلاقی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے عہدے سے ہٹ جاتے جب تک خدا نے انہیں نہیں ہٹایا۔جس خطہ میں اعلیٰ ترین عدالتوں کا یہ حال ہو کہ وہ برادری، سیاسی

وابستگی، دوستی یاری اور رشتہ داری کو آئین اور قانون پر فوقیت دیں اور قرآن وسنت کا بھی احترام نہ کریں وہاں عدالت میں بیٹھ کر کسی کو گالی دینا ایک معمولی بات ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔

نینا تمہاری بات سن کر مجھے دکھ بھی ہوا اور شرمندگی بھی ہے چونکہ تم میری دھرتی اور میرے وطن کی بات کر رہی ہو۔ میں نے حال ہی میں جناب جسٹس سید منظور حسین گیلانی کی تصنیف "ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان آزاد کشمیر" اور ایک چیف جسٹس کی سوانح حیات "انصاف کا سفر" پڑھی ہیں۔ جسٹس سید منظور گیلانی کی تصنیف کا تعلق عدل کے شعبے میں کچھ تبدیلیوں کے علاوہ عدالتی نظام کی تشریحات سے ہے جبکہ چیف جسٹس کی سوانح حیات سے تو پتہ چلتا ہے کہ آزاد کشمیر میں خلفائے راشدین کا دور لوٹ آیا ہے۔ ہر طرف امن ہے اور ہر شخص کو انصاف اس کی دہلیز پر میسر ہے۔ مصنف ڈاکٹر افتخار مغل نے جسٹس آزاد کشمیر کو فاروق ثانی کے روپ میں پیش کیا ہے جو صرف قرآن وحادیث نبوی ﷺ کی روشنی ہی میں فیصلے کرتے۔

دیکھو نینا تم بغض کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے دوستی کی آڑ میں ڈوگروں یا پھر سکھوں کے عہد کو موجودہ آزاد کشمیر کی آزاد اسلامی اور جمہوری حکومت کے حوالے سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں ہو اگر ایسا نہیں تو ڈاکٹر افتخار مغل ایک چاپلوس، خوشامدی، لالچی اور بددیانت قلمکار ہیں جنہوں نے ایک ایسے شخص کو فاروق ثانی ثابت کرنے کی کوشش کی جو کبھی اس کا اہل نہیں تھا۔

تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔ نینا نے کہا۔

مجھے تمہارے دکھ اور افسوس کی پرواہ نہیں مگر شرمندگی مجھے بھی ہے چونکہ میں بھی پاکستانی ہوں۔ میں نے بہت سے حکومتی ادوار دیکھے ہیں۔ بہت سے لیڈروں، حکمرانوں، ججوں، جرنیلوں، چند علماء اور صحافیوں سے ملی ہوں۔ میرا تعلق تحقیق کی دنیا سے ہے اور میں مٹی سے پیدا ہونے والی اجناس کی پہچان رکھتی ہوں اور انسان بھی مٹی کی پیداوار ہے۔

ہاں میں تمہاری طرح مصلحت پسند نہیں مگر وطن پرست ضرور ہوں۔ میں کھلے دل اور ذہن کی مالک ہوں اور واقعات اور حالات کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ افتخار مغل نے چاپلوسی کی انتہا کی اور ایک ایسے شخص کی سوانح حیات تحریر کی جو ایک ریاست کا سب سے بڑا منصف اور قاضی تھا۔ بدقسمتی یہ بھی ہے کہ اس تحریر کے لکھوانے اور شائع کروانے میں جسٹس چوہدری کی رضا ورغبت بھی شامل تھی اور ایک ایسے ہم خیال گروپ کی پبلسٹی کا ذریعہ

بھی ہے جو چیف جسٹس کی آڑ میں اپنا قد اونچا کرنا چاہتا تھا۔ چیف جسٹس آف آزاد کشمیر کی سوانح حیات ان کے کردار وعمل سے مطابقت نہیں رکھتی۔ جب تک کوئی شخص کسی عہدے یا رتبے پر فائیز ہواسے اپنی خوبیاں بیان کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے چونکہ عدالت ایک مقدس جگہ ہے جہاں بیٹھے جج صاحبان کو ہر وقت اپنے ربّ، ضمیر اور عوام کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔عوام کی آواز پر تو توہین عدالت کا کفل لگا کر قانون کی تلوار سے گلا کاٹا جا سکتا ہے مگر ضمیر کی ملامت اور اللہ کے عذاب سے بچنا مشکل ہے۔لگتا ہے کہ : ۔جسٹس چوہدری نے جنرل مشرف کی تقلید کی جس نے اپنی سوانح لکھوا کر بے وقت اپنی تذلیل کروائی۔ جنرل مشرف کی سوانح لکھنے والوں نے بہت سی ایسی باتیں لکھیں جو پرویز مشرف کیلئے وبال جان بن گئیں۔

کیا جنرل پرویز مشرف اور ایک جج میں کچھ فرق نہیں۔ میں نے پوچھا۔

بلکل فرق ہے اور میں یہی بات کہنے والی تھی۔ جنرل پرویز مشرف نے اپنی سوانح میں اپنی بیشمار خامیاں بیان کی ہیں جو کہ سوانح نگاری کا تقاضا بھی ہے۔ گو کہ سوانح نگار نے اسے جنرل کی خوبیوں اور بہادریوں میں شمار کیا ہے مگر درحقیقت وہ ایسی غلطیاں ہیں جسے قوم معاف نہیں کر سکتی۔

مثلاً۔ میں نے کہا۔

کارگل ہی کو لے لو۔ ساری فوج کو اور خاص کر ان افسروں اور جوانوں کو پتہ ہے کہ یہ ایک پرانا منصوبہ تھا جو جنرل عزیز اور جنرل جاوید حسن کے ذہن کی اختراع تھی۔ جنرل عزیز جب شمالی علاقہ میں بریگیڈ کمانڈر تھے تو انہوں نے سرینگر کارگل روڈ پر بھارتی سپلائی لائن پر کاروائی کا منصوبہ بنایا جو منصوبے کے لحاظ سے تو اہم اور قابل عمل تھا مگر بھارتی ردعمل کی صورت میں بڑی جنگ میں تبدیل ہوسکتا تھا۔ جنرل عزیز نے ان دنوں اپنے سیکٹر میں بہت کام کیا اور دفاع کو مضبوط بنانے میں کوئی کسی نہ چھوڑی۔ جنرل عزیز کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے اور بحثیت سولجر اور کمانڈر وہ ان تمام خوبیوں کا مالک ہے جو ایک اچھے سپاہی اور جنرل میں ہونی چاہیے۔ جنرل عزیز نے بھاری توپخانہ آگے لایا تا کہ وہ دشمن کو اپنی زد میں رکھ سکے۔ اس سے پہلے اس علاقہ میں صرف فیلڈ آرٹلری تھی جو اونچے پہاڑوں کے پار اور دور تک دشمن کو نشانہ نہیں بنا سکتی تھی۔ جنرل عزیز کی ان کاوشوں نے بھارتی توپخانے اور ایوی ایشن کی برتری ختم کردی اور پاکستانی توپخانے کی فائیرنگ سے بہت سے بھارتی ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے جبکہ دشمن کی سپلائی لائن

بھی پاکستان آرٹلری کی زد میں آ گئی۔ پاکستان آرٹلری کی موثر کاروائی نے بھارتی آرٹلری کو اپنی پوزیشن تبدیل کرنے پر مجبور کیا اور وہ کئی مقامات سے پیچھے ہٹ گئی۔ جنرل عزیز کا منصوبہ قابل عمل تو تھا مگر حکومت اور فوج اسے کسی بھی صورت افورڈ نہیں کرسکتی تھی اس لئے یہ منصوبہ فائلوں میں ہی دب گیا۔ بریگیڈیئر عزیز نے اپنے سیکٹر کی حد تک تو اچھا کام کیا مگر سرحد پار انہیں جوہر دکھانے کا موقع میسر نہ آیا۔

جنرل عزیز کی طرح جنرل جاوید حسن جب آزاد کشمیر میں بحیثیت کمانڈنگ آفیسر تعینات تھے تو انہوں نے بھی ایک منصوبہ اپنے بریگیڈ کمانڈر کو پیش کیا جسے بریگیڈ کمانڈر نے قبول کرلیا مگر جنرل جاوید حسن کے اس منصوبے کو عمل جامہ پہنانے کیلئے ایک دوسری یونٹ کو نامزد کردیا گیا۔ یونٹ کمانڈر نے اس منصوبے کو ناقابل عمل اور بے مقصد قرار دیکر مسترد کردیا چونکہ اس سے فائدے کے بجائے نقصان کا زیادہ احتمال تھا۔ اس منصوبے میں جس جگہ پر قبضہ کرنا مقصود تھا وہ ویسے بھی دونوں اطراف کی زد میں تھی اور اس جگہ پر قبضہ کی صورت میں محض اپنی پوزیشن دشمن کے سامنے لانا اور ہر وقت دشمن کے فائیز کی زد میں رہنا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کے دلائل نے بریگیڈ کمانڈر پر کچھ اثر نہ کیا چونکہ بریگیڈ کمانڈر جاوید حسن کی مکمل گرفت میں تھا اور اس فضول کاروائی پر حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔ آخر کار کمانڈنگ آفیسر کو چھٹی پر بھیج کر سیکنڈ ان کمانڈ سے یہ کاروائی کروائی گئی اور بے شمار قیمتی جانوں کو ایک بے مقصد کاروائی پر نثار کردیا گیا۔ اس واقعہ سے بھی فوج کے افسر اور جوان بخوبی واقف ہیں جس کی وجہ سے جنرل جاوید حسن کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

میرا ان واقعات کا ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جنرل مشرف ایک جذبات کی رو میں بہہ جانے والا عاشق مزاج کھلنڈرا ہے جسے بہت سی باتوں کی پرواہ نہیں اور نہ ہی وہ اپنی کاروائی میں کامیابی کے عنصر پر نظر رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پرویز مشرف کی نفسیاتی کیفیت سے جنرل عزیز اور جنرل جاوید حسن نے فائدہ اٹھانے کی ناکام کوشش کی اور پرویز مشرف کے کھلنڈرے پن کو کمانڈوازم اور بہادری کا غلاف پہنا کر کارگل جیسا سانحہ رونما کردیا۔ اس سانحہ سے جہاں سینکڑوں افسروں اور جوانوں کی جانیں گئیں وہی ملک کے سیاسی حالات بھی دگردوں ہوگئے جبکہ خارجہ پالیسی اور خاص کر کشمیر کاز کو سخت دھچکا لگا۔ پرویز مشرف نے اس واقعہ کو اپنی سوانح حیات میں اہم جگہ دے کر فوج میں اپنے خلاف نفرت کا جذبہ پروان چڑھایا۔ جنرل

پرویز مشرف جتنا غیر مقبول اور نفرت انگیز شخص کبھی فوج کی کمان کے قابل نہ تھا مگر شریف برادران نے اپنے تکبر اور سب کچھ روند ڈالنے والے رویئے کے تحت ایک ایسے شخص سے ملک برباد کروایا جسے اپنی ذات اور نمود و نمائش سے آگے سوچنے کی ہمت اور صلاحیت ہی نہیں۔

پرویز مشرف کی سوانح حیات اس کی زندگی بھر کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی داستان اور جرائم کا اعتراف ہے جو اسے دوسری کسی بھی سوانح سے الگ کرتی ہے۔ سوانح نگاری، قصہ گوئی اور داستان گوئی ادب کی الگ الگ اصناف ہیں جیسے ناول اور افسانہ۔" انصاف کا سفر" پڑھ کر پاکستان کے تعلیمی نظام اور معیار کی بھی پرکھ ہوئی ہے کہ بازار سے خریدے گئے مقالہ جات، تحقیقی مواد اور تجزیات پر ملنے والی ڈگریوں اور اسناد کے حامل ڈاکٹروں، پروفیسروں اور استادوں کی ذہنی سطح اور معیار کیا ہے۔ میں پاکستان میں درجن بھر ایسے لوگوں کو جانتی ہوں۔ جو مختلف مضامین پھر مقالہ جات اور تحقیقی مواد پیسہ لیکر لکھتے ہیں اور تین سے پانچ لاکھ معاوضہ لیتے ہیں۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مختلف ریٹس ہیں اسی طرح سائنس اور آرٹس کے علیحدہ اور انگریزی اور اردو مضامین کے الگ الگ ریٹس ہیں۔ مقالے اور مضامین لکھنا اور بیچنا ایک کاروبار ہے جو یونیورسٹی پروفیسروں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی کرتے ہیں جنہیں خاص خاص مضامین پر دسترس حاصل ہے۔ بازاری اور تحقیقی علم کا ذائقہ اور رنگ کبھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتا ورنہ شیکسپئر، اقبالؒ، سعدیؒ، حافظؒ، خیام اور فردوسی جیسے علماء کے نام تاریخ میں ادب کی سچائی کی مثال نہ بنتے۔ علوم کی طرح علماء بھی دو طرح کے ہیں۔ پہلے عارف اور دوسرے عالم۔ عالم علم کا درس دیتا ہے اور عارف توجہ سے قلب منور کرتا ہے۔ جب طالب کا قلب روشن ہو تو علم کی روشنی خود ہی جذب کر لیتا ہے اگر میں ایسے عالموں اور عارفوں کا ذکر چھیڑ دوں تو شائد میری زندگی ہی بیت جائے اور میں کسی ایک کے علم و حکمت کا بیان مکمل نہ کرسکوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ ڈاکٹر افتخار مغل کس طرح کے عالم ہیں اور علم کو کس کسوٹی پر پرکھتے ہیں مگر ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ استاد سے زیادہ انہیں شاہ کا دربان بننا اچھا لگتا ہے۔۔

مگر نینا مغلوں کی تاریخ تو شاہوں کی ہے دربانوں کی نہیں۔ میں نے سوال کیا۔

مجھے خود بھی حیرت ہے نینا بولی!

میں ایک ایسی خاتون کو جانتی ہوں جو علم القلوب سے واقف ہے۔ ان کے مطابق جسٹس صاحب بنیادی طور پر اچھے آدمی ہیں مگر اپنے سیاسی دوستوں، رشتہ داروں اور برادری والوں کے

ہاتھوں مجبور بھی ہیں۔ جو کچھ وہ اپنے متعلق لکھواتے ہیں یہ ان کی خواہش ہے عمل نہیں۔ وہ اپنی خواہشات کا اظہار تو کرتے ہیں مگر عمل سے پہلے برادری اور رشتہ دار آڑھے آجاتے ہیں۔ اس نیک بخت عالمہ کے مطابق جسٹس صاحب اندھیرے اور روشنی کے درمیان کھڑے ہیں مگر فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کدھر جائیں۔ ایک دوسری مثال دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ:

جسٹس صاحب کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کے دونوں ہاتھوں میں گرینڈ تھمادے جائیں اور ان کی سیفٹی پن نکال لی جائے۔ وہ نہ انہیں پھینک سکتا ہے اور نہ ہی زیادہ دیر تک مٹھیاں بند رکھ سکتا ہے۔

اس کا حل کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔

اس کا حل یہ ہے کہ کسی سے مدد لیکر سیفٹی پن دوبارہ لگا دیئے جائیں اور شر سے نجات حاصل کی جائے۔ گرینڈ پھینکنے سے جہاں خود زخمی ہونے کا احتمال ہے وہی دوسروں کو بھی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ جو شخص اپنی ذات کے متعلق فیصلہ نہ کر سکے وہ عدل نہیں کر سکتا چاہئے وہ اسے عمر ثانی کہیں یا شہنشاہ جہانگیر۔ ایک جج کو اپنی تعریف میں کتابیں اور مضامین لکھوانے سے پہلے سوچنا چاہتے کہ ایسی تحریریں پبلک پراپرٹی ہوتی ہیں۔ لوگ ان پر تبصرے اور تنقید کا حق رکھتے ہیں جس سے عدل اور عدالت کی توہین کا پہلو بھی نکلتا ہے جو صاحب کتاب کے سر ہے اور ایک جج کے شایان شان نہیں۔ میں نے اس کتاب کا سہرا سجانے والی شاعرہ حجاب عباسی سے رابطہ کیا تو وہ بھی پریشان تھیں۔ حجاب عباسی نے بتایا کہ ڈاکٹر مغل نے مجھے چیٹ کیا ہے۔ جو مسودہ بلکہ مسودے کا کچھ حصہ مجھے دیا گیا تھا وہ کتاب میں شامل نہیں اور نہ ہی اب تک مجھے کتاب ملی ہے۔ میں بار ہا ڈاکٹر افتخار مغل سے رابطہ کر چکی ہوں مگر وہ حیل و حجت سے کام لے رہے ہیں۔ علمی وادبی اخلاقیات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ مجھے سب سے پہلے کتاب کی کاپی بھجواتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ محترمہ حجاب عباسی نے کہا کہ مجھے آزاد کشمیر بھر سے سینکڑوں ٹیلیفون آچکے ہیں اور لوگوں نے میرے دیباچہ پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ کوٹلی سے ایک ماں نے بتایا کہ جناب چیف جسٹس کے قریبی رشتہ دار کس طرح آزاد کشمیر کے عدالتی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کر کے غریب اور بے سہارا لوگوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس بوڑھی اور بیمار ماں کا بیٹا سات سال سے جیل میں بند رہا اور کوئی جج اس کی ضمانت لینے کو تیار نہیں تھا۔ وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ جسٹس چوہدری کے رشتہ داروں اور برادری والوں نے اس کے بیٹے پر ایک

ایسے شخص کو فائیر کر کے زخمی کرنے کا الزام ہے جس کے پاس کوئی مستند میڈیکل رپورٹ نہیں اور نہ ہی وہ کسی ہسپتال میں داخل ہوا۔ نہ اس کے جسم سے کوئی گولی برآمد ہوئی اور نہ ہی اسے کسی جگہ سے علاج کے بعد ڈسچارج کیا گیا۔ جس ڈاکٹر سے جعلی رپورٹ لے کر مقدمہ درج کیا گیا اس کے مطابق مضروب کا پھیپھڑا ناکارہ ہو چکا تھا مگر اسے ہسپتال میں داخل نہ کیا گیا بلکہ دوسری جگہ ریفر کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے مضروب کو جس ہسپتال میں ریفر کیا مضروب وہاں بھی نہ گیا اور نہ ہی وہاں سے علاج کا کوئی ثبوت عدالت میں پیش کر سکا۔

بیمار اور لاچار ماں نے بتایا کہ اگر میرے بیٹے پر جرم ثابت بھی ہوتا تو اسے زیادہ سے زیادہ سات سال سزا ملنی تھی مگر وہ سات سالوں سے انصاف کی آس لگائے جیل میں پڑا رہا چونکہ دوسری طرف جج کے رشتہ دار تھے جن کے اشارہ ابروں پر عدل کی زنجیر ہلتی تھی۔ حجاب عباسی نے بتایا کہ اس کتاب کا دیباچہ میرے لئے وبال جان بن گیا ہے اگر میں آزاد کشمیر میں ہونے والے ظلم اور ناانصافی پر کتاب لکھنا شروع کروں تو وہ کئی جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ آزاد کشمیر کے ایک گاؤں کے لوگوں نے مجھ سے رابطہ کیا جو میرے لئے ذہنی اذیت کا باعث بنا۔ آزاد کشمیر کے اس قصبے میں ایک بوڑھے شخص نے اپنی استعداد کے مطابق ایک قرآن لائبریری بنائی جو اس کے چھوٹے سے میڈیکل سٹور کے ایک حصہ میں تھی۔ اس لائبریری میں روحانی علوم پر لکھی گئی کئی نادر کتابوں کے علاوہ قرآن پاک کی مختلف تفسیروں کے کئی درجن نسخے رکھے تھے تاکہ بازار میں گھومنے پھرنے والے اور ہوٹلوں پر بیٹھ کر وقت ضائع کرنے والے نوجوانوں کو قرآن فہمی کی تعلیم دی جائے۔ جسٹس چوہدری کے رشتہ داروں نے ایک جھگڑے کی آڑ میں مخالف برادری کی دکانوں کو نذر آتش کیا اور ساتھ ہی یہ لائبریری بھی جلا دی۔ جسٹس چوہدری نے اپنی تقریروں میں بارہا کہا کہ وہ ہر فیصلے سے پہلے قرآن سے رہنمائی اور اولیاء کرام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے والا اور اولیاؑ کرام کی روحانی تعلیمات کا حامل جج یہ جانتے ہوئے بھی اپنے رشتہ داروں اور برادری والوں کے سامنے بے بس رہا اور قرآن جلانے والوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے عدالت سے رخصت ہو گیا۔ اسی گاؤں کی مسجد مخالف برادری والوں کے لئے ممنوع قرار دی گئی اور انہیں گاؤں کی مرکزی جامع مسجد میں نماز اور عیدین پڑھنے کی اجازت نہیں۔ اگر بھول کر کوئی مرکزی جامعہ مسجد میں نماز جمعہ یا پھر عید پڑھنے چلا جائے تو اس پر ظالمانہ تشدد کیا جاتا ہے۔

جسٹس چوہدری کے عزیزوں نے کارگل کی جنگ میں شہید ہونے والے ایک فوجی افسر کی قبر کی بارہا بے حرمتی کی اور شہید کی تصویر کو جانور کے گلے میں ڈال کر بازار میں چکر لگواتے اور میڈیا والوں کو اس جلوس کی تصاویر لینے اور خبر شائع کرنے سے منع کر دیا جاتا۔ شہید کی بے حرمتی کے متعلق صدر آزاد کشمیر جنرل انور خان کو درخواست دی گئی تو پاک فوج کے اس مائیہ ناز جرنیل اور سدھن قبیلے کی سرداری کے دعویدار نے درخواست کا تمسخر اڑایا اور یہ کہہ کر درخواست پھینک دی کہ شہید تو صرف پونچھ کے ہوتے ہیں باقی سب ڈرامہ ہے۔ جنرل انور نے حیرت سے اپنے رفقاء اور دوستوں سے پوچھا کہ اس افسر کی قبر اب تک وہاں کیوں موجود ہے۔ اسے کسی دوسری جگہ شفٹ کیوں نہیں کرتے تا کہ اس جگہ میرے دوست چوہدری صاحب کا پٹرول پمپ اور پلازہ تعمیر کیا جائے۔ جنرل انور نے محترمہ فردوس عاشق اعوان کی موجودگی میں ایس ایس پی کوٹلی کو ہدایات دیں کہ وہ اس افسر کا جسد خاکی پولیس فورس کی موجودگی میں کسی دوسرے قبرستان میں منتقل کر دے چونکہ میں اس کے عزیزوں کی درخواستوں سے تنگ آ گیا ہوں۔

جنرل انور اور ایک نو دولتیے سیاست دان کے قریبی تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جنرل موصوف کے بیرون ملک دوروں کی تفصیل دیکھیں تو یہ بات بلکل عیاں ہے کہ اس نو دولتیئے گروپ کے کچھ خاص خاص لوگوں نے جنرل انور پر کس طرح ڈالر اور پاؤنڈ پانی کی طرح بہائے۔ جنرل انور جیسے فوجی نے شائد زندگی میں تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ انہیں یورپ اور امریکہ میں زر و جواہر سے تولا جائے گا اور انہیں ان سفید فام ملکوں میں بادشاہوں والی مادی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ جنرل موصوف کا ہر بیرونی دورہ مغل بادشاہوں کی یاد دلاتا اور ان کے تکبر کے اثاثے میں اضافہ کرتا۔ جنرل انور نے بھی احسان فراموشی نہیں کی اور جن جن لوگوں نے ان کی خدمت کی اس کا صلہ ان کی توقع سے بڑھ کر دیا۔ انصاف کے سفر میں بھی مصنف نے کئی بار جنرل انور کا ذکر کیا کہ عوام جنرل انور کے مشکور ہیں کہ انہوں نے جسٹس چوہدری صاحب کو اس عہدہ جلیلہ کے لئے منتخب کیا۔ مصنف افتخار مغل نے بارہا لکھا ہے کہ جسٹس چوہدری کی تقرری پر جنرل انور، سردار سکندر حیات اور سردار عتیق کے درمیان اختلاف تھے۔ مصنف افتخار مغل جو ایک استاد اور ریسرچ سکالر ہیں کو اس تحریر سے پہلے برادری ازم اور ذاتی پسند و ناپسند کا چغہ اتار کر صاف اور کھلے ذہن سے قلم کشائی کا آغاز کرنا چاہئے تھا تا کہ پڑھنے اور پرکھنے والوں کو ریاست کے منصف اعلیٰ کے متعلق حقائق سمجھنے میں آسانی رہتی۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

تم نے کنفیوشس کی بائیوگرافی پڑھی ہے۔

نہیں۔

چنگیز خان یا پھر امیر تیمور کی سوانح تو ضرور پڑھی ہوگی۔

نہیں۔ میں نے تزک بابری، تزک جہانگیری، آئین اکبری اور ایک دوسری کتاب اکبر نامہ پڑھی ہے۔ میں نے جواب دیا۔

کنفیوشس اور چنگیز خان کا ڈاکٹر مغل سے کیا تعلق ہے۔؟ میں نے سوال کیا۔

تعلق ہے اگر توجہ ہو تو۔ اگر توجہ نہ ہو تو تعلق نہیں بنتا۔ دراصل توجہ سے ہی تحقیق کا عمل مکمل ہوتا ہے ورنہ بات نہ صرف ادھوری رہ جاتی ہے بلکہ رسوائی کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ نینا نے کہا۔

وہ کیسے؟

انسانی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں ایک ظاہر اور دوسرا باطنی۔ ظاہری پہلو پر توجہ سے ہی انسان کے باطنی پہلو پر نظر جاتی ہے جبکہ دونوں پہلوؤں پر الگ الگ توجہ اور تحقیق سے ہر پہلو سے ہزار ہا پہلو نکلتے ہیں۔ توجہ تحقیق کی پہلی کڑی ہے۔ جوں جوں توجہ کا عمل پختہ ہوتا ہے اس کا فو کس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ توجہ کے پختہ اور مسلسل عمل سے نقطہ اپنی ہیت بدلتا ہے مگر توجہ کے دائرے سے باہر نہیں جاتا۔ جب ایک محقق اپنی توجہ کو کسی ایک نقطے پر مرکوز رکھتا ہے تو وہ در حقیقت اس نقطے پر توجہ کے عمل سے تخلیق کائنات کے عمل کا عقل وشعور کی روشنی سے مشائدہ کر رہا ہوتا ہے۔

میں سمجھ نہیں سکا کہ اس سارے عمل سے ڈاکٹر مغل اور جسٹس چوہدری کا کیا تعلق ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر مغل انہیں ذاتی طور پر پسند کرتے ہوں یا پھر جسٹس چوہدری سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں یا جسٹس صاحب کا ان پر کوئی احسان ہو یا پھر وہ ایک بڑی اور حکمران برادری سے تعلق استوار کرنے کا راستہ بنا رہے ہوں۔ میں نے کہا۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ شائد ایسا ہی ہو۔ نینا نے جواب دیا۔

اگر ایسا ہے تو پھر چنگیز، تیمور اور کنفیوشس کہاں سے آگئے؟ میں نے پوچھا۔

توجہ اور تحقیق کے عمل میں یہ سب آتے ہیں۔ نینا نے کہا۔

وہ کیسے؟

کنفیوشس ایک دانشور، محقق اور مدبر ہی نہیں بلکہ عظیم چینی سلطنت کا چیف جسٹس بھی تھا۔ کنفیوشس دنیا میں موجودہ بیوروکریٹک نظام کا بانی ہے۔ کنفیوشس ہی وہ شخص تھا جس نے محسوس کیا کہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے بدلنے سے ملکی نظام نہیں بدلنا چاہئے اور نہ ہی عوام کی فلاح و بہبود کے کام اور نظام عدل پر قدغن لگنی چاہئے۔ حکمران کی موجودگی میں ایک ایسا نظام جس سے امور سلطنت چلانے میں نہ صرف آسانی ہو بلکہ جاری امور بغیر کسی رکاوٹ کے تکمیل پذیر ہونے کے طریقہ کو وضع کیا اور مقابلے کے امتحانات کا اجراء کر کے بہترین ذہنی صلاحیتوں کے حامل نوجوانوں پر مشتمل ایک نظام تیار کیا جسے آج کی اصطلاحات میں بیوروکریسی یا پھر نوکرشاہی کہا جاتا ہے۔ یادرکھنے کی بات کہ بیوروکریٹک نظام میں موجود کرپشن اور قباحتیں جو آج ہیں وہ کنفیوشزم سے انحراف کی وجہ سے ہیں۔ کنفیوشس ہی وہ پہلا جج تھا جس کی عدالت میں بادشاہ اور شہزادے بھی طلب کیئے جاتے۔ کہتے ہیں کہ کسی شاعر نے کنفیوشس کا قصیدہ لکھا جسے انعام کے بجائے سزا ملی۔ یہ سزا کنفیوشس نے نہیں بلکہ اس صوبے کے گورنر نے دی جہاں شاعر نے لوگوں کو قصیدہ سنایا۔

تمہیں پتہ ہے سزا کیا تھی؟ نینا نے پوچھا۔

کہا ہے کہ میں نے کنفیوشس نہیں پڑھا۔ میں نے جواب دیا۔

جن لوگوں کے سامنے شاعر نے قصیدہ پڑھا انہیں اسی مقام پر جمع کیا گیا اور شاعر نے معافی مانگی اور لکھا ہوا قصیدہ جلا دیا۔ شاعر نے تسلیم کیا کہ میں نے بدیانتی کی اور ایک ایسے شخص کو متکبر اور مغرور بنانے کیلئے اس کی تعریف کی جو عاجزی اور انکساری کا چغہ پہنے امیر و غریب کو یکساں انصاف مہیا کرتا ہے۔ وہ عدل کی کرسی پر بیٹھ کر اس دیوتا کی مانند ہوتا ہے جو اپنے پرائے کا لحاظ نہیں کرتا اور نہ ہی خونی رشتوں کو اپنے پاؤں کی زنجیر بناتا ہے۔ وہ نہ بادشاہ کے دسترخوان پر بیٹھتا ہے اور نہ ہی فقیر کی کٹیا پر حاضری دیتا ہے۔

پھر۔۔۔۔۔میں نے کہا۔

پھر یہ کہ جب کنفیوشس کو اس قصیدے اور قصیدہ خواں کی سزا کا پتہ چلا تو چیف جسٹس کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ جو شخص ججوں کے قصیدے لکھے اور ان پر تکبر کی چادر پھیلائے اسے سخت ترین سزا دی جائے اور پھر ملک بدر کر دیا جائے۔

کسی نے وجہ پوچھی تو کنفیوشس نے کہا کہ ایسے لوگ باز نہیں آتے۔ انہیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ کسی نہ کسی کو خدا بنانے سے نہیں ٹلتے۔ ان کا علم روشنی نہیں بلکہ اندھیرا پھیلاتا ہے اس لئے ان کا ملک میں رہنا انتشار کا باعث ہوسکتا ہے۔ منصفوں اور حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ قصیدہ خوانوں کو اپنے قریب نہ آنے دیں ورنہ وہ فرائض سے غفلت کے مرتکب ہونگے اور سزا کے حقدار ٹھہر ینگے۔

کنفیوشس کے فیصلے تاریخی ہیں۔ وہ چلتی پھرتی یونیورسٹی اور عدالت تھا۔ جو جو واقعات اس کے مشاہدے میں آتے وہ ان پر فیصلے صادر کرتا اور ایک نیا قانون مرتب کرتا۔

چنگیز خان سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک حکمرانوں، جنگجوؤں اور بادشاہوں کی ایک ہی لڑی ہے۔ چنگیز خان اس کے بیٹے اور پوتے حکمران بھی تھے اور جج بھی۔ وہ ہر فیصلہ خود کرتے اور موقع پر ہی سزا و جزاء کا عمل شروع ہوجاتا۔ ان کے فیصلوں میں جزاء کا عنصر کم اور سزا کا زیادہ تھا۔ یہ جنگل کا قانون تھا مگر اس کے بھی کچھ اصول اور ضابطے تھے۔ اگر تاریخ کے ان خونی ادوار کا موجودہ دور جسے ہم علم و آگاہی کی معراج وعظمت کا دور کہتے ہیں موازنہ کریں تو بعض فیصلے جو حکومتوں، حکمرانوں سے لیکر ججوں کی سطح پر ہوئے۔ ہلاکو اور چنگیز خان کے فیصلوں کو شرماتے ہیں۔

امریکہ کی حکومت اور حکمرانوں نے جو کچھ عراق و افغانستان میں کیا ویسا منظر ہلاکو اور چنگیز کے قتل عام میں بھی نہیں ملتا۔ تقسیم ہند کے موقع پر برٹش انڈین آرمی کی موجودگی میں جو قتل و فساد کا بازار گرم رہا اس کی ذمہ داری مقامی سیاسی قائدین سے زیادہ برٹش انڈین حکومت کے سر ہے۔ یہی حال جموں و کشمیر کا رہا جہاں ایک رات میں تین لاکھ مسلمان مہاجرین جنہیں شیخ عبداللہ نے پناہ کا یقین دلایا تھا قتل کردیئے گئے۔

صابرہ، شتیلہ سے لیکر دشت لیلیٰ اور قلعہ جنگی میں بہنے والا انسانی خون موجودہ تہذیب یافتہ اور معزز معاشرے اور حکمرانوں کے ماتھے پر ندنما داغ ہے۔

چنگیز خان کی اولاد سے ہی امیر تیمور پیدا ہوا جو ایک معمولی فوجی عہدے سے ترقی کرتا ہوا عظیم فاتح جرنیل اور مصلح بنا۔ تیمور کی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ اس کی شخصیت کی طرح اس کی تعمیرات جن میں عظیم شہر ثمر قند اور بخارا آج بھی دنیا میں بے مثال ہیں۔ امیر تیمور خود ججوں اور قاضیوں کا انتخاب کرتا اور انہیں قرآن و حدیث کے مطابق فیصلے کرنے کا پابند بناتا۔ خلفائے

راشدین کے بعد دوسرا دور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور تیسرا دور امیر تیمور کا ہے جہاں عدل و انصاف کے تقاضے اسلام کی سچی اور حقیقی روح کے مطابق ہوئے۔

آج دنیا میں جہاں بھی عدل وانصاف کی کوئی جھلک نظر آتی ہے وہ اسلام ہی کے اصول و ضوابط اور روایات سے مطابقت رکھتی ہے۔ اسلامی معاشرتی اصول وقوانین صرف مسلمانوں یا پھر مسلمانوں کے کسی طبقے یا فرقے کے لئے نہیں بلکہ ساری انسانیت کیلئے ہیں۔ دنیا میں کوئی دانشور، مفکر، مدبر، جج اور جسٹس نہیں جس نے قرآن اور اسلام کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اس پر کتنا عمل کرتا ہے یا اس کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمان کہلاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم لینن خدا کے حضور میں اسی سلسلہ کی کڑی ہے کہ وہ جو خدا کے وجود سے منکر ہے وہ بھی دل کے کسی خفیہ خانے میں اسے تسلیم کرتا ہے۔ مہاتما گاندھی تو رسول اکرم ﷺ کی رسالت کے بھی قائل تھے اور انہیں اللہ کا نبی ﷺ اور پیغمبر ﷺ تسلیم کرتے تھے۔

کیا یہ تمہارا خیال یا سوچ ہے یا اس کا کوئی ثبوت بھی ہے۔ میں نے پوچھا۔

تم نے صحیح بات کی۔ جب تک کسی چیز کا ثبوت نہ ہو۔ گواہ نہ ہو اسے سرعام کہنا جائز نہیں۔ میری بات اور ہے مگر جب کوئی سکالر بات کرتا ہے تو اسے محض جذبات کی رو میں بہہ کر یا پھر کسی بڑی شخصیت کی چاپلوسی اور قربت کی خاطر بے سروپا کہانیاں گھڑ کر اسے سوانح حیات کا حصہ بنا کر پیش کرنا زیب نہیں دیتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے کالم نگاروں، صحافیوں، ٹیلی ویژن اینکروں سے لیکر خودساختہ دانشوروں کی ایک بڑی کھیپ موجود ہے جو پلاٹوں، پرمٹوں، بیرون ملک دوروں اور بڑی بڑی تنخواہوں اور دیگر مراعات کے لئے دین وایمان کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

تم مہاتما گاندھی کی بات کر رہی تھی؟ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

ہاں میں کہہ رہی تھی کہ کسی بھی محقق کو اپنی بات کہنے سے پہلے ٹھوس دلیل پیش کرنی چاہئے جیسے ایک جج کو فیصلہ کرنے سے پہلے ایک غیر جانبدار اور سچی گواہی پر انحصار کرنا ہوتا ہے۔

مہاتما گاندھی نے اپنی کتاب "مذہب اور دھرم" میں ہندوؤں پر زور دیا کہ وہ اپنے مذہب اور روایات کو سمجھنے کیلئے دیگر مذاہب خاص کر اسلام اور قرآن کا مطالعہ کریں۔ چونکہ ہم ایک ایسی کتاب یا سوانح حیات کی بات کر رہے ہیں جس میں ایک جج کی زندگی اور ان کے عدل و انصاف کے متعلق ایک صحافی یا کالم نگار نے نہیں بلکہ ایک استاد، محقق اور دانشور نے قلم زنی کی

ہے اس لئے ضروری ہے کہ ایسے مصنف کی تحریر پر بات کرنے سے پہلے اس کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے۔ 17 ستمبر 1947 میں مہاتما نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے لئے قرآن کا پڑھنا پرارتھنا کا حصہ ہے۔ 15 ستمبر 1947 کے ایک ایسے ہی خطاب میں عدل و انصاف کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ معاشرے کو بے عزتی اور بربادی سے بچانا چاہتے ہیں تو انصاف کو آسان بنائیں۔ جو کوئی انصاف چاہتا ہے اسے چاہیے کہ خود بھی انصاف کرے۔ جس شخص کے ہاتھ پاک نہ ہوں وہ انصاف نہیں کرسکتا۔ دولت اور شہرت کا خواہشمند جج انصاف نہیں کرسکتا چونکہ وہ دن دولت اکھٹی کرنے کی جستجو میں اور رات اپنی شہرت کے نشے میں گزار دیتا ہے۔

28 اگست 1948 کو ینگ انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے گاندھی نے ایک بار پھر عدل و مساوات پر زور دیا اور کہا کہ عدل اور مساوات ایک ہی ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ اگر جج کے دل میں انتقام کا شبہ پیدا ہوجائے تو اسے حق نہیں کہ وہ عدالت میں بیٹھ کر ظلم کرے۔ 29 مئی 1924 کو ینگ انڈیا میں گاندھی کا بیان چھپا کہ جب عدل کرنے والا غصے میں آجائے انصاف کا ترازو برابر نہیں رہتا اور تعصب کا پلڑا بھاری ہوجاتا ہے۔ جج ہندو ہو یا مسلمان وہ حیوان بن جاتا ہے اور حیوانوں سے انصاف کی توقع عبث ہے۔ اس سے پہلے کہ میں گاندھی کی قرآن فہمی کی بات کروں ضروری ہے کہ مہاتما کے خدا کی وحدانیت پر یقین کا ذکر کروں۔ 24 نومبر 1921 ینگ انڈیا نے مہاتما کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا کہ ہم سب کا خدا ایک ہی ہے۔ خواہ ہم اسے قرآن یا انجیل کے ذریعے یا ژنداوستا یا گیت کے ذریعے سمجھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ حق اور محبت کا خدا ہے۔ اگر میں اپنے اندر اس ایمان کو ثابت نہ کروں تو مجھے خدا کی زمین پر جینے کا کوئی حق نہیں۔

مہاتما نے کہا کہ اگر تم روحانی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہو تو قرآن پڑھو۔ میں مسلمان نہیں مگر خدا کی مدد چاہتا ہوں۔ اس کیلئے مجھے قرآن کے صفحات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے جس کی ہر سورۃ میں خدا کے رحیم و کریم ہونے کی دلیل ہے۔ انسان جسمانی طور پر کتنا ہی لاغر اور کمزور کیوں نہ ہو اگر اسے روحانی طاقت مل جائے تو وہ فاتح عالم بن سکتا ہے۔

غیر مسلموں کو قرآن فہمی کی تلقین کے سلسلہ میں 13 جولائی 1940 کے ہریجن میں مہاتما کی تقریر کا متن شائع ہوا۔ مہاتما نے کہا کہ بعض ریسرچ اسکالروں کا خیال ہے کہ میں قرآن کی

عبادت سے اپنی عقل کے مطابق معنی پیدا کرتا ہوں اور قرآن کے مطالعہ سے دلیل پیش کر کے اسے اپنی فہم وفراست کے سانچے میں ڈھال لیتا ہوں۔ دیکھو یہ بات ایسے بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ جب میری سوچ کی بہتر نہیں بنتی تو میں قرآن کے مطالعے سے اسے درست کر لیتا ہوں جس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ میں اصل عبادت کا پوری طرح پابند رہوں اور کھلے دل سے اور نیک نیتی کو مدنظر رکھوں۔ میرا غیر مسلم ہونا اور قرآن پڑھنا اس کے معنی سمجھنے میں مانع نہیں ہوسکتا۔ قرآن وسیع تر علوم کا خزانہ ہے جس میں ہر ظاہری اور مخفی سوال کا جواب موجود ہے۔ اگر کوئی ریسرچ اسکالر تفریق اور تقسیم کے فارمولے پر عمل پیرا ہو کر علوم کی افادیت کو پرکھتا ہے اور اس پر قدغن لگاتا ہے تو وہ جاہل ہے۔ روحانی اور آسمانی کتابیں اور علوم انسانیت کی بہتری اور رہنمائی کیلئے ہیں اور ہر انسان کا حق ہے کہ وہ ان کا مطالعہ کرے اور فیض حاصل کرے۔

15 فروری 1942 کے ہریجن میں گاندھی کا بیان شائع ہوا جو ایک ہندو عالم کی اس سرزنش کے جواب میں تھا۔ جسے گاندھی کی پرارتھنا میں سورۃ فاتحہ کا شامل ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔

گاندھی نے کہا کہ میرے دوست کو اعتراض ہے مگر میں مجبور ہوں۔ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گجرات کی محترمہ ریحانہ طیب جی میرے پاس آئیں اور قرآن ایسی سریلی آواز میں پڑھا کہ حرف حرف دل و دماغ پر بیٹھ گیا۔ میں نے درخواست پیش کی کہ قرآن کی کچھ آیات آشرم کے ان لوگوں کو سنائیں جن کی آواز اچھی اور بھجن سریلی آواز میں گاتے ہیں۔ ریحانہ بی بی نے ایسے ہی کیا۔ دیکھو اگر قرآن کی تلاوت سننے سے مجھے سکون ملتا ہے تو میں ایسے سرور سے لطف کیوں نہ اٹھاؤں اور سکون سے کیوں نہ رہوں۔

ونوبا اور پیارے لال نے جیل میں عربی سیکھی اور قرآن پڑھا تو ان کے ہندو دھرم کو تقویت ملی۔ راما کے صرف ایک ہزار نام ہیں جن میں رحیم، کریم، رزاق، خالق، مالک اور حافظ و ناصر کے معنی چھپے ہیں۔

مہاتما نے ریسرچ سکالروں پر زور دیا کہ وہ اپنے علم کے زور پر لوگوں کو بہکانے کا کام نہ کریں بلکہ علم کی روشنی سے اندھیرے اور جہالت کے خفیہ خانوں میں روشنی کی کرن پہنچائیں۔

گاندھی نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار قرآن فہمی پر زور دیا اور اسے عمل کا عظیم سرچشمہ قرار دیا۔ شورش کاشمیری نے سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی جو سوانح حیات لکھی ہے اس میں سّید صاحب کی مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقاتوں کا تفصیلی

ذکر ہے۔شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ عزیز الرحمٰن کی معرفت گاندھی جی نے شاہ صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ہم ٹھیک وقت پر گاندھی جی کے ہاں پہنچے تو ملکی مسائل اور سیاست کے بجائے سورۃ اخلاص کی تفسیر پر بات چل پڑی۔ گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا میں قرآنی دعاؤں کے علاوہ سورۃ اخلاص اور سورۃ فاتحہ کا ذکر کیا اوران کی تلاوت کیلئے خصوصی اہتمام کا بھی حوالہ دیا۔ گاندھی نے بتایا کہ وہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کو سمجھنے کیلئے مولانا عبدالکلام آزاد اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے اور تفسیر کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

اس وقت میرے ذہن میں سری لنکا کے ایک چیف جسٹس راجہ رتنم کا خیال بھی آرہا ہے جن کے فیصلے بھی اسلام اور قرآن کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں۔ راجہ رتنم نے پاکستان کے عدالتی نظام پر مقالہ لکھا جو کتابی شکل میں شائع بھی ہوا۔ یہ کتاب ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ سے متعلق تھی جس میں راجہ صاحب نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کو جوڈیشل مرڈر یعنی عدالتی قتل قرار دیا۔

گاندھی جی کی خودنوشت کا حوالہ دینے کا مقصد۔میں نے دریافت کیا۔

مقصد یہ کہ اگر ایک مسلمان مومن جج اس بات کا دعویٰ کرے کہ وہ قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل کرتا ہے تو اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اس کی شان میں قصیدہ لکھنے اوران کے عدل کا پرچار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جج کے کردار کا کمال اس کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اگر کردار کی بات کروں تو کردار کی سب سے اچھی اور عمدہ تعریف سید قطب شہید نے کی ہے۔ سید قطب شہید فرماتے ہیں کہ کردار پھول کی خوشبو کی طرح ہے جب کھلتا ہے تو اردگرد کا ماحول معطر ہوجاتا ہے جج ہو یا کوئی عام آدمی جب وہ نیکی کا عزم لے کر نکلتا ہے تو شر اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

اگر ایک طرف ایک خاص طبقہ کسی جج کا نام استعمال کر کے فوائد حاصل کرے، مخالفین کو جیلوں میں بند کرے، قبرستانوں پر قبضہ کرنے کی خاطر قتل و غارت سے بھی دریغ نہ کرے، اعتراض کرنے والوں پر جھوٹے مقدمات کی بھرمار کردے اور ملک بدر کروادے، عدالتیں ان کی فریاد سننے سے انکار کردیں تو دوسری جانب عدل کا چرچا زیب نہیں دیتا اور نہ ہی پرچار کرنے والے محقق اور دانشور کے علم کو داد دی جاسکتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے ایسے ہی دانشوروں سے گزارش کی تھی کہ لوگوں کو اپنے ناقص علم سے بہکانے کا کام نہ کریں۔

قرآن فہمی کا جھوٹا دعویٰ بھی گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن فہمی کا دعویٰ کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ گنہگار ہے چونکہ وہ اپنے گناہ کا کھلے عام اظہار کر رہا ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

وہ اس طرح کہ اس شخص کہتا ہے کہ میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرتا ہوں جبکہ حقیقتاً وہ ایسے نہیں کرتا اور اپنے اردگرد کے لوگوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش پر فیصلے صادر کرتا ہے اور انہیں افسروں اور اداروں تک محض اس لئے رسائی ہوتی ہے کہ وہ ایک مقتدر شخصیت کے قبیلے یا برادری کے ہیں۔

تو۔۔۔۔۔

تو ایسا شخص جھوٹ کہہ رہا ہے اور جو اس کی تشہیر کرتا ہے وہ لوگوں کو بہکا رہا ہے۔

مگر نینا یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ ان پر کون دھیان دیتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو عدالتوں میں جھوٹی گوائیاں دیتے ہیں۔ پیسہ لے کر قرآن پر حلف اٹھا لیتے ہیں۔ لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ مگر معزز اور محترم بھی کہلاتے ہیں۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ نینا نے کہا۔

پاکستان میں اس بات پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے کہ مسلمان اور خاص کر پاکستانی ہمشیہ زوال پذیر کیوں رہتے ہیں۔ قوموں کی برادری میں ہماری وہ عزت کیوں نہیں جو دیگر اقوام کی ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس کی بڑی وجہ کیا ہے؟ نینا نے پوچھا۔

مذہبی تعصب، غربت یا پھر ڈکٹیٹر شپ۔ میں نے جواب دیا۔

یہ ایک روایتی بات ہے۔ نینا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا

عرب ممالک میں جمہوریت نہیں۔ ہر طرف بادشاہتیں پھیلی ہوئی ہیں سوائے ترکی اور ایران کے اور دوسری جانب ملائیشیاء میں کچھ حالات بہتر ہیں۔ مگر وہاں کے بھی اپنے اپنے انداز ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر ملک برطانیہ اور امریکہ کے نظام پر چلے، اصل مقصد عوام کو اقتدار میں شامل کرنا ہے جس کا طریقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ اپنی برادری کو عوام سمجھ کر ان سے چندہ جمع کر کے وزارت خریدی جائے اور اسے جمہوریت تصور کر لیا جائے۔ کرپٹ مافیا، سمگلر اور نو دولتیے حرام کی کمائی اور دھونس کے ذریعے ووٹ لے کر اسمبلیوں پر قابض ہو جائیں تو یہ بھی جمہوریت ہے۔

پاکستان میں غربت اس لئے نہیں کہ ملک میں وسائل کی کمی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ احساس ذمہ داری، قومی غیرت اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں۔ جب قوم چوروں اور لٹیروں کو قومی ہیرو تصور کر لے۔ ان کے ظالمانہ ہتھکنڈوں اور جبر کو اپنی تقدیر تصور کر لے، ان کے کھوکھلے نعروں اور فریب پر ایمان لے آئے تو ایسی قوم کبھی بھی باوقار اور معزز نہیں ہو سکتی۔ ہماری ذلت اور رسوائی کی اصل وجہ جمہوریت، غربت یا مذہبی تعصب نہیں بلکہ بے ہمتی ہے۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے مگر سائنسی بنیادوں پر کاشتکاری نہیں ہوتی۔ اگر ہر صوبے میں ایک زرعی یونیورسٹی قائم کی جائے اور سارے ملک کی مٹی کو لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعے پرکھا جائے تو پاکستان کی زمین کا ہر چپہ پیداوار کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم ڈیم اس لئے نہیں بناتے کہ سیاست متاثر ہوتی ہے۔ لاکھوں ایکڑ زمین بنجر اور ویران رکھی ہے کہ عرب شہزادوں اور پاکستانی جاگیرداروں، جرنیلوں، پیروں اور وڈیروں کو شکار گاہیں میسر رہیں۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اسے ذخیرہ اندوزی کے ذریعے مہنگے داموں بیچا جاتا ہے یا پھر سمگل کروایا جاتا ہے۔ پاکستانی پھل، سبزیاں، چینی اور آٹا بھارت سے لیکر سنٹرل ایشیا تک سمگل ہو کر جاتا ہے مگر کبھی کوئی چور اور سمگلر پکڑا نہیں جاتا۔

وجہ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔

حکومتوں پر سمگلروں، ڈاکوؤں، ذخیرہ اندوزوں اور غنڈہ عناصر کا قبضہ ہو تو پکڑنے والے کہاں سے آئیں گے۔

نینا نے جواب دیا۔

عدالتیں، سول سوسائٹی اور پریس وغیرہ کا یہی تو کام ہوتا ہے کہ اگر حکومت کسی بات پر صرف نظر کرے تو اسے اجاگر کریں۔ میں نے کہا۔

ہاں! یہ مغربی معاشرے اور ریاست میں تو ہوتا ہے ہمارے ہاں نہیں۔

ہمارے ہاں تو ایسے قانون دان، پارلیمنٹرین، سیاستدان اور سول سوسائٹی کے ممبران بھی ہیں جو جنرل پرویز مشرف کو دوبارہ برسر اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ قومی غیرت کا فقدان ہے۔

جھوٹ بولنا، اپنی تشہیر کرنا، لوگوں کو قانون شکنی پر ابھارنا، ناجائز طریقے سے دولت اکھٹی کرنا اور پھر اس ناجائز اور حرام کی کمائی ہوئی دولت پر فخر وغرور سے اعلیٰ اشرافیہ کا رکن بن جانا پاکستانی

سیاست کی معراج ہے اور اس سیاست کے کھلاڑی سیاستدانوں کے ہاتھ ہماری جمہوریت ہے۔

اس کی کوئی مثال بھی ہے یا پھر سنی سنائی بات ہے۔ میں نے کہا۔

ایک نہیں ہزاروں مثالیں ہیں۔ اگر ان مثالوں پر تحقیق کی جائے تو ہزاروں کتابیں مرتب ہوسکتی ہیں جیسے تزک زرداری، چوہدری نامہ، مولویوں کی میراث، میاں جی کے سیاسی مسالے اور جرنیلی جمہوریت وغیرہ پر PHD ہوسکتی ہے۔

آزاد کشمیر ہی کی مثال لو۔

میں آزاد کشمیر کے نودولتیے سیاستدانوں میں سے ایک ایسے کو جانتی ہوں جس نے دس بارہ سال پہلے سیاست کو بطور کاروبار شروع کیا تو اس کا کل اثاثہ تین لاکھ روپے اور ایک پرانی جیپ تھی۔ کسی نے پوچھا کہ اس رقم اور جیپ کے ساتھ الیکشن جیتنا ممکن نہیں تو موصوف نے جواب دیا کہ میری برادری میری حمایت کرے گی اور ولایت سے لاکھوں پونڈ چندہ جمع کر کے بھجوائے گی۔ میں ان کے دماغ میں ایک ایسا زہر گھول دونگا کہ وہ اپنی دولت میرے قدموں پر نچھاور کر دینگے۔ میں اس دولت سے پاکستانی سیاستدانوں اور نوکرشاہی کے کارندوں کو خرید کر اپنے گرد دولت، شہرت اور حیثیت کا قلعہ تعمیر کروں گا اور کوئی عدالت، کوئی قانون اور ضابطہ میرے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گا۔

پھر۔ میں نے پوچھا۔

پھر کیا۔ سب ویسے ہی ہوا۔ اس نے اپنی برادری کو متحرک کیا ان سے پیسہ جمع کیا اور الیکشن لڑ کر وزیر بن گیا۔ کرپشن کی انتہا کی اور لوٹ کے مال سے اسلام آباد میں عالیشان کوٹھی خریدی۔ پارٹی قیادت کے لئے اپنی رہائش گاہ پر جملہ لوازمات کا بندوبست کیا اور پارٹی قائدین کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ افسروں اور ججوں کو حج، عمرے اور بیرون ملک سیاحت کے لئے بھجوایا اور کچھ کا مفت علاج بھی کروایا۔ دوچار جرنیلوں کی فطری کمزوریوں کی کھوج لگا کر انہیں بھی دام میں پھنسالیا اور کچھ صحافیوں کے بھی ماہانے مقرر کر دیے۔ اب تم خود ہی بتاؤ کیا ایسے شخص کو کوئی عدالت، قانون اور ضابطہ اپنی گرفت میں لے سکتا ہے؟

صرف قدرت کا قانون۔ میں نے جواب دیا۔

ہاں یہ سچ ہے مگر کبھی کبھی دیر بھی ہوجاتی ہے۔ نینا نے کہا۔

یہ لوگ پیسہ کیسے کما لیتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

آسان ہے۔ نینا نے کہا۔۔

میں آزاد کشمیر کے ایک ایسے وزیر خوراک کو جانتی ہوں جس نے اپنی پسند کا سیکرٹری اپنی وزارت کے لیے لیا چونکہ جب کوئی نیا وزیر آتا ہے تو اسے نیچے والا عملہ گھر جا کر بریف کرتا ہے کہ جناب اس محکمے کا سیکرٹری کیسا ہے۔ اگر سیکرٹری پہلے سے کرپٹ ہے جو کہ اکثر کرپٹ ہی ہوتے ہیں تو وہ خود ہی پیغام بھجوا دیتا ہے کہ میری پوسٹنگ کی کوشش نہ کرنا تمہیں مجھ سے بہتر نہیں ملے گا اور پھر دونوں مل کر کھاتے ہیں۔

اکیلے نہیں۔ میں نے کہا۔

نہ۔ سیاستدان چاہے کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو وہ بیوروکریسی کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر محکمے کا سیکرٹری نہ چاہے تو وزیر ایک پیسہ نہیں کھا سکتا۔ اس لئے اگر کہیں کوئی ایک آدھ ایسا سیکرٹری نکل آئے تو اسے او ایس ڈی لگوا کر ہمیشہ کے لئے گلوخلاصی کروا دی جاتی ہے۔ پاکستان میں ایسے افسر موجود ہیں جنہوں نے آدھی سے زیادہ نوکریاں بطور او ایس ڈی کی ہیں اور کچھ کر بھی رہے ہیں۔

آزاد کشمیر میں بھی ایسا ہے۔ میں نے کہا۔

کیسا؟ نینا نے پوچھا۔

ایک آدھ افسر جو قانون کے مطابق چل رہا ہو۔ میں نے کہا۔

ہاں۔ مگر آٹے میں نمک کے برابر بلکہ سمندر میں قطرے کے برابر۔

کچھ عدلیہ کے جج بھی ہیں ان لوگوں کو اچھی پوسٹنگ نہیں دی جاتی یا پھر ان کے فیصلوں پر اکثر نظر ثانی ہو جاتی ہے۔۔ نینا نے جواب دیا۔

نینا تم اکثر مثالیں آزاد کشمیر سے دے رہی ہو۔ کیا سب برائیوں کی جڑ آزاد کشمیر ہے۔ میں نے کہا۔

آزاد کشمیر پاکستان کی ماڈل سٹیٹ ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ پاکستان ایک بڑا کینوس ہے اور آزاد کشمیر اس کینوس پر چھوٹی تصویر ہے۔ اگر کسی بڑی واردات یا کاروائی کو سمجھنا ہو تو اس کاروائی کا ایک نمونہ ایک چھوٹے ماڈل پر سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر میں ہر کام ویسے ہی ہوتا ہے جیسے پاکستان میں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسے سمجھنا آسان ہے چونکہ واردات کا دائرہ محدود مگر

نوعیت یکساں ہوتی ہے۔

سوائے ریلوے ،ایوی ایشن، جہازرانی اور چند ایک دوسرے محکموں کے باقی سب محکمے آزاد کشمیر میں بھی موجود ہیں۔عوام کو جن محکموں سے ہر لمحے واسطہ رہتا ہے ان میں بلدیات، خوراک،تعمیرات، داخلہ،صحت،تعلیم،عدل و انصاف اور محکمہ مال ہیں۔ان محکموں کے بجٹ اور عدل و انصاف کا تعلق براہ راست حکومت پاکستان سے ہے۔اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی تعیناتی چیف ایگزیکٹو آف پاکستان کرتا ہے جبکہ چیف سیکرٹری، انسپکٹر جنرل آف پولیس،سیکرٹری خزانہ اور آڈیٹر جنرل کے علاوہ چند دوسرے افسر پاکستان سے آتے ہیں اور کھل کر کھاتے ہیں چونکہ وہ اصل حکمران اور وائسرائے ہوتے ہیں۔وہ سیاسی پارٹیاں جو آزاد کشمیر میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھتی ہیں درحقیقت پاکستانی سیاسی پارٹیوں کی شاخیں ہی نہیں بلکہ ان کی ماتحت اور باجگزار پارٹیاں ہوتی ہیں جو از خود کوئی سیاسی یا انتظامی فیصلہ نہیں کر سکتیں۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

فرض کرو آزاد کشمیر پیپلز پارٹی اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرتی ہے اور ان کے اس فیصلے پر پاکستان پیپلز پارٹی خوش نہیں اور وہ آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے عہدیداروں کو برطرف کر دیتی ہے تو اس صورت میں اس پارٹی کی سیاسی قانونی اور اخلاقی ساکھ کیا رہ جائے گی۔

اس کی کوئی مثال بھی ہے یا محض مفروضہ ہے۔میں نے کہا۔

اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔سردار محمد ابراہیم خان پر محترمہ بینظیر بھٹو نے کچھ اعتراضات اٹھائے تو انہوں نے اپنی جماعت جے کے پیپلز پارٹی بنالی۔اس طرح ممتاز حسین راٹھور مرحوم اور بیرسٹر سلطان محمود چوہدری کو پارٹی چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔

مسلم کانفرنس ایک الگ جماعت تو ہے مگر اپنے آپ کو پاکستان مسلم لیگ ہی کی شاخ سمجھتی ہے اور برملا اس کا اعلان بھی کرتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مسلم کانفرنس ہر اس مسلم لیگ یا لیگی دھڑے کی شاخ ہوتی ہے جو اقتدار میں ہو۔ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے ادوار میں مسلم کانفرنس جی ایچ کیو مسلم لیگ کی شاخ تھی اور آج کل سردار سکندر حیات اور سردار عتیق احمد خان پلاسٹک کی ایک ایک ہری شاخ لیے اسے مسلم لیگ نواز اور پیپلز پارٹی کے تنوں سے جوڑنے کی کوشش میں ہیں۔

تم قرآن فہمی کی بات کر رہی تھی کہ جو شخص قرآنی علم کی روشنی میں اپنے معاملات دیکھتا ہے

اور عدل کرتا ہے اسے کسی تشہیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے عمل و کردار کی خوشبو سے معاشرہ مہک اٹھتا ہے اور ہر ذی روح اس سے فیض پاتا ہے۔ تم یہ بھی کہہ رہی تھی کہ دنیا کی عظیم شخصیات نے قرآن کا مطالعہ کیا اور اپنے علم و عمل کو انسانی فلاح و اصلاح کیلئے بہتر طریقے سے پیش کیا۔

نینا کیا وہ شخصیات جو نزول قرآن سے پہلے دنیا میں آئیں کیا انہیں بھی قرآنی علوم اور احکامات کی روشنی میسر تھی۔ میں نے سوال کیا۔

اس سے پہلے میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں، ضروری ہے کہ اس بنیادی نقطے کی وضاحت کر دوں جس پر ہم نے بات کا آغاز کیا تھا۔۔

انصاف کے سفر کے مصنف نے لکھا ہے کہ چیف جسٹس آف آزاد کشمیر کی بطور چیف الیکشن کمیشن تقرری اور دیگر معاملات پر سردار سکندر حیات کو اعتراض تھا۔ مصنف کی یہ سوچ سنی سنائی اور روائتی باتوں کی عکاس ہے۔ سیاسی کھیل میں جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ آزاد کشمیر کی سیاست میں برادری ازم کا غلغلہ تو ہے اور ایک حد اور سطح تک اس پر عمل بھی ہوتا ہے مگر جہاں سیاستدانوں کے مفاد مشترک ہوں وہاں برادری کی قربانی نہ صرف جائز بلکہ فرض ہو جاتی ہے۔

مسلم کانفرنس اور پیپلز پارٹی بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر دونوں پارٹیوں کے کچھ کرتا دھرتا اندرونی طور پر باہم شیر و شکر ہیں اور ایک دوسرے کی خواہشات اور مفاد پر نہ صرف سیاسی اصولوں اور کارکنوں کی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں بلکہ دین و ایمان کی حد سے بھی گزر جاتے ہیں۔ سیاستدان ایک محفل میں ایک دوسرے پر الزامات لگاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو غدار، وطن دشمن، کرپٹ اور دشمن کے ایجنٹ کہتے ہیں اور دوسری محفل میں نہ صرف مخالفین کی تعریفیں اور قصیدے پڑھتے ہیں بلکہ انہیں ولّی، پیر، درویش اور عظیم سیاسی قائد کہہ کر منافقت کا ڈھول پیٹ رہے ہوتے ہیں۔ جو پارٹی برسر اقتدار ہوتی ہے وہ اپنے اور اپنی مرشد پارٹی جو پاکستان میں حکمران ہوتی ہے کے دور میں کشمیر کی آزادی کی نوید سناتی ہے اور اپنے پاکستانی آقاؤں کی تعریفوں کے پل باندھتی ہے تاکہ حقہ پانی چلتا رہے۔ جہاں تک سکندر حیات کی مخالفت کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک چکمہ ہے۔ درحقیقت جسٹس چوہدری کا بنیادی تعلق مسلم کانفرنس ہی سے ہے اور اس امر سے آزاد کشمیر کا ہر شخص واقف ہے۔

جناب محمد شریف طارق ایڈووکیٹ نے اپنی سوانح حیات بعنوان "زندگی جبر مسلسل" میں

لکھا ہے کہ چیف جسٹس کا تعلق مسلم کانفرنس سے ہے اور وہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف احتجاج کے جرم میں جیل بھی جا چکے ہیں۔ جسٹس چوہدری مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بطور سٹوڈنٹ لیڈر، ینگ لائیر اور ایک سیاسی ورکر متاثرین منگلا ڈیم کی بحالی کی تحریک میں شامل رہے اور جیل بھی گئے۔

سردار سکندر حیات اور سردار عبدالقیوم کے خاندانوں سے جج صاحب کے گہرے مراسم ہیں اور ان کی بطور جج تعیناتی میں دونوں سرداروں کی مرضی شامل تھی۔ چیف الیکشن کمیشن کا عہدہ عارضی تھا اور جنرل انور اور سکندر کے درمیان رنجش کی وجہ سے وقتی ابال آیا جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک ریسرچ سکالر، استاد اور مفکر کو چاہیے کہ وہ سطحی اور غیر اہم واقعات سے صرف نظر کر کے اصل حقائق پر توجہ دے اور بیان کرے۔ سطحی، غیر اہم، نفرت انگیزی اور کینہ پروری کی باتوں کے بیان اور انہیں بلند سطح پر لیجانے سے تحریر کے عنوان کا معیار نہ صرف گر جاتا ہے بلکہ ایسی تحریر ادب کے معیار و مرتبے کی توہین تصور ہوتی ہے۔ وقتی طور پر ایسی تحریریں اپنی جعلی ساکھ اور مارکیٹ ویلیو تو بنا لیتی ہیں اور کچھ ذاتی تشہیر اور مادی مفادات کا وسیلہ بھی بن جاتی ہیں مگر ادب کی وسیع دنیا میں مقام نہیں بنا سکتیں اور نہ ہی آنے والے دور میں لکھنے والے انھیں اپنی تحریروں میں بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی عدلیہ کے اکثر ججوں کا تعلق کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے رہا۔ پارٹیاں اور افراد جب اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھیں تو اپنی مرضی کے جج بھی تعینات کیئے جو ان کی لوٹ مار اور ماورائے آئین اور قانون بدا عمالیوں اور بدعنوانیوں کو عدالتی اور قانونی تحفظ دیتے رہے۔

مفاد پرست سیاستدان ہو یا جرنیل وہ ہر کسی کو جج نہیں بناتے اور نہ ہی ہر کسی پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ وہ وکلاء اور پارٹی عہدیدار جنہیں اعلیٰ عدلیہ میں تعینات کیا جاتا ہے ان کی وفاداری اور ہمدردی یقینی اور قابل اعتماد ہوتی ہے۔۔

آزاد کشمیر میں بھی بہت سے ایسے جج صاحبان ہیں اور ہو گزرے ہیں جو سیاسی پارٹیوں کے اعلیٰ عہدیدار رہے ہیں۔ اب اگر ان جج صاحبان سے کوئی خالص اور کھرے انصاف کی توقع کرے اور عدالتوں پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے تو اس کی موت یقینی ہے۔

آزاد کشمیر کی عدلیہ ہو یا انتظامیہ، برادری اور سیاست اہم رول ادا کرتی ہے۔ اگر کوئی دانشور

یہ کہے کہ ایک سیاسی جماعت یا سیاسی قائد اپنی ہی جماعت سے وابستگی رکھنے والے کسی جج یا عہدیدار کا مخالف ہے تو ایسا بیان یا تحریر محض عوام الناس کو دھوکہ دینے اور انہیں موت کے شکنجے میں کسنے کے مترادف ہوگا۔ایسے بیان اور تحریریں عوام کی توقعات کو بڑھانے کا باعث بنتی ہیں جو حقیقت کے منافی انھیں مایوسی اور محرومی کے اندھیرے میں دھکیل کر انہیں قانون، عدل اور ریاست کے وجود سے انکاری پر مائل کرتی ہیں۔جب عام آدمی ریاست اور ریاستی اداروں سے بددل ہوجائے، اس کا اعتماد اٹھ جائے، مایوسی اور محرومی کے سوا اسے کچھ نظر نہ آئے تو طالبان اور القائدہ جیسی تنظیمیں وجود پذیر ہوکر ریاست کے وجود کے لئے خطرہ بن جاتی ہیں۔

پاکستانی طالبان اور دیگر دہشت گرد تنظیمیں ان ہی مایوس اور بدل نوجوانوں کو اپنے ہاں پناہ دیکر انہیں دہشت گردی کی تربیت دیتی ہیں تاکہ وہ ان تنظیموں کے عزائم کی تکمیل کر کے معاشرے اور ریاست سے بدلہ لے سکیں۔

معاشرے اور ریاست سے کیوں یہ لوگ اسی معاشرے کا حصہ نہیں۔میں نے پوچھا۔

یہ لوگ اس معاشرے کا حصہ تو ہیں مگر معاشرے نے اپنا حقیقی رول ادا نہیں کیا۔جب معاشرہ اپنے فرائض سے غافل رہے اور اہم امور پر خاموش تماشائی بنا رہے تو معاشرے کے مظلوم، بے بس، مجبور اور محکوم افراد نہ صرف ظالم حکمرانوں سے بلکہ ریاست اور بے حس معاشرے سے بھی بدلہ لیتے ہیں۔اس سے پہلے میں نادر جسکانی کی مثال دے چکی ہوں کہ کس طرح معاشرے کی بے حسی اور حکومت کے جبر نے ایک بے کس اور مجبور محنت کش کو صوبے کا سب سے بڑا ڈاکو اور دہشت گرد بنا دیا۔

پاکستان میں حالیہ دہشت گردی اور افراتفری بھی معاشرتی بے حسی کے خلاف مظلوم کا ری ایکشن ہے۔اگر ہر ایک دہشت گرد کے کیس کو باریک بینی سے دیکھا جائے تو اس کے پیچھے ایک حکومتی اہلکار، ایک جج، ایک رشوت خور وکیل، ایک ظالم تھانیدار اور پٹواری، ایک وڈیرا، جاگیردار، کرپٹ سیاستدان، ایک مغرور جرنیل یا بیوروکریٹ، ایک قبضہ گروپ کا سرغنہ یا کسی نو دولیتے کی دھونس دھاندلی اور متکبرانہ سیاست کا عکس نظر آئے گا جو معاشرہ بدعنوان، بدکردار اور متکبر لوگوں کے آگے سرنگوں ہوجائے اور انہیں اپنا قائد، لیڈر اور نجات دہندہ تصور کرلے تو اسے آگ اور خون کا دریا پار کرنا ہی ہوتا ہے۔جب اکبر بگٹی کے ساتھ سیاستدان بلی چوہا کھیل رہے تھے اور قسم قسم کے بلوچستان پیکج اور کمیٹیاں بنا کر قوم کو بیوقوف بنا رہے تھے تو سول سوسائٹی کے

کسی ممبر، ایکس سروس مین سوسائٹی کے کسی جرنیل، کسی این جی او یا سیاسی پارٹی نے اس پر احتجاج نہ کیا۔ کسی نے شجاعت حسین، مشاہد حسین اور وسیم سجاد کے خلاف آواز نہ اٹھائی، نہ تحریک چلائی اور نہ ہی دھرنا دیا۔ کسی اینکر، کسی دانشور نے یہ نہ سوچا کہ مشائد حسین اینڈ کمپنی جنرل مشرف کی چکمہ ساز اور چالباز پالیسیوں کو سیاسی رنگ دیکر ملک اور قوم کو ایک نئے فتنے اور فساد کی نذر کررہی ہے۔ ان لوگوں نے بگٹی سے ملاقاتوں کے بعد جو کمیٹیاں اور پیکج بنائے وہ محض دکھاوا تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ لوگ حکومت کو چندروز کے اندر اپنی سفارشات پر عمل درآمد کا الٹی میٹم دیتے اور بصورت دیگر مشرف حکومت سے علیحدہ ہوجاتے۔

یہی ٹیم سانحہ لال مسجد اور جامع حفصہ کی ذمہ دار ہے۔ مشاہد حسین اور شجاعت حسین نے لال مسجد کے چکر لگانے شروع کیے تو عام لوگوں نے خطرہ محسوس کرلیا کہ اب لال مسجد والوں کی خیر نہیں۔ ایک طرف اسلام آباد پولیس اور عام شہری لال مسجد والوں سے وہ کام لے رہے تھے جسے کرنے کی ان میں اخلاقی جرأت نہ تھی۔ اسلام آباد کے ہر سیکٹر میں ازبک، تاجک، ترکمان، چینی اور افغانی لڑکیاں طالبات، بیوٹیشن، مساجر اور گھریلو ملازمین کے بھیس میں جسم فروشی کا دھندہ کررہی تھیں جن کے پرموٹر انتہائی بااثر لوگ تھے جن کے سامنے حکومتی ادارے اور شخصیات بے بس تھیں۔ پولیس اور شہری لال مسجد کی طالبات اور اساتذہ کے دینی اور اخلاقی جذبات کو ایکسپلائٹ کرکے شہر سے بے حیائی کا گند تو صاف کرنا چاہتے تھے مگر وہ ان کی مدد کو تیار نہ تھے۔

آنٹی شمیم نامی نائیکہ اور چینی مساج سنٹر کا واقع رونما ہوا تو وزارت داخلہ اور میڈیا نے اسے خوب اچھالا۔ انسانی حقوق کے تنظیموں نے میڈیا کی مدد سے لال مسجد اور جامع حفصہ کو ملک کے اندر ایک اور ملک قرار دیکر حکومتی رٹ کی بحالی کا ایسا واویلہ مچایا جس کی مثال نہیں ملتی۔ مشہور ٹیلی ویژن پروگراموں کے اینکرز نے تو جامع حفصہ اور لال مسجد کو دہشت گردی کا اڈہ، گولڈن ٹیمپل اور پتہ نہیں کیا کیا بنا کر پیش کیا اور اپنے پروگراموں میں حکومت سے باربار مطالبہ کیا کہ وہ لال مسجد کی انتظامیہ کے خلاف سخت ترین ایکشن لے۔ ایک طرف ملک کے نامور صحافی، دانشور اور سیاستدان منافقت کا گیت الاپ رہے تھے اور دوسری جانب اسی اشرافیہ کا ایک حصہ جامع حفصہ اور لال مسجد کی انتظامیہ کو دین اسلام، اسلامی روایات اور سنت رسول ﷺ پر کاربند رہ کر ملک سے بے حیائی، برائی، کرپشن کے خاتمے اور شرعی نظام کے نفاذ کے لئے جان کا نذرانہ پیش

کرنے پر اکسا رہا تھا اور بظاہر ان کو حمایت اور مدد کا یقین بھی دلا رہا تھا۔

یہی نہیں بلکہ ان ہی میں سے ایک ٹولہ جس میں علماء، دانشور، سرکاری صوفیاء اور سیاستدان شامل تھے ثالثی کا رول ادا کر رہے تھے۔ یہ ٹولہ جب لال مسجد اور جامع حفصہ کی انتظامیہ سے ملتا تو انہیں ڈٹ جانے کا پیغام اور مشورہ دیتا۔ اور جب مشرف انتظامیہ سے ملتا تو انہیں لال مسجد اور جامع حفصہ کے لئے خلاف جلد از جلد کاروائی اور ان کے خاتمے کا مشورہ دیتا۔

ان تین طبقات کی پشت پر سول سوسائٹی کھڑی تھی جس کے ممبران آئے روز ٹیلیویژن پروگراموں کے ذریعے ملک میں سیکولرازم کا درس دیتے اور جامع حفصہ کی باپردہ طالبات کو کالی چڑیلیں، بدروحیں اور دہشت گردی اور تنگ نظری کی علامتیں قرار دیتے۔ ملک کے مشہور سٹیج اداکاروں اور فنکاروں نے جامع کی طالبات پر طرح طرح کے الزامات لگائے، ان کے کردار اور اخلاق پر ڈرامے سٹیج کیئے جنہیں ملک کی سول سوسائٹی نے نہ صرف سراہا بلکہ اس طرح کے مزید کھیل ملک بھر میں پیش کرنے اور عوام الناس کو شعور اور آگاہی فراہم کرنے پر زور دیا۔

ان تین طبقات کے بعد ملک کی آبادی کا بڑا حصہ جسے عوام کیا جاتا ہے نے خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا اور وہ لال مسجد پر فوج اور پولیس ایکشن کا نظارہ دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ پاکستانی عوام نے لال مسجد اور جامع حفصہ میں موت کا کھیل دیکھنے کے لئے جس شوق اور ولولے کا مظاہرہ کیا شائد ایسے ہی قدیم رومن بادشاہوں کے دور میں گلیڈی ایٹر موت کا کھیل پیش کر کے عوام اور حکمرانوں کو تفریح مہیا کرتے تھے۔

اگر دس ہزار غیرت مند پاکستانی اسلام آباد میں مظاہرہ کرتے، عوام اور نام نہاد عوامی لیڈر پرویز مشرف سے لاتعلقی کا اظہار کرتے، عدالت اور قانون سے مدد لیتے ہوئے لال مسجد اور جامع حفصہ کے معاملات کو سلجھاتے اور کچھ عرصہ کے لئے وہاں پر تدریسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے طالبات کو ان کے اپنے ہی علاقوں، شہروں اور قصبوں کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایڈجسٹ کروا دیتے، وہ طالبات جو اخراجات برداشت کرنے کی متحمل نہیں تھیں حکومت ان کا خرچہ اٹھا لیتی اور یتیم اور بے سہارا بچیوں اور بچوں کی کفالت کا مناسب بندوبست کر دیتی تو یہ سانحہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

وہ بچے اور بچیاں جو جل کر مر گئے ان میں زیادہ تر کا تعلق صوبہ سرحد، جنوبی پنجاب، افغانستان اور قبائلی علاقوں سے بتایا جاتا ہے۔ ان بچوں اور بچیوں کی تعداد کتنی تھی کسی کو پتہ

نہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں کے نامور اینکرز اور ملک کے عظیم دانشوروں نے سانحہ سے پہلے ان کی تعداد بارہ ہزار بتائی۔ بعد میں ان ہی دانشوروں نے تعداد کو پانچ ہزار اور آخر میں پندرہ سو سے ڈھائی ہزار تک بتایا۔ حیرت کی بات یہ کہ آج تک کسی صحافی اور دانشور نے جامع حفصہ کی زندہ بچ جانے والی انتظامیہ جس میں جامع حفصہ کی پرنسپل بھی شامل ہیں سے مرنے والوں کا ریکارڈ دکھانے کی زحمت نہیں کی۔

جنرل پرویز مشرف نے سو ڈیڑھ سو کے قریب ہلاکتوں کا اعتراف کیا جبکہ ایک مشہور ٹیلی ویژن چینل کے اینکر نے آپریشن کے دوسرے روز پانچ سو قبروں کی کھدائی کی خبر دی۔ کچھ لوگوں نے ایک ایک قبر میں تین اور چار بچوں کی جلی ہوئی لاشیں دفنانے کی بات کی مگر سانحہ کارساز اور لیاقت باغ کی کوکھ سے جنم لینے والی عوامی حکومت کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ لال مسجد اور جامع حفصہ میں جل کر مرنے والے غریب، بے سہارا اور یتیم بچوں کی موت کا سبب جاننے کے لئے محض ایک فرضی انکوائیری ہی کروا لیتی۔

ظاہر ہے کہ کسی سیاسی جماعت کے لئے چاہے وہ دینی سیاسی جماعت ہی کیوں نہ ہو ایسا کرنا ممکن نہیں چونکہ اس طرح کے لوگ کسی حکومت اور سیاسی پارٹی کے نہ ورکر ہوتے ہیں اور نہ ہی سپوٹر یا ووٹر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی جلسے یا جلوس کی رونق بننے کا سبب نہ ہوں وہ جل مریں یا پھر پولیس، پٹواری وڈیرے، جاگیردار یا پھر کسی سیاسی فنکار کے ہاتھوں کٹ مریں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

نینا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں تمہیں نادر جسکانی کا واقع بتا چکی ہوں۔ نادر ایک بے سہارا، یتیم، غریب اور مفلس مزدور تھا جسے انتقام کے جذبے نے ڈاکو بنا دیا اور نادر کو ڈاکو بنانے والے پولیس والے نے نادر کو مار کر بہادری کا تمغہ جیتا اور پرموشن حاصل کیا۔ سیاستدانوں نے نادر کو سیاسی ورکر، جیالہ اور جمہوریت کا سپاہی قرار دے کر اس کی موت کو کیش کیا مگر کسی نے نادر کی مظلوم بہن سے نہیں پوچھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟

موجودہ دہشت گردی کا نادر سے کیا تعلق؟ میں نے پوچھا۔

نادر کا تعلق صرف موجودہ دہشت گردی ہی سے نہیں بلکہ ماضی سے بھی ہے۔

محمد خان ڈاکو، چراغ بالی، مانک بسال، جگا گجر، سجاول، پُھل ماچھی اس زنجیر کی پہلی کڑیاں

ہیں جبکہ نادر جسکانی ایک کمزور اور درمیانی کڑی ہے۔ان نامی گرامی اور تاریخی کرداروں کا جائزہ لیا جائے تو کوئی بھی پیدائشی ڈاکو نہیں تھا۔ بلکہ معاشرے اور ریاست کے جبر نے انہیں باغی بنادیا اور پھران لوگوں نے معاشرے اور ریاست سے ہی انتقام لیا۔

فضل اللہ، صوفی محمد، مولانا ارشاد، الیاس کشمیری، منگل باغ، حکیم اللہ، بیت اللہ، عبداللہ مسعود، فقیر محمد اور گل بہادر اسی زنجیر کی مضبوط کڑیاں ہیں۔فرق صرف علم، آگاہی، رقابت، حسد اور انتقام کے طریقہ کار کا ہے۔

محمد خان کے پاس تھری ناٹ تھری اور بارہ بور رائفلیں تھیں، نادر کے پاس ڈبل بیرل اور کلشنکوف تھی اور فضل اللہ، حکیم اللہ اور منگل باغ کے پاس سوائے بحری اور ہوائی جہاز کے دنیا کا ہر وہ ہتھیار موجود ہے جسے قیمت دیکر بازار سے خریدا جاسکتا ہے۔اگر ان لوگوں کے پاس ہوائی اڈا یا بندرگاہ ہوتی تو ان کے آرسنل میں بھی فرانسیسی آبدوزیں، امریکی اور برطانوی جہاز، اسرائیلی ایٹم بم اور روسی بحری جہاز ہوتے۔

اگر پیسے دیکر یہ لوگ فرانسیسی وائیرلیس، روسی بارودی سرنگیں، امریکی رائفلیں، بھارتی مشین گنیں، راکٹ، اینٹی ائیر کرافٹ گنیں، امریکی بارود اور اسرائیلی ریڈیو سٹیشن خرید سکتے ہیں تو اس سے آگے بھی جاسکتے ہیں۔

اس میں معاشرے کا کیا قصور ہے؟ میں نے پوچھا۔

معاشرہ بے حس ہے۔ نینا نے کہا۔

ریاست کی جغرافیائی حدود میں معاشرے کا انتہائی اہم، سنجیدہ اور حساس رول ہوتا ہے۔ جب حکومتی ادارے اور حکمران خود غرضی، جبر اور ظلم کو ہتھیار بنا کر استحصال کی راہ اختیار کریں تو معاشرے کا فرض ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف حکمرانوں اور اداروں کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ ان کی بیخ کنی بھی کرے۔

اگر پاکستانی معاشرہ بیدار، حساس، سنجیدہ اور ذمہ دار ہوتا تو نہ صرف پرویز مشرف بلکہ مشاہد حسین، شجاعت حسین، وسیم سجاد اور اعجاز الحق کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرتے اور پوچھتے کہ بگٹی کیوں قتل ہوا، لال مسجد اور جامع حفصہ میں بچوں کو کیوں جلایا گیا۔شوکت عزیز کو کس نے وزیراعظم بنایا ورتم لوگوں نے اس کی بیعت کیوں کی؟ چینی، سیمنٹ اور گندم کا سکینڈل کیوں بنا اور سٹیل مل کو کوڑیوں کے بھاؤ کس نے فروخت کرنے کی سازش کی؟ اربوں روپے کے ٹیکس

کیوں معاف ہوئے اور سرکاری اداروں میں کھربوں روپے کرپشن اور چوری کیسے ہوئی؟

اگر معاشرہ بیدار ہوتا تو نواز شریف سے پوچھتا کہ ملک سنوارنے اور قرض اتارنے کے بہانے جو عطیات جمع ہوئے وہ کہاں گئے۔ کارگل آپریشن کے فوراً بعد انکوائری کمیشن کیوں نہ بٹھایا، سیف الرحمٰن کو کس کے اشارے پر مختار کل بنایا اور لوٹ مار کرنے والے افسروں کو کھلی چھٹی کیوں ملی؟

جب حکومتوں اور اداروں کو معاشرے کی گرفت کا احساس نہ ہو تو حکومتیں من مانی کرتی ہیں۔ ظلم اور جبر حکمرانوں کا طریق حکمرانی ہوتا ہے اور اسکا ری ایکشن کبھی محمد خان ڈاکو، کبھی نادر جسکانی اور کبھی فضل اللہ، حکیم اللہ، بیت اللہ، گلبہادر اور منگل باغ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

جب معاشرہ ظلم و جبر کے مناظر ٹیلی ویژن پر دیکھنے اور انجوائے کرنے کا عادی ہوجائے تو اسے سڑکوں، سکولوں، دفتروں اور بازاروں میں پھولوں کے گلدستے، ہار اور گجرے پیش کرنے والے نہیں بلکہ خودکش جیکٹوں، دستی بموں، بارود سے لدی گاڑیوں اور کلاشنکوفوں والے ہی ملتے ہیں اور آج ہر پاکستانی ان سے مل رہا ہے۔

پاکستانی معاشرہ جس طرح کے سین ٹیلیویژن پر دیکھنے کا عادی تھا ایسے ہی پروگرام اب ہر گلی، محلے اور شہر میں پیش کئے جارہے ہیں۔ اگر معاشرہ اب بھی بیدار نہ ہوا، موروثی سیاست اور جبری حکومتی نظام کو مسترد نہ کیا، جیالے اور متوالے اپنی باریاں لگاتے رہے اور عدالتوں کو اپنی مرضی سے چلایا اور بے بس کردیا گیا تو عوام نہ صرف اناج کے دانے دانے کے لئے ترس جائیں گئے بلکہ انہیں گھروں سے باہر تازہ ہوا بھی میسر نہیں ہوگی۔

تم میرے سوال کا جواب دینے والی تھی۔ میں نے نینا کو یاد دلایا۔

ہاں۔ تمہارے سوال کا جواب بھی ضروری ہے۔ نینا نے کہا۔

دیکھو قرآن فہمی ایک وسیع موضوع ہے جسے سمجھنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ قرآنی علوم کی وسعت کائنات سے بھی وسیع تر ہے چونکہ یہ اس خالق و مالک کا کلام ہے جس نے یہ کائنات تخلیق کی اور پھر اسے اپنی قدرت کے دائرہ میں مقید کرلیا۔ اللہ کے قادر اور واسع ہونے کی حکمت اور قدرت کو ہی انسان سمجھنے سے قاصر ہے جبکہ اس کے مخفی اوصاف اور اسماً کی کوئی حد ہی نہیں۔ اللہ کے نام ہی اللہ کے اوصاف کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسے نبیوں، پیغمبروں، ولیّوں، فرشتوں اور جنوں نے کن کن ناموں سے یاد کیا کسی کو پتہ ہی نہیں۔

ان ناموں کے علاوہ اس کے کتنے نام اور صفات ہیں اس کا ذکر علماً حق نے صرف اس انداز سے کیا کہ خالق حقیقی کے ظاہری اور مخفی ناموں کا واسطہ دیکر بخشش اور اصلاح کی آرزو کی۔
میرے نزدیک قرآن فہمی کے لئے عالم، عامل، صوفی، یا سادھوسنت ہونا ضروری نہیں بلکہ قرآن فہمی کے لئے قرآن ہی کا بتلایا ہوا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔
اگر ایک عام انسان اپنی ذہنی قوت کے مطابق قرآن کا مطالعہ کرے اور قرآنی احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی جستجو کرلے تو قرآن سے ہی اسے اپنے سوالوں کے جوابات ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ انسانی عقلی قوت، شعوری بیداری اور جستجو پر منحصر ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے کی کتنی استطاعت رکھتا ہے۔
قرآن کے وہ قاری جنہیں قرآن فہمی کے حصول سے علم کی روشنی میسر آئی دراصل وہ ان کی اپنی ہی عقلی اور شعوری قوت کی استعداد تھی جس کے مطابق انہیں مشائدات میسر آئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک قاری کس مقصد کے حصول کے لئے قرآن سے رجوع کرتا ہے۔ وہ کس نظریے اور زاویے سے قرآن پر نظر رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص محض اپنے علم میں اضافہ کرکے منبر یا سٹیج پر اپنی علمی قوت کا مظاہرہ چاہتا ہے تو ایسے قاری کو حاضرین اور سامعین سے داد تو مل جائے گی مگر ایسا عالم قرآن کی روحانی قوت اور مشائدات سے فیض یاب نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو پیر، فقیر، صوفی سنت اور عامل بنا کر عوام الناس سے فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی کچھ نہ کچھ حصہ مل جاتا ہے۔ مگر ایسے شعبدہ بازوں کو قرآن کے حقیقی علم سے رہنمائی نہیں ملتی۔ اسی طرح وہ لوگ جو دین اسلام پر کاربند نہیں ہوتے مگر قرآن سے صرف اتنی رہنمائی کے خواہاں ہوتے ہیں جن سے ان کی قلبی تسکین یا ظاہری نشوو ارتقاء کا حصول ممکن ہو سکے تو اُن کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال مہاتما گاندھی ہیں جو سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کے علاوہ قرآن کی چیدہ چیدہ آیات کے عامل تھے جس سے انہیں پرسکون نیند آتی اور سخن وبیان کی قوت میسر ہوتی۔ بظاہر کمزور جسم کے حامل باپو میں پھرتی اور بھرپور مردانہ قوت کمال درجے کی تھی۔ علاوہ اس کے مہاتما گاندھی کو قرآنی آیات مبارکہ سے بیشمار جسمانی اور مادی فوائد تھے جن کا کتابوں میں ذکر نہیں۔
کیا اسی کا نام قرآن فہمی ہے۔ میں نے پوچھا۔
نہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

مگر تم قرآن فہمی کی بات کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

اس کا مکمل اور مدلل جواب ناممکن ہے۔ آج کے دور میں صرف ایک ولی اکمل ہی اس کا جواب دے سکتا ہے اور ایسے شخص تک رسائی ممکن نہیں۔

حضرت عائشہؓ سے ایک حدیث نبویﷺ منقول ہے کہ اگر قرآن انسانی شکل میں نازل ہوتا تو وہ آپﷺ کی صورت میں ہی ہوتا۔ اس حدیث کی روشنی میں قرآن فہمی کے لیے سیرت نبیﷺ کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ضروری ہے تا کہ قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آسانی ہو۔

اگر کوئی شخص محض قرآنی فوائد کی آرزو رکھتا ہو تو ایسے شخص کے لئے قرآن کا ہر ہر لفظ اکسیر ہے۔

وادی کشمیر کے علاقہ کپواڑہ میں جناب محمد امین اویسیؒ ہوگزرے ہیں۔ ان کے ہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندو پنڈت، عیسائی راہب اور دوسرے مذاہب کے لوگ اکثر حاضری دیتے اور اپنے دنیاوی مسائل کا حل پوچھتے۔ آپ مسلمانوں کو درود اویسی کثرت سے پڑھنے کی تلقین کرتے جبکہ غیر مسلموں کو ھا،ھو،ھی پڑھنے اور مراقبے میں اپنے اپنے مسائل پر توجہ رکھنے کا عمل بتاتے۔

تمہیں پتہ ہے یہ ھا،ھو،ھی کیا ہے؟ نینا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

یہ کلمہ طیبہ کا مخفف ہے۔

درود پاک کا عمل بھی قرآن فہمی میں معاون ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ عامل کو رزق حلال اور تزکیہ نفس میسر ہو۔ درحقیقت رزق حلال ہی تزکیہ نفس کی کنجی ہے۔ پیغمبر بھی تزکیہ نفس، کتاب کے علم اور حکمت کا درس دینے آئے۔ حضرت آدمؑ سے لیکر نبی آخر الزمانﷺ تک جتنے نبی اور رسول آئے سبھی قرآنی علوم کا درس دیتے رہے۔ ہر نبی اور رسول کو ضرورت کے مطابق علوم سیکھلائے گے جو قرآن ہی کا حصہ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان علوم سے لوگوں نے انحراف کیا، اپنے خیالات اور مادی فوائد کے لئے الٰہی کلام اور علم سے دور ہوئے تو اللہ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے ان ہی میں سے اپنے منتخب بندوں کو مبعوث کیا تا کہ انسان کی رہنمائی کے لئے علوم وضوابط کا پھر سے اجراٗ ہوسکے۔ تاریخ شائد ہے کہ ایک ہی دور میں دو دو

اور چار چار یا اس سے بھی زیادہ نبی اور رسول ہوئے مگر ان کا مقصد اور مشن ایک ہی تھا۔قرآن بھلائی، احسان، عدل و مساوات اور نیکی کا درس دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔ نیکی، احسان، عدل اور بھلائی جہاں بھی ہے اور جس شکل وصورت میں ہے وہ قرآن ہی کا راستہ ہے جبکہ برائی، ظلم، بے انصافی اور جبر جہاں بھی ہے اور جس شکل وصورت میں ہے وہ قرآن کی ضد اور اللہ کے حکم سے بغاوت ہے۔جس طرح اقوام اور اشخاص نے اپنی سہولت کے لئے قرآنی علوم کو سمجھا اور انہیں اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں پر نافذ کر کے فوائد حاصل کیئے اسی طرح کچھ لوگوں نے اپنی روحانی زندگیوں میں بھی ترقی اور عروج حاصل کیا۔روحانی فوائد حاصل کرنے والوں کی بھی دو اقسام ہیں۔ایک وہ جنہیں تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ سیرت پاک ﷺ کو سمجھنے کا شرف حاصل ہوا اور ان کے لیے قرآن فہمی کا حصول بھی آسان ہوگیا۔دوسرے وہ جنہوں نے تزکیہ نفس کو ایک مشق کے طور پر اپنایا اور ناسوتی علوم سے مادی فوائد تک ہی اپنی ذات کو محدود کر کے روائتی پیر، فقیر، سادھو، سنت بن کر دنیا کے خزانے اکھٹے کر لئے۔ ایسے گدی نشینوں، پیروں، فقیروں، مخدوموں، سادھوں، صاحبزادوں، سنتوں اور صوفیوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ ہر مذہب، فرقے اور طبقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں فیتھ ھیلر کہا جاتا ہے۔کوئی پھونکیں مارتا ہے، کوئی پانی دم کرتا ہے، کوئی تعویز دیتا ہے اور کسی کے در کی خاک اور راکھ کھائی اور جسم پر ملی جاتی ہے۔کسی کے باپ دادا کی قبر پر کنواریاں اور ناریاں اپنے پلو سے جھاڑو دیتی ہیں اور کچھ تنہائیوں میں ملتی اور دعائیں لیتی ہیں۔

میں تمہیں ایک پیر کا قصہ سناؤں۔

نینا نے کہا۔

سناؤ میں نے جواب دیا۔

چھوڑو شرم آتی ہے۔نینا نے شرماتے ہوئے کہا۔

چلو چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے یا پیر صاحب کو۔۔نینا نے مسکرا کر کہا۔

کیوں پیر کے قصے کی ہیروئن تم ہو۔

ہاں میں ہی ہوں نینا نے شرماتے ہوئے کہا۔

پھر تمہاری مرضی میں نے کہا۔

سن ہی لو ورنہ تجسس رہے گا۔ خیر چھوڑو۔ پھر سہی۔۔۔۔۔

ہم قرآن فہمی کی بات کر رہے تھے۔ نینا اپنے موضوع پر لوٹ آئی۔

دراصل قرآن اپنے قاری سے ہمکلام ہوتا ہے۔ قاری جو چاہتا ہے قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ جو جس مقصد کے لئے پڑھتا ہے اسے اس کا جواب ملتا ہے۔ جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے قرآن اسے اس سے بڑھ کر عطا کرتا ہے۔

قرآن میں حضرت آدمؑ سے لیکر آخری نبی ﷺ کی وہ سب دعائیں بیان کیں جو خدا نے انہیں سیکھلائیں اور رسولوں اور نبیوں نے انہیں اپنا وظیفہ بنایا۔ قرآن نے انسان کو کائنات میں اس کا مقام بتایا اور وجہ تخلیق کائنات کو بھی بیان کیا۔ قرآن نے انسان کو اس کی عظمت اور بڑائی کا احساس دلایا اور خالق کی پہچان اور بندگی کے طریقے سیکھلائے۔ قرآن نے زندگی کے اصول اور ضابطے ترتیب دیئے اور انسان کی بہتری اور بھلائی کے لئے روشن رائیں متعین کر دیں۔ میں نے مغربی ریاستی نظام اور طریق حکمرانی کا مطالعہ کیا تو مجھے جابجا قرآنی احکامات کی پیروی نظر آئی۔ اگر میں تفصیل بیان کروں تو گفتگو طول پکڑے گی۔ قانون کی حکمرانی ہی سب سے عمدہ اور اعلیٰ مثال ہے۔ یہاں کسی جج کو اپنی سوانح لکھوا کر اپنے کارناموں کی تشہیر کی ضرورت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی ایسا کرے تو اسے بیجا پبلسٹی اور شوخ پن کا مظاہرہ کرنے کے جرم میں عدلیہ سے ہی نکال دیا جائے۔ برطانیہ ہی کو لے لو۔ جس ملک میں ملکہ اور ولی عہد اپنے باورچی اور خانسامے سے مقدمہ ہار جائیں وہاں کسی اور کی کیا مجال کہ وہ اپنی برادری کے پٹواریوں، تحصیلداروں اور تھانیداروں کا سرپرست اعلیٰ اور رشتہ داروں کے مفادات کا محافظ بنا پھرے اور عدل فاروقی کا دعویدار بھی ہو۔

حضرت علیؓ نے کسی یہودی سے قرض لیا تو وقت مقررہ سے پہلے ہی یہودی نے واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ شیر خدا نے وعدہ یاد دلایا تو یہودی مقدمہ خلیفہ وقت عمر فاروقؓ کی عدالت میں لے گیا۔ خلیفہ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو جج مقرر کیا تو فاتح خیبر اور یہودی عدالت میں حاضر ہوئے۔ یہودی نے مطالبہ دھرایا اور حضرت علیؓ نے مقرر مدت کا حوالہ دیا۔ جج نے گواہ مانگا تو شیر خدا نے اپنے دو بیٹوں حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے نام لیے جس پر جج نے فیصلہ دیا کہ دونوں گواہ آپ کے بیٹے ہیں کسی قریبی عزیز، رشتہ دار اور قرابت دار کی گواہی مشکوک ہے لہٰذا کوئی غیر جانبدار گواہ پیش کریں۔ حضرت علیؓ نے معذرت پیش کی تو جج نے فیصلہ یہودی کے حق میں دے

دیا۔

جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ نینا نے سوال کیا۔

نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

یہودی شیر خدا کے قدموں میں گر گیا اور بولا۔

خدا کی قسم جب تک نبی آخرالزماں ﷺ کے تربیت یافتہ اصحابؓ اور قرآن پر عمل کرنے والے اس دنیا میں ہیں کوئی حق کی آواز دبا نہیں سکتا۔

یہودی نے حضرت علیؓ سے معافی کی درخواست کی اور مسلمان ہو گیا۔

آج اسلامی دنیا میں عدل و انصاف کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ بادشاہت ہو یا جمہوریت یا پھر شخصی حکمرانی یا آمریت۔ سب کے چہرے ایک سے ہیں چونکہ وہ حاکم اور حکومتیں جو اسلام اور اسلامی نظام کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے نام پر عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ پاکستان ہی کو دیکھو۔ مذہبی سیاسی جماعتیں صرف اپنی پارٹی اور پیروکاروں تک محدود ہیں۔ اگر کسی مذہبی سیاسی جماعت کے سامنے کسی ایسے مسلمان یا پاکستانی پر ظلم، زیادتی یا جبر ہو رہا ہو جو ان کی جماعت سے متعلق نہ ہو تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔ میں نے کراچی یونیورسٹی میں پی ایس ایف والوں کو ایم کیو ایم والوں پر لاٹھیاں برساتے اور گولیاں چلاتے اور جمعیت والوں کو تماشہ بنی کرتے دیکھا ہے۔ یہی حال پارٹیوں کی سیاست اور حکمرانی کا ہے۔ جب ایک سیاسی جماعت برسراقتدار آتی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پارٹی کارکنوں اور دوٹروں نے ملک فتح کر لیا ہے اور باقی قوم کو یرغمال یا پھر غلام بنا لیا ہے۔ تھانوں، کچہریوں اور عدالتوں میں اسمبلی ممبروں، سینٹروں، وزیروں، مشیروں اور پارٹی عہدیداروں کے ٹاؤٹ، فرنٹ مین اور پالتو غنڈے جا بیٹھے ہیں اور مخالفین کی بیخ کنی کے لئے عدلیہ اور انتظامیہ کو استعمال کرتے ہیں۔ پولیس علاقہ کے اسمبلی ممبر سے یا پھر اس کے غنڈے سے پوچھ کر ایف آئی آر درج کرتی ہے۔ پٹواری زمینوں کے ریکارڈ تبدیل کرتے ہیں اور جج لکھے لکھائے سکرپٹ پر دستخط کر کے فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ کیا یہی انصاف اور اسلام ہے؟

نہیں۔ میں نے کہا۔

تم نے کبھی راجہ رستم، جسٹس کیانی، جسٹس کارنیلیس اور جسٹس میاں محمد شاہ دین کی تحریریں پڑھی ہیں؟ نینا نے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے جواب دیا۔

کبھی پڑھنا۔ تمہیں پتا چلے گا کہ ایک جج کا کردار اور عمل کیا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے جج بھی ہیں جو دو ڈھائی سال ایڈ ہاک جج رہ کر سات سات کروڑ کے بنگلے بنا لیتے ہیں اور پھر اپنے اعلیٰ کردار، انسان دوستی اور قرآن فہمی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے کرائے کے دانشور رکھ لیتے ہیں۔ جسٹس میاں محمد شاہ دین متحدہ ہندوستان میں پہلے مسلمان تھے جنہیں ہائی کورٹ جو تب چیف کورٹ کہلاتا تھا کا جج بنایا گیا۔ پنجاب چیف کورٹ میں جج بننے سے پہلے آپ کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا تذکرہ کرنے کے لئے ایک کتاب نہیں بلکہ ادارہ چاہئے۔ جسٹس شاہ دین ان اکابرین میں شامل ہیں جنہوں نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی، علمی اور عملی بیداری کے لئے انتھک کوششیں کیں اور انگریز حکمرانوں کو بھی باور کروایا کہ مسلمانوں کے حقوق کو نظرانداز کر کے وہ نہ تو ہندوستان پر طویل عرصہ تک حکومت قائم رکھ سکیں گے اور نہ ہی اسے چھوڑ کر بھاگ سکیں گے۔ جسٹس میاں محمد شاہ دین نے اپنی تحریروں، تقریروں اور مباحث میں مسلمانوں کے لئے عزت و آزادی کا ایسا اسلوب اپنایا جسے علامہ اقبالؒ نے نہ صرف سراہا بلکہ اسے اپنے کلام کا حصہ بھی بنایا۔

جسٹس شاہ دین ارسٹوکریٹک بیک گراؤنڈ کے حامل سچے مسلمان اور عوام الناس کا دکھ اور درد محسوس کرنے والے قانون دان تھے۔ آپ میں نہ تو اپنی خاندانی وجاہت کا فخر تھا اور نہ ہی اپنی علمی قابلیت اور قانون دانی کا تکبر۔ وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ ایک سچا قانون دان وہ ہے جو قانون کو تلوار یا بندوق بنا کر شکار نہ کرے بلکہ اسے مرہم بنا کر عام آدمی کے زخموں پر رکھے۔ قانون آسانیاں پیدا کرنے اور ظالم اور غاصب کا ہاتھ روکنے کے لئے ہے نہ کہ مظلوم کو محرومی اور مایوسی کے سمندر میں دھکیلنے کے لئے۔

میں جب جسٹس شاہ دین کو پڑھتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جسٹس شاہ دین ایک مرشد تھے جو اپنے بعد جسٹس ایم آر کیانی جیسا مرید چھوڑ گئے۔ جیسے جلال الدین رومیؒ کے بعد اقبالؒ۔

کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ نینا نے پوچھا۔

کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔

میں تمہیں ایک واقعہ سناتی ہوں۔

سناؤ۔ میں نے کہا۔

میں ایک ٹیلی ویژن چینل پر نعیم بخاری کا انٹرویو دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے تکبر سے کہہ رہا تھا کہ وہ کبھی بھی اس بوڑھی عورت پر ترس کھا کر اس کا مقدمہ مفت نہیں لڑے گا جو اس کا دامن تھام کر التجا کرے کہ اس کا بیٹا بیگناہ ہے اور ظالم جاگیردار اسے اپنے اثر ورسوخ سے سزائے موت دلوانے کے درپے ہے۔ میں اپنی فیس لیتا ہوں اور کام کرتا ہوں۔ خدا کے لئے وکالت کرنا میرے اصولوں میں شامل نہیں۔

اسی نعیم بخاری نے جب چیف جسٹس آف پاکستان کو خط لکھے اور پاکستان میں عدالتی بحران پیدا ہوا تو مجھے نعیم بخاری کا انٹرویو یاد آ گیا کہ ایسا شخص تو پیسے کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جو شخص بکنے والا ہے۔ جس کے اصول دولت کے تابع ہیں وہ اگر جج بن جائے گا تو کیا نہیں کریگا۔

تم نعیم بخاری کو جسٹس شاہ دین سے کمپیئر کرنا چاہتی ہو؟ میں نے پوچھا۔

ہرگز نہیں۔ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ جسٹس شاہ دین اور ایم آر کیانی کی توہین ہو گی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔

پھر ایسے شخص کی مثال دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے پوچھا۔

مثال اس لئے دی کہ جس قوم کو غلامی کی نیند سے جسٹس شاہ دین جیسے اکابرین نے جگایا اور جن کا مقدمہ اقبالؒ اور ایم آر کیانی جیسے قانون دانوں نے لڑا وہ آج نعیم بخاری جیسے کرداروں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ کل کلاں کوئی دانشور چند سکوں کے عوض "انصاف کے سفر" کی طرز پر بخاری نامہ، پرویزی عہد، اصول زرداری، ڈوگر نامہ، چوہدرانہ چالیں، شریفانہ ادوار یا پھر جمہوری خماریاں لکھ کر رہی سہی کسر بھی نکال دے۔ نینا نے جواب دیا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسی کتابیں تو فٹ پاتھوں پر ڈھیروں کے حساب سے پڑی ہیں جنہیں کوئی خریدتا تو کیا۔ دیکھتا بھی نہیں۔ ''ماڈل ٹاؤن کا بیٹا'' چوہدریوں کی چالیں، فرزند راولپنڈی جیسے نسخے اب ردی والے بھی نہیں خریدتے۔ یہی حال جرنیلوں کی لکھی کتابوں کا ہے۔ جہانگیر بدر اپنے ہر ٹیلی ویژن انٹرویو میں اپنی تصانیف کا ذکر کرتا ہے مگر کسی اچھے بک سٹال پر اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ تقریباً یہی حال ''چاہ یوسف سے صدا'' اور ''ان دی لائن آف فائر'' کا ہے۔

دیکھو نینا جب کوئی شخص اپنے متعلق کچھ لکھتا ہے تو اس کا کردار و عمل اس کی تحریر کا پہلا ردعمل

ہوتا ہے۔تنزک بابری،تزک تیموری، اس لئے نہیں پڑھی جاتیں کہ ان میں بابر اور تیمور کی فتوحات سے قاری دل بہلاتا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خامیاں،انسانی جبلی اورفطری کمزوریوں کے ساتھ ساتھ معاشرے، ماحول، جغرافیائی حالات کے علاوہ اپنے مخالفین کی ان کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے جوان کی فتح کا موجب بنیں۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔میں بھی اس پر کچھ کہنے والی تھی کہ تم نے میرے ہی الفاظ کواپنے انداز میں بیان کیا۔

کیا میں بتاسکتی ہوں کہ مستقبل میں ایسے علمی کا رہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے تو ان کتابوں کے مصنفین کون ہونگے ؟

بتاؤ۔اس میں حرج ہی کیا ہے۔مگر مجھے قوی امید ہے کہ رؤف کلاسرا،حامد میر، سہیل وڑائچ، انصارعباسی،ندیم ملک بھی ایسا ہی کریں گے۔

شائد۔نینا نے کہا۔

سہیل وڑائچ ''میاؤں کی مرضی''۔ندیم ملک ''عظیم سیاستدان''اور حامد میر''امن کی بھاشا" لکھ سکتے ہیں؟

تم کیا گیس (Guess) کرنے والی تھی؟میں نے پوچھا۔

بخاری نامہ نعیم بخاری خود ہی لکھے تو بہتر ہوگا ورنہ جس نے بھی لکھا اس کا حشر وہی ہوگا جو نعیم بخاری کا راولپنڈی کی عدالت میں ہوا۔ پرویزی عہد بیرسٹر سیف سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ ویسے ڈاکٹر شیر افگن بھی آخری عمر میں ایک شاہکار تخلیق کر سکتے ہیں۔اصول زرداری لکھنے کے لئے مطلوب وڑائچ یا اطہرعباس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ اس وقت تک زرداری صاحب برسراقتدار ہیں۔

ڈوگر نامہ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں چونکہ ججوں کا عدالتی رویہ، مال دولت،کوٹھیاں، بنگلے، بچوں کا شاہانہ اورمتکبرانہ لائف سٹائل، زرعی فارم، دوست یار، ہم نوالہ و ہم پیالہ ٹولے اور ٹولیاں اورسب سے بڑھ کر عدالتی فیصلے ہرلحہ ان کی زندگیوں کا نوحہ پڑھتے ہیں۔جج کوتو اپنی سوانح حیات لکھنے یالکھوانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔اس کی قبر کی خاک اورقبر کے اندر پڑی ہڈیاں بھی بولتی ہیں کہ دیکھو یہ وہ عظیم شخص ہے جوعدل کا ترازوں تھامے تمہاری دنیا سے رخصت ہوا۔اس نے بادشاہوں کے سر جھکائے اورغلاموں کے سر پر تاج رکھے۔اس نے اقربأپروری

اور برادری ازم کی لعنت سے کنارہ کشی کی اور عدل کی تلوار سے ظلم، جبر، بربریت، کرپشن، دھونس، دھاندلی اور برائی کے بدبودار بتوں کو پاش پاش کیا۔

یہ تو ایک طبقے کی بات ہے جبکہ ایک ٹولہ ایسا بھی ہے جن کے چہروں پر لعنت اور قبروں پر قہر کی بارش برستی ہے۔ جج دنیا کے کسی بھی ملک میں ہو، کسی بھی مذہب و دین کا ماننے والا ہو، کسی بھی رنگ و نسل اور قوم سے تعلق رکھتا ہو اس کا عدالتی رویہ اور فیصلہ ہر روز دنیا کی ہر عدالت میں دھرایا اور سنایا جاتا ہے۔ برطانیہ کا وہ گورا جج جس نے ملکہ اور ولی عہد کے خلاف فیصلہ دیا، بھارت کا وہ سکھ جج جس نے اندرا گاندھی کے خلاف نہ صرف فیصلہ دیا بلکہ سزا بھی دی اور پھر بھارت کا ہی وہ جج جس نے نرسمہاراؤ کو جیل کی ہوا لگوائی یہ سب نہ مسلمان تھے اور نہ ہی پاکستانی مگر ان کے فیصلے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کی عدالتوں میں کوٹ (Quote) کیے جاتے ہیں۔

کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی بداعمالیوں اور بددیانتوں کو چھپانے کیلئے کتابیں لکھواتے ہیں مگر اس عمل سے ان کے چہروں پر لگے بدعنوانی، بے حسی اور اقربأ پروری کے بدنما داغ نہیں مٹتے بلکہ ان کے حقیقی کارناموں کے چھپے آثار بھی نمایاں ہوجاتے ہیں۔

تم ڈوگرنامے کا مصنف تجویز کرنے والی تھی؟ میں نے کہا۔

ہاں۔ ڈوگرنامہ یقیناً ایک اچھی کتاب ہوگی تاکہ آئندہ نسلوں کو پتہ چلے کہ ہمارے ملک میں عدل کا کیا حشر ہوتا رہا۔ اس کتاب کیلئے بھی ایک پینل موجود ہے جو شریف الدین پیرزادہ یا پھر ملک قیوم کی سربراہی میں کام کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر بابر اعوان، فاروق نائیک، نعیم بخاری، محمد علی سیف سمیت درجنوں قانون دان اس پروجیکٹ کے لئے دستیاب ہیں۔ اب پینل کے سربراہ پر منحصر ہے کہ وہ کتاب کی ضغامت اور ابواب کی طوالت کے مدنظر کتنے دانشوروں سے فیض یاب ہوتا ہے۔

چوہدریوں اور شریفوں کو کسی پینل کی ضرورت نہیں۔ وسیم سجاد، مشاہد حسین، احسن اقبال اور صدیق الفاروق جیسے سدابہار دانشور دونوں گھرانوں کو ہمہ وقت میسر ہیں۔ کسی بھی کتاب کے انگریزی ایڈیشن کیلئے ہمایوں گوہر اور حسین حقانی با معاوضہ کسی بھی پارٹی، شخصیت، برادری اور گھرانے کو دستیاب ہوسکتے ہیں۔ حقانی اور گوہر کا فائدہ یہ بھی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کا بڑے سے بڑا پبلشر ان کا مواد نہ صرف شائع کرتا ہے بلکہ مارکیٹنگ کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔

نینا ہم کہاں سے چلے تھے؟ میں نے پوچھا۔

ہم یا میں؟ نینا نے کہا۔

میرے سفر کی ابتدا تو تیرہ ویلی سے ہوئی تھی جہاں میرے آباواجداد نے مٹی کے گھر بنائے اوران کے بچوں نے مزار شریف، کابل، قندہار اور ہرات کی گلیوں اور بازاروں میں مزدوریاں کیں، پھیریاں لگائیں اور تھڑوں پر دکانیں سجائیں۔ جلال آباد، پشاور، لاہور، دلی، ممبئی میں کاروبار کئے مگر گھوم پھر کر واپس تیرہ کی ندیوں کے گیت سننے لوٹ آئے۔ زمانہ بدلا، موسم بدلے تو ہواؤں کے رخ بھی بدل گئے۔ لمحوں کے پر نکل آئے، ساعتیں ڈاروں میں بدل گئیں اور اُڑ گئیں مگر کوہ سفید کی ڈھلوانوں اور گھاٹیوں میں بسنے والے نہ بدلے۔ دنیا سکڑنے لگی، لمحے سمٹنے لگے، لالچ بڑھنے لگی تو نئی سمتوں، نئی راہوں اور نئے لوگوں نے نت نئے رشتے قائم کر لئے۔

پستے، بادام، چلغوزے، اخروٹ، سیب، انار، شہتوت، خوبانیاں، پٹو، نمدے، خشک چمڑا، قالین، خرود، لانی، چربی اور ھینگ مصالہ بیچنے والوں نے چرس، افیون، ہیروئن، اور روسی رائفلیں بیچنے اور خریدنے کے ہنر سیکھ لئے۔ سنگاپور، ٹوکیو، ہانگ کانگ سے ٹرونٹو اور وینکوور تک اپنے مال کی منڈیاں تلاش کر لیں۔ سادگی، سچائی اور حیا کے پردے ایسے اٹھے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

نصف صدی پہلے کی بات ہے جب بوڑھے سکھ نے ہندوکش سے آنے والی یخ ہواؤں کی سرگوشیاں سن لیں اور اپنے بیٹوں کو وقت کے بہتے دھاروں کے سپرد کر دیا کہ جاؤ اور نئی دنیا کی بھیڑ میں اپنے وجود کی سچائی کو برقرار رکھنے کی جستجو کرو۔ ہر کسی نے اپنی اپنی رہ لی مگر دھرتی سے رشتہ نہ ٹوٹا اور نہ ہی ٹوٹنے والا ہے۔ چونکہ یہ ایک سچے سکھ کی پہچان ہے۔

سمجھا نہیں۔ میں نے کہا۔

کبھی خشونت سنگھ کو پڑھا ہے؟ نینا نے پوچھا۔

نہیں۔

خشونت سنگھ ہے تو سکھ مگر سکھوں کا پسندیدہ سکھ نہیں۔ خشونت نے سکھ دھرم کے لئے بڑا کام کیا۔ بہت سی کتابیں لکھیں، لیکچر دیئے اور گرنتھ صاحب کے ترجمے کیے۔ خشونت سنگھ میرے پسندیدہ لکھنے والوں میں سے ایک ہے۔ خشونت میں بہت سی خامیاں ہونگی جو ہر کسی میں ہوتی

ہیں مگر اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔

مثلاً میں نے پوچھا۔

خشونت اپنی مٹی سے پیار کرتا ہے۔ وہ کئی بار اپنے گاؤں بھی گیا۔ اسے جہلم کے لوگوں سے پیار ہے۔ خشونت تعصب اور تکبر سے مبرا تو نہیں مگر اس کے خمیر میں ان مضرات کی مقدار دوسروں کی نسبت کم ہے۔ وہ بلکل سلفش اور کینہ پرور نہیں اس کے اندر کا انسان زندہ ہے اور انسانوں کے دکھ درد محسوس کرتا ہے۔

تم خشونت سے ملی ہو؟ میں نے کہا۔

نہیں۔ اسے دیکھا اور سنا ہے۔ اس کی کتابیں پڑھی ہیں اور اس کے مخالفین سے ملی ہوں۔

جب آپ کسی کے مخالفین سے ملکر کوئی رائے قائم کریں تو آپ کی رائے درست ہوتی ہے۔

وہ کیسے؟

دیکھو۔ نینا نے کہا۔ جب مخالفین کسی نقطے پر پہنچیں اور اپنے مدمقابل کی نوے خامیوں اور دس خوبیوں کا اعتراف کر لیں تو آپ اپنی رائے دس خوبیوں پر قائم کر کے نوے خامیوں کا ازسرنو جائزہ لیں تو آپ مزید دس خوبیاں تلاشنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آپ تجزیہ نگاروں یعنی مخالفین کے کردار، علم، تدبر اور تفکر کا جائزہ لیکر انہیں متذکر کی باقی خامیاں پر کھیں تو آپ کو مزید تیس خوبیاں مل جائینگی جو ایک متوازن شخصیت کے تدبر کے لئے کافی ہیں۔

کوئی بھی شخص سو فیصد درست نہیں ہوتا۔ آپ دینی، الہامی، آسمانی کتابوں، ویدوں، اشلوکوں اور آیات کا مطالعہ کریں تو بات واضح ہے کہ اللہ نے اپنے نبیوں، رسولوں اور نیک بندوں پر سخت پابندیاں عائد کیں، انہیں بار بار تاکید اور تنبع کی اور جہاں لغزش ہوئی سخت پکڑ بھی ہوئی۔ اگر ربّ کے برگزیدہ بندوں اور مخصوص ہستیوں کی زندگیوں کو خود خالق کائنات نے ایک ضابطے کے تحت رکھا اور انہیں عام انسانوں کی نسبت سخت سے سخت قوانین کا سامنا کرنا پڑا تو ایک سطحی علم کا حامل شخص اپنے جیسے دوسرے شخص کی تعریف و توصیف میں الٰہی حدود کو پھلانک کر اسے فرشتہ صفت کیسے ثابت کر سکتا ہے۔

تم خشونت کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

ہاں۔ میں کہہ رہی تھی کہ خشونت کی گڈلک ہے کہ اس کی تحریریں ہر کوئی پڑھتا ہے مگر اسے شاباش کم ہی ملتی ہے۔ میں بھی خشونت کو پڑھتی ہوں اور کبھی کبھی اس سے متفق بھی ہوتی ہوں۔

میرے نزدیک اس کی سب سے اچھی بات وطن پرستی ہے۔

اس کا وطن تو بھارت ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں۔ وہ بھارت میں رہتا ہے جیسے بہت سے لوگ یعنی بھارتی پاکستان میں بھی رہتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے ہم لوگ یہاں برطانیہ میں رہتے ہیں۔

میں سمجھا نہیں۔ میں نے پوچھا۔۔

آسان اور سادہ سی بات ہے۔ نینا بولی۔

انسان جس مٹی میں پیدا ہوتا ہے وہی اس کا اصلی اور حقیقی وطن ہوتا ہے۔ وہ جہاں رہے مٹی اسے پکارتی ہے اور اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں سیاسی، سماجی اور معاشی مجبوریوں کی بات نہیں کرتی۔ پیغمبر اسلام ﷺ جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہے تھے تو بار بار پیچھے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے "اے شہر مکہ تو کتنا عظیم ہے۔ مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے پیار ہے مگر تمہارے ظالم باسی مجھے تم سے جدا کر رہے ہیں" حضرت یوسفؑ مصر کے بادشاہ بن گئے مگر کنعان کو نہ بھولے۔ دیکھو یہ انسان کی فطرت ہے۔ افغان کوچی صرف بہار کے موسم میں اپنے وطن میں جاتے ہیں جس کا دورانیہ تین ماہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی حال بلوچوں کا ہے۔ قلات کے جنوبی اضلاع کے لوگ گرمیوں میں کوہ کرتھر سے ہوتے ہوئے سندھ کے اضلاع شہداد پور اور قمبر کی طرف ہجرت کرتے ہیں مگر اپنی مٹی سے جدا نہیں ہوتے۔

تم خشونت کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

ہاں۔ میں کہہ رہی تھی کہ میں خشونت کی کئی باتوں سے متفق نہیں۔ خشونت کے مطابق گولڈن ٹمپل کا سانحہ سکھوں کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے اور وہ اس بات کی تبلیغ بھی کرتا ہے کہ سکھ قوم اس حادثہ کو بھول جائے۔ خشونت نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ اس نے آنجہانی اندرا گاندھی سے گزارش کی تھی کہ گولڈن ٹمپل کا دورہ کرے اور سکھ قوم سے معافی مانگ لے۔ میرے خیال میں خشونت نے سکھ نفسیات کا مطالعہ نہیں کیا۔ کوئی قوم ایسے حادثات اور واقعات نہیں بھولتی بلکہ ایسے واقعات راکھ میں چنگاری کی طرح سلگتے ہیں اور حالات کی بدلتی ہوائیں انہیں شعلوں میں بدل دیتی ہیں۔

خشونت لکھتا ہے کہ اس نے اندرا گاندھی کو مشورہ دیا کہ سکھ ایک جذباتی قوم ہے اگر ان سے معذرت کی جائے تو ان کے جذبات ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

مگر تم تو کہہ رہی تھی کہ خشونت ایک بیلنس پرسنلٹی ہے تم نے اسے پچاس نمبر دیکر پاس کر دیا تھا میں نے کہا۔

اس میں شک نہیں۔ جب تک کوئی شخص یہ ثابت نہ کرے کہ وہ ایک مکمل متعصب، کینہ پرور، حاسد، ظالم، جابر اور انسان دشمن ہے وہ اپنی خامیوں کے باوجود ایک بیلنس شخص ہی ہوتا ہے جیسا کہ خشونت بھی ایک بیلنس شخصیت کا حامل مصنف، صحافی، تجزیہ نگار، ناول نگار اور پتہ نہیں اور کیا کیا ہے مگر عقل کل نہیں۔ سکھ دنیا میں جہاں بھی تھے انہیں اپنے مقدس اور متبرک مقام کی بے حرمتی پر دکھ ہوا اور ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں احتجاج بھی کیا۔ خشونت سنگھ نے حکومت کی طرف سے دیئے گئے اعزازات واپس کیے اور بھارت کے سکھ صدر گیانی ذیل سنگھ کو بھی استعفیٰ دینے کو کہا مگر گیانی جی نے خشونت کا مشورہ نہ مانا۔

یقیناً یہ ایک بڑا اور دلیرانہ قدم تھا مگر وہ پھر بھی سکھ قوم میں اپنا مقام اور مرتبہ نہیں بنا سکا۔ میں نے نینا سے پوچھا۔

مقام اور مرتبہ بنانے کے لئے عالم، مصنف، صحافی یا کوئی عہدیدار ہونا ضروری نہیں۔ پنڈت نہرو چین کے خلاف جنگ ہار گیا اور اندرا گاندھی نے پاکستان کو دولخت کیا مگر دونوں کے مقام اور مرتبے میں فرق ہے۔ پنڈت نہرو آج بھی قومی ہیرو ہے جبکہ اندرا گاندھی کو پاکستان کے خلاف جنگ جیتنے کے باوجود اعلیٰ مقام نہیں ملا۔ گولڈن ٹمپل، ایمرجنسی اور بیٹوں کے اسکینڈل تاریخ کا حصہ ہیں جسے اب کوئی مٹا نہیں سکتا۔ جدید جرمنی کا بانی جوزف مزینی ایک عام آدمی تھا۔ آج کے دور میں جو مقام ایران کے احمدی نژاد نے اپنی قوم کی نظروں میں بنایا وہ شاہ ایران کو نصیب نہیں ہوا۔ فرانس کے چارلس ڈیگال، انگلینڈ کے چرچل، امریکہ کے جان آدم اور ابراہام لنکن، جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا، مصر کے جمال عبدالناصر، سعودی عرب کے شاہ فیصل، ترکی کے مصطفےٰ کمال، افغانستان کے امان اللہ خان، پاکستان کے قائداعظم محمد علی جناح، چین کے چواین لائی اور ماؤزے تنگ، ملائیشیا کے مہاتیر محمد اور موجودہ روس کے ولاڈی میر پوٹن اور ترکی کے طیب اردگان نے اپنی اپنی قوموں میں جو مقام اور مراتب حاصل کیے ان کی وجوہات الگ الگ سہی مگر بنیاد ایک ہی ہے۔

بنیاد سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں نے کہا۔

بنیاد سے مراد نصب العین کے اصولوں کی پیروی اور حصول منزل۔ نینا نے جواب دیا۔

یہاں خشونت سنگھ کیسے فٹ ہوتا ہے؟ میں نے پھر سوال کیا۔

خشونت سنگھ نہیں بلکہ ایک دانشور فٹ ہوتا ہے۔

خشونت نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ اس نے قلم اور علم کے ذریعے سکھ قوم کی خدمت کی جبکہ میرے اور دیگر سکھوں کے نزدیک یہ کوئی خدمت نہیں۔ اگر کوئی شخص اچھی عربی اور انگریزی جانتا ہو اور وہ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کا معاوضہ حاصل کر لے تو یہ دین کی اور مسلمانوں کی خدمت نہیں بلکہ بزنس ہے۔

تو پھر خدمت کیا ہے؟ میں نے کہا۔

جیسے نذر الاسلام اور علامہ اقبال نے مسلمانوں کی خدمت کی، ٹیگور نے ہندوؤں کی خدمت کی اور تھامس جیفرسن نے امریکیوں کی خدمت کی۔ قومی اور ملی نصب العین کا تعین جذباتی اور سطحی سیاست نہیں بلکہ فکری سوچ اور تخلیقی عمل کرتا ہے جس کا بنیادی نقطہ صاحب فکر کی شخصیت اور کردار ہوتا ہے۔

مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام ایک نصب العین کی بہترین تشریح اور بنیادی اصولوں کی بہترین مثال ہے۔ حضور ﷺ نے انسانی حقوق اور بنیادی ضروریات کے آفاقی اصولوں کے تحت مدینہ میں بسنے والے دو عرب اور تین یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدہ کیا اس کا بنیادی نقطہ امن، مساوات، بھائی چارہ، انسانی ہمدردی، ایثار و قربانی تھا۔ چونکہ اس ریاست کے قیام کا نصب العین انسانی فلاح تھا اور خلوص و ایثار ہی اس کی روح تھی جس کی بنیاد پر یہ ریاست چند ہی سالوں میں نہ صرف سارے عرب بلکہ ایران اور روم کی سرحدوں تک پھیل گئی۔ اسلامی ریاست کے قیام نے انسان دوستی اور مساوات کی نئی راہیں استوار کیں جو انسانی فطری ضروریات کے عین مطابق تھیں۔ گو کہ بعد کے زمانے میں مسلمان بادشاہوں، امیروں اور حکمرانوں نے اس نصب العین سے انحراف کیا اور ایک مثالی فلاحی ریاست کے قیام سے قاصر رہے مگر دنیا بھر میں ان اصولوں پر جس نے بھی عمل کیا اسے دوام حاصل ہوا۔

مدینہ کی اسلامی ریاست انسانی معاشرتی اور ریاستی تاریخ میں ایک انقلابی حیثیت کی حامل ہے جس کی حدیں ایک مختصر عرصہ میں چین سے افریقہ اور مشرقی یورپ تک پھیل گئیں۔ انسانی تاریخ کی یہ پہلی ریاست تھی جہاں حکمرانوں کی معاشرتی اور معاشی حیثیت ایک عام انسان جیسی تھی اور قانون سب کے لئے یکساں تھا۔ حکمران رعایا کے سامنے جواب دہ تھے اور کسی شخص کو

بلحاظ عہدہ اور مرتبہ کسی دوسرے شخص کا استحصال کرنے کی جرأت نہ تھی۔ انسانی تاریخ کا دوسرا بڑا انقلاب روس میں آیا جس کا نصب العین بھی معاشی مساوات تھا مگر اس نصب العین کے بنیادی اصول، امن، مساوات، بھائی چارے، انسانی ہمدردی اور ایثار و قربانی سے مبرا تھے۔ ایک جابر اور استحصالی طبقے نے وطنیت اور معاشی مساوات کا نعرہ لگا کر معاشرے اور ریاست پر مکمل کنٹرول حاصل کر کے انسانی فطرت کے منافی ایک ایسا نظام نافذ کیا جس نے معاشرے کے ہر فرد سے اس کی آزادی چھین لی۔ لاکھوں انسانوں کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا اور جبری مشقت کو اجتماعی زراعت کا نام دیکر لاکھوں انسانوں کو فاقہ کشی پر مجبور کیا گیا۔

روسی انقلاب کی کہانی جس قدر طویل اور خوفناک ہے اتنی ہی عبرت ناک بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس نظام کے پیامبر اور داعی کارل مارکس اور اینگل تب تک زندہ رہتے تو لینن اور سٹالن اگر انھیں ڈیتھ سکواڈ کے سامنے کھڑا نہ کرتے تو سائبریا کہ جبری مشقت کیمپوں میں ضرور بھیج دیتے۔ سٹالن نے لینن کے قریبی ساتھیوں اور عظیم انقلاب کے بانیوں کو چن چن کر سزائیں دیں اور عظیم انقلاب کے تقریباً سبھی ہیروز اور جیالوں پر قتل، غداری اور جرمنی، جاپان اور برطانیہ کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ تعلقات اور جاسوسی کا الزام لگا کر انہیں گولیوں سے اڑا دیا۔ دوسری جنگ عظیم روسی قوم اور لیڈروں کے لئے رحمت خداوندی ثابت ہوئی اور جنگ کی طرف دھیان نے جبری مہاجرت، جھوٹے اور من گھڑت مقدمات اور ڈیتھ سکواڈ کے ہاتھوں سیاستدانوں، جرنیلوں، صحافیوں اور اعلیٰ عہدیداروں سے لے کر عام لوگوں کے قتل اور مضحکہ خیز ٹرائیل کا سلسلہ کچھ کم کر دیا۔ تاریخ کے اوراق بتلاتے ہیں کہ وہ لیڈر، اعلیٰ عہدیدار، جج، وکیل اور خفیہ اداروں کے سرکردہ اور حکومت کے انتہائی قریبی اہلکار جو ایک ٹرائیل کو نتیجہ خیز بنانے میں سردھڑ کی بازی لگاتے اور مجرموں کو ڈیتھ سکاڈ کے سامنے لا کھڑا کرتے وہ دوسرے ٹرائیل میں مجرموں، غداروں اور وطن فروشوں کے روپ میں اسی کٹہرے میں کھڑے اپنی موت کا فیصلہ سننے کے منتظر ہوتے۔ انقلاب فرانس اور موجودہ دور میں ایران کا اسلامی انقلاب بھی انسانی خون کے دریاؤں سے سیراب ہوا اور اس انقلاب کے علمبردار اپنوں ہی کے ہاتھوں نشان عبرت بنے۔

ہم خشونت کی بات کر رہے تھے۔ میں نے نینا کی توجہ اس طرف مبذول کرواتے ہوئے کہا۔

میں بھی اسی طرف آ رہی تھی۔ نینا نے جواب دیا۔

قوم کی خدمت دینی اور روحانی کتب کے تراجم، لیکچروں اور سیمیناروں اور حکومت کے عطا کردہ تمغے اور سندیں واپس کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کا خاصا اور سلیقہ کچھ اور ہوتا ہے۔

خاصے اور سلیقے سے مراد ایک نصب العین اور اسے حاصل کرنے کے لئے اصولوں کا تعین یعنی مقصد کے حصول کے لئے ایک ایسا منصوبہ جو قومی خواہشات سے نہ صرف ہم آہنگ ہو بلکہ اسے پانے کے لئے قوم ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہو۔

میرے نزدیک سکھ قوم کے وقار اور عظمت کا راز حضرت بابا نانک کی زندگی اور تعلیمات کے حقیقی مطالعہ میں پنہاں ہے جس قوم کے پاس ایک کتاب اور رہبر ہو اور وہ اسے چھوڑ کر دیگر خرافات میں الجھ جائے تو اسے حقیقی خوشی اور قومی وقار میسر نہیں ہوتا۔

آج مسلمان دنیا کی آبادی میں ایک بڑا اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ چھپن سے زیادہ ممالک پر ان کی حکومت ہے۔ دنیا کی مجموعی دولت کا پچھتر فیصد ان کی دسترس میں ہے۔ مگر عزت و مقام سرلنکا، بھوٹان، نیپال اور ایتھوپیا سے بھی کمتر ہے۔ پاکستان ہی کو دیکھ لو۔ اس ملک میں کیا نہیں۔ کھیت، کھلیان، صحرا، میدان، پہاڑ، جنگل، دریا، آبادی، چار موسم اور قدرتی خزانے مگر افغانستان جیسے ملک کی بھی برابری نہیں۔ لوگ بجلی مانگتے ہیں، قرض میں ڈوبے جا رہے ہیں، غربت مٹانے کے لئے بہو بیٹیوں کی عزت نیلام کر دیتے ہیں، بچے بیچتے ہیں مگر عزت اور غیرت سے جینے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ کچھ پانی بھارت روک کر اپنے استعمال میں لا رہا ہے اور باقی سمندر میں چلا جاتا ہے مگر ڈیموں کی سیاست میں نام، مقام اور مال بنانے والے سیاستدانوں کا محاسبہ کرنے کی ان میں سکت نہیں۔

ایک افغان کابل سے چیتھڑوں میں ملبوس خربوزوں کے ٹرک پر بیٹھ کر لاہور آتا ہے اور لاہوریوں سے پیسہ چھین کر خان بن جاتا ہے مگر اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ دنیا کا سب سے بڑا سمگلنگ کا قانونی دھندا ہے مگر پاکستانی قوم اس پر خاموش ہے اور امریکہ اس کا ضامن ہے۔ اس دھندے کا نذرانہ بڑے افسروں اور سیاستدانوں کے گھروں تک پہنچتا ہے۔ کوئی ایک مثال ہو تو بیان کروں۔ کسی بھی مسلمان ملک کا کسی دوسرے غیر مسلم ملک سے موازنہ کرو تو تمہیں اسلامی ملک میں ہر طرح کی غیر اسلامی روایات اور اقدار پھلی پھولی نظر آئیگی جبکہ غیر اسلامی ملک میں اسلامی قوانین اور احکامات پر سختی سے عمل ہو رہا ہوگا۔

وجہ۔ میں نے پوچھا۔

کتاب اور قانون سے بغاوت اور غیر کی تقلید۔

سکھ ہوں یا مسلمان یا کوئی دوسری قوم، جب تک الٰہی قوانین کا احترام نہیں ہوگا انہیں عزت و احترام نصیب نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کے پاس ایک الہامی کتاب ہے جسے مسلمان بحیثیت امت بھول گیا ہے اور اپنی مرضی اور پسند کی تشریحات اور تاویلات میں الجھ کر قوموں، قبیلوں اور فرسودہ روایات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ عام آدمی سے لے کر بڑے سے بڑا مفکر اور دانشور بھی اس سے مبرا نہیں۔

آپ کسی بڑے دانشور کا قول پڑھیں اور پھر اس کا عمل دیکھیں تو آپ کے پاس ایسے دانشوروں کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ نہ ہوگا۔ مسلمانوں ہی کو لیجئے۔ **9/11** کے حادثہ کے بعد مسلمان علماً نے اپنی گفتگو کا محور جہاد کو رکھا اور ایک بڑی تعداد میں ان علماء نے جن کی مساجد اور مدارس یورپ اور امریکہ میں ہیں یا وہ ان ممالک میں تبلیغی مراکز اور بزنس سے منسلک ہیں نے جہاد کی یا تو کھل کر مخالفت کی یا پھر دبے الفاظ میں اور لفاظی کے استعمال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آج کے دور میں جہاد فرض نہیں یا پھر فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔

ان علماً اور دانشوروں نے امریکہ کے خوف سے **9/11** کی حقیقت کو جانے بغیر قرآن و حدیث سے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ یہ دور جہاد کا نہیں چونکہ جہاد کا حکم صرف حکمران دے سکتا ہے جبکہ دنیا بھر کے مسلمان حکمرانوں میں سے کسی نے اس کا حکم نہیں دیا۔

مگر نینا۔ کچھ علماء نے اس کی مخالفت بھی کی۔ جہاد، فتنے، دہشت گردی، فرقہ پرستی اور جہالیت پر قرآنی احکامات کی روشنی میں واضح اور دوٹوک فرق بھی بیان کیا۔ یہی نہیں بلکہ موجودہ دور کی اسلامی ریاست اور طریق حکمرانی کو حرف تنقید بنایا اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے اور ظالم قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے حق میں کھل کر اظہار خیال بھی کیا۔ میں نے کہا۔

مگر ایسے علماً اور دانشوروں کی تعداد کم ہے جو حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علماً کی بڑی تعداد جاہ و حشمت اور سیاست گری کے بزنس سے منسلک ہے اور ان کے مفادات ایسے ممالک اور حکمرانوں سے جڑے ہیں جو دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی تشریح اپنے الفاظ میں اور اپنے مفاد میں کرتے ہیں۔ نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔

ہم قرآن فہمی کی بات کر رہے تھے۔

قرآن کریم دیگر الہامی اور آسمانی کتب کا خلاصہ ہے۔ قرآن کریم سے پہلے جتنی کتب و صحائف کا نزول ہوا ان میں دیئے گے الٰہی احکامات کا ذکر قرآن میں ان واقعات، حالات اور حادثات کے بیان کے ساتھ متذکر ہے اور ساتھ ہی ایک وارننگ بھی ہے کہ اللہ نے منکر، منافق، متکبر اور بزدل اقوام پر کس طرح اپنے قہر کا نزول کیا اور انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

اہل مغرب اور ان کے ہمنوا مسلمان علماٗ نے 9/11 کے بعد میڈیا پر جس قدر بیانات دیے، مقالے پڑھے اور مباحث کا حصہ بنے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جہاد ایک حکمران کی مرضی اور حکم تک محدود ہے جبکہ جہاد کی تاریخ انسان کے سن شعور سے ہم آہنگ ہے اور جب سے انسان نے معاشرتی تمدن کو اپنایا جہاد کو بھی ایک الٰہی اور روحانی حکم کے تحت اختیار کیا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

بتلاتی ہوں۔ نینا نے کہا۔

انسان کے سن شعور سے مراد محض کھانے پینے، رہنے سہنے اور خاندانی، قبیلائی، معاشرتی اور ریاستی ذمہ داریوں سے عہدہ براٗ ہونا ہی نہیں بلکہ اچھائی اور برائی کے فرق کے ساتھ عدل و مساوات کے اصولوں کو بھی اپنانا ہے۔

دیکھو۔ جب انسان کو اپنی معاشرتی اور ریاستی زندگی کو برقرار رکھنے کا سلیقہ قدرت نے سیکھلایا تو ساتھ ہی اسے اپنے حقوق کی حفاظت کا شعور بھی دیا تاکہ وہ ظلم و جبر کی نہیں بلکہ عزت اور آزادی کی زندگی جیئے اور اسی شعوری قوت اور بیداری کا نام جہاد ہے۔

جہاد ہمیشہ طاقتور قوتوں کے خلاف کیا جاتا ہے اور شر و فساد ہمیشہ طاقتور، متکبر اور منافق قوتیں ہی بپا کرتی ہیں۔ پاکستان میں برسرپیکار کچھ جہادی تنظیمیں ایسی بھی ہیں جنہیں دنیا کی طاقتور قوتیں اور ممالک سپانسر کرتے ہیں اور ایک منصوبہ بندی کے تحت ان پر اسلام کا لیبل لگایا جاتا ہے تاکہ اسلام اور مسلمان کو بدنام کیا جائے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر علماٗ حق کی ایک جماعت ذاتی مفاد، عیش و آرام اور مسلکی تعصب سے مبرا صرف اور صرف قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کی تھنک ٹینک اور دانشوروں کو جہاد کی اہمیت، ضرورت اور دنیا میں پھیلے شر و فساد میں ان کی حکومتوں اور حکومتی اداروں کے تعصب اور منفی رجحانات کا کھل کر اور حقائق کی روشنی میں ذکر کریں تو کوئی وجہ نہیں

کہ اصل دہشت گردوں اور انہیں مالی امداد دینے والوں کے چہرے ان کی اپنی عوام کے سامنے عیاں نہ ہوں اور یورپ اور امریکہ میں ایک نئی سوچ اور بیداری جنم نہ لے۔

تمہارا مطلب ہے کہ یورپی اور امریکی عوام حقائق سے واقف نہیں۔ میں نے کہا۔

نہیں۔بلکل نہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

ہر ملک اور قوم کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اہل مغرب مشینی زندگیوں کے عادی ہیں جبکہ ان کے حکمران اور اہل دانش انہیں اتنی ہی انفارمیشن مہیا کرتے ہیں جتنی ان کے مفاد میں ہوتی ہے۔ مذہبی تعلیم و تحقیق کا رواج نہیں چونکہ ہر بادشاہ اور عالم نے اپنی اپنی بائبل لکھ رکھی ہے اور فنون لطیفہ کی مدد سے اس کا اظہار ایسے انداز میں کیا گیا ہے کہ عام آدمی کے نزدیک مذہب کی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ مذہبی تعلیمات کا معاشرتی زندگی اور طرز حکمرانی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مذہب فرد کی مادر پدر آزاد زندگیوں پر کوئی حد لگاتا ہے۔ مجھے قومی یقین ہے کہ دین اسلام جس طرح انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور انسانی رشتوں اور تمدن کی رائیں متعین کرتا ہے وہ آج کے یورپ اور امریکہ میں بسنے والے انسانوں کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت ہے۔

انسانی حقوق اور آزادی کی جو تشریح مغربی دانشوروں نے کی اس کا اطلاق دنیا کے دیگر معاشروں پر نہیں ہوتا جبکہ اسلامی طریق زندگی اور انسانی حقوق و آزادی کا جو درس قرآن کریم اور نبی آخر الزماں ﷺ نے اپنے فرامین میں دیا ہے اس کا اطلاق ہر انسان کی زندگی پر ہوتا ہے۔

مغربی اقوام کی معاشرتی اور ریاستی زندگی کا دائرہ انتہائی محدود ہے۔مغربی جمہوری اور عدالتی نظام نے جہاں عوام الناس کو اچھی حکمرانی اور بروقت اور سستا انصاف مہیا کیا ہے وہی انہیں بے فکر، بے حس، بے اثر اور بنجر بھی بنا دیا ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

بہت سے معاملات ہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

ویسے تو ایک طویل لسٹ ہے مگر میں چند ہی مثالیں بیان کرونگی۔

دیکھو۔حکومت نے بہت سے کام اپنے سر لیے ہیں جو کہ ایک اچھی اور ذمہ دار حکومت کا فرض بھی ہے۔تعلیم ہی کو لے لو۔ دینی تعلیم کے فقدان اور جنسیاتی تعلیم کے فروغ نے معاشرتی ماحول پر منفی اثر کیا ہے جس کی وجہ سے مغربی معاشرے کا اہم جز جسے خاندان کہتے ہیں اپنی

حیثیت کھو چکا ہے۔

مغربی دانشوروں، میڈیا اور آزاد معاشرے اور فرد کے علمبرداروں نے انسانی اخلاقی اور روحانی اقدار کو یکسر مسترد کر دیا۔ کھلا کھاؤ، ننگے نہاؤ اور جو چاہو سنو اور سناؤ جیسے اصولوں کا پرچار کر کے تحریر و تقریر کی آزادی کے نئے قوانین مرتب کیے جن کے تابع اہل مغرب میں نئے رجحانات نے جنم لیا جس کی بنیاد دیگر اقوام کے خلاف نفرت اور بے حسی کی اساس پر رکھی گئی۔ مسلمان خواتین کے حجاب ہوں یا سکھوں کی پگڑیاں اور چادریں یا پھر مساجد کے مینار، نفرت انگیز اخباری کالم تبصرے، کارٹوں، کتابیں اور ٹیلی ویژن چینلوں پر ہونے والے مباحث۔ ہر طرف نفرت، حقارت، نسلی برتری، غربت کا مذاق، فتنہ و شر اور تعصب کسی نہ کسی صورت میں عیاں ہے۔ اہل مغرب جتنی دولت اور وسائل منفی رجحانات کی تخلیق اور تبلیغ پر خرچ کرتے ہیں اگر یہی وسائل اور دولت دنیا سے غربت، بیماری اور جہالت کے خاتمے پر خرچ کی جائے تو یہ دنیا حقیقت میں جنت بن جائے۔

امیر اقوام خصوصاً مغربی اقوام کی بے حسی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فلسطین، عراق، کشمیر اور افغانستان میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت پر کسی کو پرواہ نہیں ہوتی بلکہ جارح اور ظالم قوتوں کی دل کھول کر مدد کی جاتی ہے جبکہ یہی اقوام جنگلی جانوروں اور پرندوں کی افزائش نسل اور حفاظت کے لئے کروڑوں ڈالر سالانہ چندہ جمع کرتی ہیں چونکہ جنگلی جانوروں اور پرندوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

مغربی اقوام تعلیم یافتہ، ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ہونے کی تو دعویدار ہیں مگر ان کے کردار اور اقدار پر علم، تہذیب، اخلاقیات اور نئے طبعی حالات کا اثر بلکل نہیں ہوا۔ جدید تعلیم اور ترقی نے مغربی تہذیب کے گرد ایک مصنوعی خول چڑھا دیا جبکہ تہذیب ایک عام کرنے اور پھیلانے والی چیز ہے جس سے متاثر ہو کر دیگر اقوام بھی اس سے فیض حاصل کر سکیں۔ چونکہ مغربی تہذیب کا دائرہ صرف کلبوں، شراب خانوں، ناچ گانوں، بے لباس ساحلوں اور دیگر غیر فطری رجحانات و میلانات تک محدود ہے اس لئے کوئی دوسری قوم چاہے کتنی ہی غریب اور بے بس کیوں نہ ہو ایسی تہذیب کے اثرات قبول نہیں کر سکتی۔

جدید تعلیم، سائنسی ترقی اور شخصی آزادی کے باوجود اگر اہل مغرب کا نفسیاتی، علمی اور عقلی تجزیہ کیا جائے تو یہ لوگ انتہائی بے خبر ہیں۔ یہ بے خبری ایک سنجیدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے تا کہ

عوام الناس دیگر مذاہب، تہذیب، اخلاقیات اور اقدار سے واقفیت حاصل نہ کر سکیں۔ مغربی تھنک ٹینک اور اہل علم وقلم نے غیر یورپی اقوام خصوصاً مسلمانوں کو ان کی دینی اقدار اور روحانی اساس کی بنیاد پر دہشت گرد، بنیاد پرست، ہٹ دھرم اور جدید رجحانات کا دشمن بنا کر پیش کیا ہے تاکہ اہل مغرب اپنی پر آسائش زندگیوں اور سہولیات کے چھن جانے کے خوف کی وجہ سے ہر من گھڑت قصے اور کہانی پر یقین کر لیں اور میڈیا کے ذریعے پھیلائے گئے زہریلے پروپیگنڈے پر عمل پیرا ہو کر لکیر کے فقیر بنے رہیں۔

میرے خیال میں کنویں کے مینڈک بنے رہیں۔ میں نے کہا۔

ایک ہی بات ہے۔ نینا نے جواب دیا۔ تم بھیڑ چال بھی کہہ سکتے ہو۔

جس قصے پر فن لینڈ والے یقین کر لیں وہ امریکنوں کو بھی قبول ہوتا ہے چونکہ سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان لوگوں کو قرآن اور اسلام کا حقیقی چہرہ دکھلایا جائے کہ قرآن صرف مسلمانوں کی پرسنل گائیڈ بک نہیں اور نہ ہی اسلام کسی خاص ملک و قوم اور فرقے کا پرائیویٹ بزنس ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مسلمان مبلغین نے دین کو اپنے فرقوں تک محدود کر لیا ہے اور وہ جو کچھ غیر مسلموں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ خالص نہیں ہوتا۔ فرقہ پرستی کے اس رجحان نے ایک سچے، سادہ اور انسانی ظاہری اور باطنی ضرورتوں سے ہم آہنگ کتاب اور دین کے پیغام کو ذاتی، جماعتی اور خاندانی کاروبار میں بدل دیا ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ کاروبار جیسا بھی ہو اس میں رقابت عود کر آتی ہے۔ وسوسے، لالچ، ہوس و حرص ہر کاروبار کا خاصہ ہوتا ہے جبکہ دین میں صرف سچائی، سادگی، عاجزی، بے ساختگی اور ہمدردی ہوتی ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ دین کا بیڑا اٹھائے پھرتے ہیں ان کی ذاتی زندگیوں میں دین کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ ان کے قول و فعل میں تضاد اور ذاتی زندگیاں پر آسائش اور نمود و نمائش سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ہر طبقے اور فرقے کا اپنا ڈریس کوڈ ہے جبکہ نشست و برخاست سے لیکر طعام و قیام کے بھی الگ الگ طریقے ہیں۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں نے کہا۔

اسی سے تو فرق پڑتا ہے۔ نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

اسلام ستر پوشی، طہارت اور پاکیزگی کا درس دیتا ہے۔ اسلام میں سادگی، برابری، عقل و دلیل، علم و حکمت اور راست بازی ہے۔ اسلام میں عدل و مساوات، کردار اور محبت ہے۔ مگر

دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ ان لوگوں میں ہے جو اسلام کا پرچار کرتے ہیں؟

جس نبی ﷺ کی پیروکاری اور غلامی کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں ذرا ایک نظر اسوہ رسول ﷺ کی طرف دیکھو تو انسان پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

ایک طرف ساری دنیا اور خصوصاً عرب کے خونخوار قبائل ہیں اور دوسری طرف اللہ کے رسول ﷺ تن تنہا اللہ کی کتاب اور پیغام لیکر ان کے سامنے آتے ہیں تو ان کے پاس صرف اپنی ظاہری پہچان اور کردار کا ہتھیار ہے۔ اپنے، بیگانے، دوست دشمن کسی میں ہمت نہیں کہ وہ محمد ﷺ بن عبداللہ کے کردار، اخلاق، سادگی، پرہیزگاری اور انسان دوستی کے حوالے سے کوئی اعتراض کرے۔

مشرقین مکہ آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہیں مگر آپ ﷺ کو صادق اور امین ماننے پر بھی مجبور ہیں۔ ایک طرف جاہ وجلال اور دولت کے پہاڑ ہیں اور دوسری جانب تزکیہ نفس، مجاہدہ، تقویٰ وقناعت اور سادگی کی عظمت ہے۔ آپ ﷺ کی ضروریات ایک عام آدمی سے بھی کم ہیں اور دنیا کے خزانے آپ کی ضرورتوں کے سامنے بیکار اور بے مقصد ہیں۔

آپ ﷺ مکہ سے مدینہ کی جانب چلے تو سوائے صدیق اکبرؓ کے کوئی فوج آپ ﷺ کے ہمراہ نہ تھی۔ آپ ﷺ صرف اللہ کے حکم اور بھروسے پر گھر سے نکلے تو مسبب الاسباب نے مکڑی اور کبوتر جیسے کمزور اور ناتواں کیڑے اور پرندے کی دانائی وحکمت سے صحرائے عرب کے ماہر کھوجیوں، شہہ سواروں، نیزہ بازوں اور تلوار کے دھنیوں کو منہ کے بل گرا کر شرمسار کر دیا۔

آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو میثاق مدینہ جیسا عظیم معاہدہ عرب وعجم کے دانشوروں کے لئے باعث حیرت بن گیا۔ مدینہ کے یہودی اور عرب قبائل صدیوں سے اکھٹے رہنے کے باوجود کبھی ایسی لڑی میں نہ پروئے تھے جیسے حضور ﷺ نے اپنی دانش وحکمت سے انہیں پرو دیا۔

جہاد کا حکم ہوا تو صرف 9 سال 9 ماہ کے قلیل عرصہ میں سارے صحرائے عرب پر اللہ کی حاکیت اور آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لیا گیا۔ آپ ﷺ نے جن غزوات اور سریات کا حکم جاری کیا ان کی کل تعداد ساٹھ ہے اور ان معرکوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن میں چند جانثار مجاہدوں کو بڑا مشن دیکر بھیجا گیا۔ سن 3 ہجری میں سریہ عمیرؓ بن العاری روانہ کیا گیا۔ اس مشن کو مکمل کرنے کے لئے حضرت عمیرؓ اکیلے ہی گئے اور مشن مکمل کیا۔ اسی سال سریہ کعب اشرف رونہ ہوا جس کے کمانڈر محمد بن کعبؓ تھے جو کُل پانچ جانثاروں پر مشتمل تھا۔ حضور ﷺ کی طرف

سے جتنے بھی مشن بھیجے گئے یا جن کی کمان آپ ﷺ نے خود کی وہ آنے والے دور میں ملٹری ہسٹری کا حصہ بن گئے۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی بھی مسلمان ملک کی فوجی درس گاہ میں ان غزوات اور سریات کو بطور مضمون نہیں پڑھایا جاتا اور نہ ہی ان پر تحقیق کی گئی ہے جبکہ اہل مغرب نے ان غزواۃ اور سریات پر تحقیق کی اوران کی اہمیت اور اخذ کردہ نتائج کو بظاہر تسلیم کئے بغیر ان سے بھر پور فائدہ اٹھایا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی سپیشل فورس ایس اے ایس وجود میں آئی تو صحراؤں میں لڑی جانے والی جنگوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا جس میں غزوہ ذومتہ الجندل جس کا زمانہ 5 ہجری ہے کے خطوط پر برطانوی سپیشل فورس نے (ایل آر ڈی جی) یعنی لانگ رینج ڈیزٹ گروپ بنایا۔

ذومتہ الجندل شام کی سرحد پر واقع ڈاکوؤں اور لٹیروں کا شہر تھا جہاں مدینہ سے ہجرت کرنے والے یہود نے جمع ہو کر لٹیرے سرداروں اور دیگر قبائل سے مل کر مدینہ پر ایک بڑے حملے کی تیاری شروع کر دی۔ اس سے پہلے کہ ایک بڑی فوج مدینہ پر حملہ آور ہوتی انہیں منتشر کرنا ضروری تھا۔

ذومتہ الجندل کا معرکہ صحرا میں گہرے نفوذ کی بہترین مثال ہے۔ آپ ﷺ کا لشکر دن اور رات کے ایسے اوقات میں حرکت کرتا جب صحرانشین بدو قبائل، تجارتی قافلے اور چرواہے آرام کر رہے ہوتے۔ آپ ﷺ نے سفر سے پہلے چاند کی روشنی، صحرائی طوفانوں کے اوقات اور سمت کے تعین کو اپنے منصوبے میں اہمیت دی۔ آپ ﷺ کا لشکر فاصلے اور سمت کی اہمیت کے مطابق ایسے مقامات پر چھپ جاتا جہاں کسی کو اتنے بڑے لشکر کے چھپنے کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ بلکل انہیں خطوط پر (ایل آر ڈی جی) کو تشکیل دیا گیا۔ جس میں ملٹری سروے، انٹیلی جنس اور ایس اے ایس سے لیکر سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ کے دستوں کو باہم ملا کر تربیت دی گئی تاکہ وہ صحرا میں دور تک دیکھ بھال سے لیکر دشمن کے احداف پر موثر کاروائی کر کے واپس آسکیں۔ ذومتہ الجندل کے معرکے اور (ایل آر ڈی جی) کی کاروائیوں میں سوائے ہتھیاروں، جنگی ساز وسامان اور ٹرانسپورٹ کے حربی کاروائیوں اور حرکت پذیری میں انتہائی مماثلت تھی۔

جس صحرائی جنگ کا سبق برطانوی جنگی ماہرین نے آپ ﷺ کی جنگی حکمت عملی سے لیا اسی برطانیہ اور امریکہ کی جنگوں کو جنگی تاریخ کا اہم سبق سمجھ کر پاکستانی اور دیگر ملکوں کی فوجوں کو

پڑھایا جاتا ہے۔اہل مغرب اپنے تعصب کی بنا پر اسلامی روایات، تاریخی، حربی، عسکری اور سائنسی معلومات کا ذکرنہیں کرتے جبکہ اہل اسلام اسے کمتر اور آؤٹ ڈیٹڈ سمجھتے ہیں۔ساری دنیا جانتی ہے کہ 1400ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔تاریخ میں بتلایا گیا کہ دراصل وہ ہندوستان کی طرف جارہا تھا کہ راستہ بھول کر امریکہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوگیا۔حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ہر جہاز ران نقشے اور کمپاس کی مدد سے سفر کرتا ہے جب تک نقشہ ایجانہیں ہوا تھا جہاز ران گہرے سمندر میں نہیں جاتے تھے اور ساحلوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے۔سچ یہ ہے کہ 1100ء میں مراکش کے محمد بن ادریس جو کہ ادریسی کے نام سے مشہور ہیں دنیا کا نقشہ ترتیب دیا اور چاندی کا گلوب بنا کر شاہ انگلستان کو پیش کیا۔کولمبس سے تین سو سال پہلے دنیا کا نقشہ اگر موجود تھا تو اس میں امریکہ کیسے نہ ہوگا مگر تعصب کی حد یہ کہ اہل مغرب کہتے ہیں کہ ادریسی کے نقشے میں چین اور مشرق بعید بھی نہیں تھے۔

چین اور مشرق بعید کا ذکر کر کے مغربی محققین نے خود ہی اپنے تعصب کا بھانڈا پھوڑ دیا چونکہ چین، ہندوستان اور اہل عرب میں زمانہ قبل از مسیح سے تعلقات چلے آرہے تھے۔مقدونیہ کا سکندر قبل از مسیح میں سنٹرل ایشیائ، ایران، افغانستان اور چین کے جنوبی علاقوں سے ہوتا ہوا ہند کی زمینوں پر اُترا اور پھر مکران اور ایران سے ہوتا ہوا عراق میں داخل ہوا۔ظہور اسلام کے بعد حضرت عمرؓ کے دور تک مسلمان فوجیں یورپ، افریقہ، وسطی ایشیاء اور چین کے صوبے کاشغر تک پہنچ چکی تھیں جبکہ مسلمان تاجر جنوبی ہند اور مشرق بعید تک پہنچ بھی چکے تھے۔حضورﷺ کے دور میں ہی بھوپال اور کیرالہ کے مہاراجوں نے اسلام قبول کیا اور خود مدینہ جا کر اصحابؓ رسولﷺ کی جماعت میں شامل ہوئے۔

زمانہ قبل از مسیح کی تہذیبوں کو دیکھا جائے تو چینی، ہندی، یونانی، مصری اور جنوبی امریکہ کی انکا تہذیبوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ایک ہی طرز کے پگوڈے، مندر، حویلیاں، بلند عمارتیں، اہرام، عبادت گاہیں، حمام اور دیگر کاری گری اور نقش ونگاری کے نمونوں میں مماثلت اس بات کی غماز ہے کہ ان لوگوں میں کوئی نہ کوئی رشتہ اور رابطہ ضرور تھا۔اگر رابطے کے ذرائع پر غور کریں تو چین سے ہند اور مصر، جبکہ چین سے براستہ افغانستان یورپ کے آباد علاقوں تک بھی رسائی ممکن تھی۔چین کے نقشے پر نظر ڈالیں تو تبت سے نیپال، بھوٹان، برما، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ملائیشیا تک بھی زمینی راستے ہیں جن کے ذریعے رابطہ ممکن تھا۔

دنیا میں امریکہ ہی ایسا ملک ہے جس تک رسائی سمندر کے راستے ہی ممکن تھی جبکہ جنوبی امریکہ سے کنیڈا تک بھی زمینی راستہ اور رابطہ ممکن ہے۔ جنوبی امریکہ کی انکا تہذیب اور شمالی امریکہ میں ریڈ انڈین کا موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ امریکہ میں ایک قدیم تہذیب اور ایسے انسان موجود تھے جن کا ایک قبائلی ریاستی نظام تھا اور وہ دیوی دیوتاؤں کی صورت میں کسی ان دیکھے خدا سے بھی واقف تھے جس کا تصور ان کے ذہنوں میں محفوظ تھا۔ قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کی کشتی کا ذکر تفصیل سے آیا ہے جو اللہ کے حکم اور حکمت سے بنائی گئی۔ کشتی کے سائیز اور اس کے وزن اٹھانے کی صلاحیت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کشتی ایک بڑے سائیز کے کارگو شپ جیسی تھی جو ایک طویل عرصہ تک ایک ایسے سمندر پر تیرتی رہی جس کی گہرائی کوہ آرارات کی چوٹی سے بھی زیادہ تھی۔

آرارات پر کبھی برف نہیں پگھلتی مگر جب کبھی موسم صاف ہوتا ہے تو نوحؑ کی کشتی کا کچھ حصہ ایک کالے دھبے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ آرات کی دوسری جانب روس واقع ہے جبکہ یہ علاقہ ایران اور ترکی کی قدیم سرحدیں بھی باہم ملاتا تھا۔

قرآنی تاریخ انسانی عقل اور نسلی تعصب پر پڑے کالے پردے تو ہٹاتی ہے مگر انسان جان بوجھ کر حقیقی اور الٰہی علوم کی روشنی سے گھبراتا اور من گھڑت دلیلوں کا لبادہ اوڑنے کا عادی ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کی جسامت، بوجھ اٹھانے اور طویل عرصہ تک ایک گہرے سمندر پر اور دور تک تیرنے کی قوت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی نوح انسان نے آدم ثانی حضرت نوحؑ کے زمانے میں کشتی رانی اور بڑے بڑے بحری جہاز بنانے کا فن سیکھ لیا تھا۔

سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا! اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریاؤں میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں دریا سے مراد سمندر ہے چونکہ اس سے پہلے جن دو دریاؤں کا ذکر ہے وہ بھی سمندر ہی ہیں۔

قرآن مجید کے علم اور دلیلوں سے ثابت ہے کہ حضورﷺ کے زمانے تک انسان سمندروں پر حاوی ہو چکا تھا اور اس نے اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ علم وحکمت سے ایسے جہاز بنا لئے تھے جو سمندروں میں کھڑے بڑے بڑے پہاڑوں کی مانند تھے۔

کوہ آرارت کی اونچائی 5137 میٹر ہے جبکہ یورپ کی سب سے بڑی چوٹی کنکاسس (CANCASUS) 5632 میٹر بلند ہے۔ حضرت نوحؑ کا آبائی وطن عرب تھا جبکہ

آرارات ایران، روس اور ترکی کی سرحد پر واقع ہے۔ یورپ سے امریکہ کا فاصلہ 4906 میل اور ایٹلانٹک کی گہرائی 3339 میٹر ہے۔ اگر فاصلے اور بلندی کے تناسب سے دیکھا جائے تو طوفان نوحؑ اس قدر بلندی تک گیا کہ دنیا کے تمام سمندر باہم مل گئے۔

سوائے ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں، چین اور نیپال کے ملحقہ علاقوں کے اس طوفان سے کوئی چیز باقی نہ بچی۔ طوفان نوحؑ کے بعد کا دور مسخ شدہ اور من گھڑت تاریخ کے بہت سے ابواب کی نفی کرتا ہے کہ انسانی معاشرے، مذہب اور ریاست کی تشکیل کیسے ہوئی۔

اہل مغرب نے سب سے پہلے اپنے دین، دینی روایات اور تاریخ کو مسخ کیا جس میں ملائیت یا پاپائیت کا زیادہ دخل تھا۔ چرچ اور ریاست کا ٹکراؤ ہوا تو عام آدمی دین سے متنفر ہو گیا۔ پاپائیت اور ریاست کی جنگ میں ریاست نے پاپائیت کو نیچا دکھایا اور مذہب کے نئے قوائد بنا کر مذہب کو محض چرچ تک محدود کر دیا۔

حکمران طبقے اور خاندانوں نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور ہر بادشاہ اور حکمران نے اپنی اپنی مرضی کی کتاب لکھ کر رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ ایک اندازے کے مطابق آج دنیا میں بائیبل کی ڈھائی ہزار اقسام ہیں جن میں ڈھائی سو کو چرچ کی طرف سے سند حاصل ہے۔ دین سے فارغ ہو کر مغربی محققین نے تاریخ کی طرف توجہ دی اور ہر اس واقع کو تاریخ سے نکال باہر کیا جو ان کے مزاج اور تحقیق کے دائرہ سے باہر تھا۔ مغربی دانشور اپنی تحقیق و جستجو کو سائنسی دائرے میں مقید صرف اپنی ذہنی کاوشوں اور انسانی عقلی وسعتوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے تاکہ خدا اور دین کی عظمت و حکمرانی ان کے سفلی اور ناسوتی علوم سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اسی طرح مغربی سیاسی دانشوروں نے اپنے نظریات کی بنیاد ہی ایسے فلسفہ پر استوار کی جہاں خالق اور مخلوق کا کوئی تعلق اور رشتہ ظاہر نہ ہو۔

مثلاً۔ میں نے پوچھا۔

اگر ہم اس پر بحث کریں تو بہت سے مخفی راز عیاں ہونگے مگر میں اپنی بات صرف دو مثالوں تک محدود رکھونگی۔

میں نے کہا ہے کہ ادریسی دنیا کا پہلا جغرافیہ دان ہے جس نے دنیا کا نقشہ ترتیب دیا جسے اہل مغرب ایک ادھورا نقشہ تسلیم کرتے ہیں تاکہ مغربی جہاز رانوں، سیاحوں اور مہم جوؤں کو ہی فاتح عالم تسلیم کیا جائے۔ کافی عرصہ پہلے پشاور کی آرکائیو لائبریری میں کچھ مقامی طلباً سے

ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک نوجوان طالب علم ڈاکٹر دانی کے بہت قریب رہا تھا۔ طالب علم نے بتایا کہ ہم نے کولمبس، واسکوڈے گاما اور دوسرے جہاز رانوں اور مہمات سر کرنے والوں کا ذکر کیا تو ڈاکٹر دانی نے کہا کہ ہمارا المیہ ہے کہ انگریزی میں بولے گئے جھوٹ کو ہم سچ اور پراپیگنڈے کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادریسی کا نقشہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ چونکہ خلفائے راشدین کے دور میں چین اور مشرق بعید تک مسلمانوں کی رسائی تھی۔ 1930ء میں مسٹاگ گلیشیئر کے قریب شاراگن نامی گاؤں کے آثار ملے جہاں ایک پولوگراؤنڈ بھی دریافت ہوا۔ یہ گاؤں سکردو، تندر اور اسکالی کو چین کے صوبہ سنکیانگ سے ملانے والے راستہ پر موجود تھا۔ یہ راستہ دنیا کی عظیم چوٹیوں مشابرم کے سلسلہ کوہ اور کے ٹو کی مغربی ڈھلوانوں کے نیچے بڑے گلیشیروں کے جنکشن پر واقع ہے۔

بلتی لوگ جانتے ہیں کہ شاہ ہمدان اسی راستے پر شور بولاک سے ہوتے ہوئے کشمیر میں داخل ہوئے جبکہ صدیوں پہلے جب کشمیر میں ھُن حکمرانوں کا دور تھا انہیں راستوں سے تجارتی قافلے چین اور سنٹرل ایشیاء تک سفر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ایران فتح ہوا تو مسلمان سیاحوں، تاجروں اور اصحابؓ رسول ﷺ نے وسط ایشیاء، چین اور مشرق بعید تک رسائی حاصل کر لی۔ اس تعلق کے بعد بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے اور طویل سفر کر کے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے حجاز مقدس جانے لگے۔ حج اسلام کا ایسا رکن ہے جس کی ادائیگی دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک ہی مقام پر، ایک ہی حیثیت میں، ایک ہی لباس اور ایک ہی طرح کی عبادات میں یکجا کر دیتا ہے۔ ادریسی حضرت حسنؓ کی اولاد سے تھا جس کی جڑیں نہ صرف عرب معاشرے بلکہ خود نبی ﷺ کے خاندان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ کہنا کہ ادریسی کا علم محدود تھا اور اس کا بنایا ہوا نقشہ مکمل نہ تھا محض تعصب کے سوا کچھ نہیں۔ مغربی تاریخ دان، محقق اور مورخ کولمبس، واسکوڈے گاما اور دوسرے مغربی مہم جوؤں کو تو اہمیت دیتے ہیں مگر دنیا کے عظیم مہم جو اور سیاح ابن بطوطہ کی بات ہی نہیں کرتے۔

تعصب کی ایک زندہ مثال تاریخ میں اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے دنیا کی بلندترین چوٹی ایورسٹ پر قدم رکھا۔

کیوں۔ اس کا نام ایڈمنڈ ہیلری نہیں کیا؟ میں نے کہا۔

نینا نے قہقہہ لگایا۔

میں نے غلط کہا ہے۔ میں نے اپنا سوال دھرایا۔
نہیں۔تم نے ٹھیک کہا اور وہی کہا جو کتابوں میں لکھا ہے۔
سچ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔
سچ یہ ہے کہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے ایورسٹ پر قدم رکھا وہ ایک غریب نیپالی پورٹر یعنی کوہ پیاؤں کا سامان اٹھانے والا قلی شرپاتن زنگ تھا ہیلری نہیں تھا۔ حقیقی اور سچی تاریخ کا ایک واقع کہ دنیا کا پہلا انسان جو اسی دنیا کے بلند ترین مقام پر سب سے پہلے پہنچا۔
کوہ پیما ہمیشہ بڑی روپ یعنی دوستی کی رسی میں بندے ہوتے ہیں اور ایک مناسب فاصلے پر چلتے ہیں تا کہ کسی برفانی دراڑ میں گرنے کی صورت میں دوسرا محفوظ بھی رہے اور گرنے والے کو کھینچ سکے۔ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھتے ہوئے شرپاتن زنگ آگے تھا اور ان دیکھی برفانی دراڑوں، گھائیوں اور پھسلتی برفیلی ڈھلوانوں کی پرواہ کیے بغیر ایڈمنڈ ہیلری کے لئے محفوظ راستہ تلاش کرتا تھا۔ جو شخص اس مہم کا لیڈر تھا وہ بھی آخری کیمپ میں تھا مگر لیڈر اور ہیلری ہی کو اس مہم کا فاتح تسلیم کر لیا گیا اور ملکہ برطانیہ نے دونوں کو نائٹ ھُڈ یعنی سر کا خطاب دیا۔
ایڈمنڈ ہیلری کا تعلق نیوزی لینڈ سے تھا مگر گورا تھا جبکہ شرپا غریب نیپالی پورٹر تھا۔
ہیلری چونکہ برطانوی نہ تھا اس لئے اس نے سچ بولا اور احتجاج بھی کیا کہ وہ دنیا کی عظیم چوٹی سر کرنے والا پہلا کوہ پیما نہیں بلکہ شرپاتن زنگ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ایورسٹ پر قدم رکھا۔ ہیلری اس لئے بھی سچ بولنے پر مجبور تھا چونکہ اس نے اپنے کیمرے سے ایک نایاب تصور اتار کر ساری دنیا کے اخباروں اور رسالوں کو دی جس میں شرپاتن زنگ برطانیہ، نیپال اور نیوزی لینڈ کے جھنڈے ہاتھ میں لئے ایورسٹ پر کھڑا ہے جبکہ ہیلری کی کوئی تصویر ایورسٹ پر نہیں۔ ہیلری کے سچ بولنے کے باوجود حکومت برطانیہ نے سچ کو تسلیم نہ کیا اور ہیلری کو ہی پہلا کوہ پیما تسلیم کرتے ہوئے اسے سر کا خطاب دے دیا۔
نینا تم نے مستاگ گاؤں کی بات کی تھی اس کا اور اہل مغرب کے تعصب کا کیا تعلق ہے؟ میں نے پوچھا۔
یہ ایک گہرا اور متعصّبانہ تعلق ہے۔ انگریز تاریخ دانوں، مہم جوؤں اور محققین نے گلگت بلتستان، چترال اور ملحقہ علاقوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں فرانسس ینگ ہاسبنڈ اور مورٹیمبر ڈیورنڈ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان تحریروں اور تحقیقاتی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ گلگت

بلتستان اور ملحقہ ریاستوں کی تاریخ ینگ ہاسبنڈ اور ڈیورنڈ تک ہی محدود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں برطانوی فوجی افسروں نے چین اور روس کے خلاف ان علاقوں میں رہ کر اپنی حکومت کو باخبر رکھا اور مقامی راجوں اور حکمرانوں کو برطانوی سرکار سے رشتہ برقرار رکھنے پر بھی مائل کیا۔ ینگ ہاسبنڈ نے چترال کے شاہی خاندان میں اس قدر اثر ورسوخ پیدا کرلیا تھا کہ عام لوگ اسے چترال کا شہزادہ ہی تصور کرتے تھے۔

اس سے پہلے کہ تم ینگ ہاسبنڈ کے متعلق کچھ پوچھو، بتاتی چلوں کہ یہ شخص مری کے ایک انگریز فوجی گھرانے میں پیدا ہوا اور وہی پرورش پائی۔ برٹش انڈین آرمی میں بحیثیت لیفٹیننٹ بھرتی ہوا اور ساری زندگی گلگت، بلتستان، کاشغر، افغانستان اور چترال میں گزاری۔ ینگ ہاسبنڈ نے جس تندہی اور مہم جوئی کا مظاہرہ کیا وہ واقع قابل تعریف ہے۔ ینگ ہاسبنڈ گریٹ گیم کا ایک اہم پلیئر تھا جس کی وجہ سے چترال کے شاہی خاندان کو زار روس، بالیشوک انقلاب اور بعد میں کیمونسٹ انقلاب کے اثرات سے آزاد رہنے کا حوصلہ ملا۔

ینگ ہاسبنڈ ایک خوبصورت اور دلکش شخصیت کا حامل برطانوی آفیسر تھا جسے چوبیس سال کی عمر میں اعلیٰ ترین فوجی ایواڈ اور اعزاز سے نوازا گیا۔ ینگ ہاسبنڈ نے لداخ، لیہ، کاشغر اور تبت کی مہم سر کی اور روسی مہم جو کیپٹن گروچی وسکی کا تعاقب کرتے ہوئے اسے برطانوی ہند کی حکومت کے فوجی اور سیاسی ارادوں اور منصوبہ بندی سے آگاہ کیا۔

ینگ ہاسبنڈ نے گروچی وسکی پر واضع کیا کہ وائسرائے کی حکومت اور تاج برطانیہ کسی بھی حال میں گلگت، بلتستان، کشمیر اور چترال میں روسی مداخلت برداشت نہیں کرینگی۔ ینگ ہاسبنڈ اور گروچی وسکی کے درمیان ہونے والے دلچسپ مقالموں کا ذکر خود ینگ ہاسبنڈ نے اپنی تحریروں میں کیا۔ ایک طرف تو ینگ ہاسبنڈ روسی مہم جوؤں کو اور دوسری جانب ہنزہ کے حکمران کو باور کروایا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف کسی روسی سازش کا حصہ نہ بنیں بصورت دیگر اسے شدید ردعمل کا سامنا ہوگا۔

اس سے پہلے کہ میں بات آگے بڑھاؤں، دو باتوں کی وضاحت کرتی چلوں۔ پہلی بات یہ کہ گلگت اور بلتستان کے علاقے مہاراجہ کشمیر کی حکومت کے زیر اثر تھے جہاں برطانوی افسروں اور سیاسی اہلکاروں کا بھی اثر تھا۔ ہنزہ کی ریاست آزاد اور خود مختار ہی نہیں بلکہ خود سر بھی تھی۔ کشمیر، پنجاب، ایران، افغانستان اور دیگر ممالک سے چین جانے والے تجارتی قافلوں، چین

سے افغانستان، سوات اور ہندوستان جانے والے بدھ زائرین کے علاوہ چین کے صوبہ کاشغر سے حجاز مقدس جانے والے حجاج کو لوٹنا اور غلام بنا کر بیچنا ہنزہ کے حکمرانوں کا نہ صرف مشغلہ بلکہ آمدنی کا بڑا ذریعہ بھی تھا۔ درہ شمشال کے قریب مسٹاگ کا قلعہ ایسے ہی لیٹروں کی آماجگاہ تھی جو لوٹا ہوا مال اور غلام میر آف ہنزہ کی خدمت میں پیش کر کے معقول معاوضہ وصول کرتے تھے۔ میں جس بات کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ ینگ ہاسبنڈ خود اور پیٹر ہوپ کرک نے بارہا اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ ینگ ہاسبنڈ نے ایک ایسے راستے پر سفر کیا جس پر پہلے کوئی نہیں گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ راستے صدیوں سے جانے پہچانے تھے اور تجارتی قافلے ان پر سفر کرتے تھے۔ مسٹاگ گاؤں جو درہ شمشال سے مشرق کی جانب واقع ہے ایک دور میں اہم تجارتی مقام تھا جہاں ایک وسیع سرائے کے علاوہ پولو گراؤنڈ بھی موجود تھا۔ آج بھی جب اس گاؤں کے آثار برف کی تہوں سے نمودار ہوتے ہیں تو شمشال کے علاقوں کے شکاری اور چرواہے وہاں جاتے ہیں جن سے میں خود بھی ملی ہوں۔ ان لوگوں کے مطابق مسٹاگ کے گھروں اور دیگر عمارتوں کا ڈیزائن شمالی علاقوں کے گاؤں اور دیہاتوں سے مختلف ہے۔ پولو گراؤنڈ کے آثار سے بھی لگتا ہے کہ اس کی وسعت زیادہ ہے اور اردگرد پتھروں کی دیوار ہے جو اس دور میں شائد اونچی ہوگی جس پر بیٹھ کر لوگ کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہونگے۔ مسٹاگ کے آثار بتلاتے ہیں کہ اس کے باسی موجودہ گلگتی و بلتی لوگوں کے آباواجداد نہیں تھے مگر پولو کی نسبت سے کوئی تعلق ضرور تھا جس کا کھوج لگانا تاریخ دانوں کا کام ہے۔ شمالی علاقوں میں تاریخ کے بہت سے راز پنہاں ہیں جسے کھوجنے کی جستجو نہیں کی گئی۔ میں سکردو اور گلگت کے کچھ تاریخ دانوں سے ملی اور ان کی کتابیں دیکھیں مگر ان میں زیادہ مواد نہیں۔ ان لوگوں کی کھوج کا سرچشمہ بھی مغربی محقق، تاریخ دان اور مہم جو ہیں جن کا علم اور تجربہ کم مگر لفاظی زیادہ ہوتی ہے۔ مغربی محقق اور مہم جو ایک وسیع پلاٹ پر اپنی کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں اور انداز بیان کے اسلوب سے استوار ایک ایسا نسخہ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی سچائی پر یقین کر لیتا ہے۔

1985ء میں، میں پہلی بار شمشال گئی جہاں پہلے سے ایک فرانسیسی ٹیم موجود تھی۔ یہ لوگ درہ شمشال اور پھر مسٹاگ سے ہوتے ہوئے نگر آنا چاہتے تھے مگر مقامی گائیڈ زیادہ رقم اور دیگر اشیاء کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فرانسیسی طلباً کی یہ ٹیم دو سال پہلے بھی آچکی تھی جن کے پاس صرف سیاحت کا ویزہ تھا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں نے کہا۔

فرق پڑتا ہے۔مہم جوئی کے لئے آنے والی ٹیموں کا سٹیٹس مختلف ہوتا ہے۔انہیں اپنے روٹ یعنی ٹریک اور پہاڑ جس پر جانا ہو کیلئے بہت سا سامان، ٹیم ممبران کی تعداد، صحت کے سرٹیفکیٹ، مقامی پوٹروں کی تعداد، انشورنس کے علاوہ ایک سال پہلے اجازت نامے کے لئے حکومت پاکستان سے رابطہ کرنا ہوتا ہے۔حکومت انہیں کھلا نہیں چھوڑتی کہ جدھر چاہیں مٹرگشت کرتے پھریں۔ان کے ساتھ ایک رابطہ افسر ہوتا ہے جو ان کے مشن کے متعلق حکومت کو رپورٹ پیش کرتا ہے جبکہ سیاحوں کو ایسے انتظامات نہیں کرنے پڑتے۔یہ سیاح جن کا میں ذکر کر رہی ہوں کی تعداد بھی آٹھ دس تھی جس میں آدھی لڑکیاں تھیں۔یہ لوگ الگ الگ آئے ہوئے تھے اور ایک یا دو روز کے وقفے سے شمشال پہنچے تھے۔ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ دو سال قبل جب شمشال آئے تھے تو ایک شخص سے جس کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی اور شمشال میں کسی کا مہمان تھا نے انہیں ہرنی کی کھال پر بنا ایک نقشہ دکھایا جس پر عربی اور چینی زبان میں لکھائی کی گئی تھی۔یہ نقشہ ایک اسکیچ تھا جس پر شمالی علاقوں کے موجودہ دیہاتوں اور قصبوں کے نہیں بلکہ کچھ اور نام اور مقام لکھے تھے جو اب زمین پر نہیں۔اس نقشے پر مسٹاگ کے علاوہ بھی کچھ جگہیں نمایاں تھیں مگر اب وہاں گلیشیئر ہیں۔

ان لوگوں نے بوڑھے سے نقشہ ضرور خرید لیا ہوگا۔میں نے پوچھا۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔نینا نے کہا۔۔

میرا بھی یہی خیال ہے مگر فرنچ بیوٹی ٹرخا گئی۔

میں نے فرنچی سے سوال کیا تھا کہ کیا تم لوگوں نے بوڑھے شمشالی مہمان سے نقشہ خریدا تھا۔

کہنے لگی نہیں صرف دیکھا تھا۔اس پر چینی اور عربی زبان میں لکھا تھا۔

اس کے دوست نے کہا نہیں۔لکھائی سنسکرت میں تھی عربی میں نہیں تھی۔

میں نے پوچھا تمہیں عربی، سنسکرت اور چینی زبانوں کا علم ہے تو لڑکی نے کہا نہیں۔ہم نے نقشے کا فوٹو لیا تھا اور پیرس جا کر ایکسرٹ کو دکھلایا تو پتہ چلا کہ یہ کونسی زبانوں کے الفاظ ہیں۔

پھر۔میں نے سوال کیا۔

مجھے لگتا ہے یہ لوگ باقائدہ مہم جوء اور اچھے ٹریکر تھے۔وہ 1985ء سے پہلے اس نقشے کی

تلاش میں ہی آئے ہونگے جس کا انہیں کسی طرح علم ہوا ہوگا۔ یہ فرضی مہمان بوڑھا بھی کوئی نہ ہوگا بلکہ شمشال یا ہنزہ ہی کا کوئی باشندہ ہوگا جس نے اچھا خاصا معاوضہ لیا ہوگا۔ جہاں تک لکھائی کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں سنسکرت ہی ہوگی چونکہ راج ترنگنی کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

راج ترنگنی کا اس نقشے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ میں نے پوچھا۔

راج ترنگنی جس کا مصنف پنڈت کلہن ہے دنیا کی قدیم ترین تاریخی کتاب ہے جو سنسکرت ہی میں لکھی گئی تھی۔ عبرانی کی طرح سنسکرت بھی قدیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور چینی زبان بھی اسی شمار میں آتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ زبانیں ہیں جو اب ناپید ہیں اور جنہیں پڑھنے کے لئے ماہرین کی مدد لی جاتی ہے۔ پنڈت کلہن کا تعلق کشمیر سے تھا اور اس دور میں موجودہ چین کے جنوبی حصوں پر کشمیری حکمرانوں کی عملداری تھی۔ اگر فرانسیسیوں کو کوئی ایسا نقشہ واقعی دیکھنے کو ملا تھا تو اس کا تعلق ایسے ہی کسی دور سے ہوسکتا ہے۔

1985 کے بعد دوبارہ پھر شمشال گئی اور لوگوں سے پوچھتی رہی کہ ایسا کونسا بزرگ وہاں آیا تھا جو فرانسیسی طلباً سے ملا تھا۔ کچھ لوگوں سے پتہ چلا کہ یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا البتہ مسٹاگ یا پھر شاراگن گاؤں کے آثار سے ایک پتھر کی سلیب یا کتبہ نما چیز کسی شکاری کو ملی تھی جس پر ایک نقشہ کندہ کیا گیا تھا جس طرح قبروں کے کتبوں پر حروف کندہ کئے جاتے ہیں۔ مقامی لوگوں سے ہی پتہ چلا کہ پتھر کی اس سلیب پر دو زبانوں میں لکھائی کی گئی تھی جو بظاہر چینی اور عربی رسم الخط سے ملتی جلتی تھی۔ عجیب بات یہ کہ کسی ایک بھی شخص نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے یہ کتبہ دیکھا ہے بلکہ سبھی نے کہا کہ سنا ہے۔

مگر کیوں۔ تم تو کہتی ہو کہ شمشال ایک چھوٹا گاؤں ہے۔ لوگ انتہائی سادہ، ایماندار، صاف گو اور تعلیم یافتہ بھی ہیں۔

ہیں۔ نینا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

اہلیان شمشال اسماعیلی عقیدے کے پیروکار ہیں۔ جن دنوں میں وہاں گئی تھی۔ وہاں ایک سکول بھی تھا جہاں گاؤں کے بچے پڑھتے تھے۔ شمشال کا ہر نوجوان، بہترین ٹریکر، شکاری، مہم جو اور کوہ پیا ہے۔ شمشال کے لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور پردہ پوشی ان کے عقیدے کا جز لازم ہے۔ وہ بات تو کرتے ہیں مگر کسی کا راز افشاں نہیں کرتے۔ شمشال کا ایک

مسئلہ یہ بھی ہے کہ آپ ہر کسی سے مل بھی نہیں سکتے۔گرمی اور بہار کے موسموں میں جب سیاح وہاں جاتے ہیں تو وہاں کم لوگ ہی موجود ہوتے ہیں۔بہت سے لوگ اپنے مال مویشی لیکر مزید بلندیوں کی طرف نکل جاتے ہیں جہاں ان کی چراگاہیں ان کی منتظر ہوتی ہیں۔جس کسی نے مہم پر جانا ہوتا ہے وہ پہلے سے ہی نکل چکا ہوتا ہے۔

تم راج ترنگنی اور پنڈت کلہن کا ذکر کررہی تھی۔میں نے کہا۔

ہاں کلہن کی راج ترنگنی قدیم ترین تاریخی دستاویز ہے جو کشمیری حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستان ہی نہیں بلکہ اس سلطنت کی وسعت اور سرحدوں کے سکڑنے اور پھیلنے کا ذکر بھی کرتی ہے۔کشمیری حکمرانوں کا سکہ جنوبی چین، تبت، افغانستان اور وسط ایشیا تک چلتا تھا۔چین اور کشمیر کو ملانے والے راستے بھی موجودہ شمالی علاقوں ہی سے گزرتے تھے۔

شمالی علاقوں کے بلند و بالا پہاڑ، تنگ اور بلند درے تہذیبوں، مذاہب اور انقلابی سوچ کے حامل سیاحوں کے اطوار و افکار اور مصائب والم کے گواہ ہیں۔چینی، ہندی، ایرانی، مصری اور یونانی تہذیبوں کا ایک دوسرے سے تعارف تاریخی واقعات سے ثابت ہے۔اگر ہم اپنی تہذیب اور تاریخ کا کھوج لگانا چاہیں تو اس کا ماخذ انگریز اور دیگر مغربی مہم جو نہیں ہو سکتے چونکہ یہ لوگ متعین راہوں پر چلے اور وہاں موجود جابر بادشاہوں اور خوشحال قوموں سے رابطے کا باعث بنے۔ ینگ ہاسبنڈ، کرنل ڈیورنڈ اور دیگر کی کتابیں، نوٹس، سمریاں اور تجزیات تاریخ کا اضافی باب تو ہو سکتی ہیں مگر مکمل تاریخ نہیں۔یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔جہاں تسلسل قائم نہ رہے وہاں تاریخ کا راستہ ہی بدل جاتا ہے۔اگر مورخ اس بدلے ہوئے راستے کو کھوجنے میں ناکام رہے اور من گھڑت واقعات کا سہارا لیکر قصہ جوڑنے کی کوشش کرے تو وہ تاریخی بددیانتی کا موجب بنتا ہے۔راج ترنگنی ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کے ابواب تاریخی تسلسل اور روانی کا بہترین نمونہ ہیں۔راج ترنگنی میں درج واقعات کا تعلق کشمیر اور ملحقہ ریاستوں اور ممالک سے ہے جنہیں آج ہم چین، بھارت، پاکستان، ایران، افغانستان اور وسطی ایشیائی ممالک کہتے ہیں۔

شمالی علاقوں کی تاریخ کا تجزیہ ہیون سانگ اور فاہین کے سفرناموں کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ ہیون سانگ بھی درہ مستاگ ہی سے وادی شمشال اور پھر ہنزہ میں داخل ہوا اور افغانستان اور سوات میں بُدھ کی زیارتوں سے ہوتا ہوا قندھار اور ہرات تک کی سیاحت کی۔ وہ

پندرہ سال تک ہندوستان میں رہا اور مہاراجہ ہرش کے طریق حکمرانی کا گہرا مطالعہ کیا۔ ہیون سانگ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ ہرش ایک عظیم جرنیل اور عوام دوست حکمران تھا۔ وہ اشوک اعظم کا سچا پیروکار تھا اور اسی انداز سے حکمرانی کرتا تھا۔ ہیون سانگ نے ہرش کی علم دوستی کی تعریف کی اور نالندہ یونیورسٹی کا خاص ذکر کیا جہاں بُدھ مت کی تعلیم کے علاوہ طب، فلکیات، ریاضی، فلسفے اور علم کیمیاً کے علاوہ دیگر سائنسی اور سماجی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہیون سانگ اور فائین کے مطابق ہند اور چین کے عوام اور حکمرانوں میں باہم روابط تھے اور تاجر پیشہ لوگ آزادی سے لین دین کرتے تھے۔ ہرات اور قندھار بھی تجارتی مراکز تھے جہاں عرب، مصر، یونان اور روم کے تاجر اپنا مال ہندی اور چینی تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔

اگر ہم یورپی مورخین کے کام تک ہی اپنے آپ کو محدود کرلیں تو یہ نہ صرف علم بلکہ عقل کیساتھ بھی بے انصافی ہوگی۔ انسانی عقل کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی تمامتر وسعتوں اور دلائل کو بروئے کار لاکر نہ صرف انسانی قلب کی تسکین کرے بلکہ دوسروں کے لئے بھی ایک ایسا اثاثہ جمع کرے جس کا منبع و مخزن سچائی اور حقیقت ہو۔ فائین، ہیون سانگ، کوتیلہ اور ابن بطوطہ ایسے مفکر ہیں جنہیں بادشاہوں اور حکمرانوں کی چاپلوسی سے کچھ غرض نہیں۔ اس سے پہلے کنفیوشس نے بھی ایسی ہی روش اختیار کی۔ یونانی مفکرین میں دیو جانسن کا مقام سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ کنفیوشس نے بادشاہ کی معمولی کوتاہی پر چیف جسٹس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے نزدیک بادشاہ ہونے کا مطلب زیادہ ذمہ دار، حساس، قانون اور وقت کا پابند، سچائی کا پیکر اور معاملہ فہم ہونا ہے۔ وہ چاہیئے شاہی محل میں رہے، سونے کا تاج اور جواہرات پہنے، شاہی لباس زیب تن کرے مگر عوام کی تکالیف کا ذمہ بھی لے۔ وہ بادشاہوں کو ایک حد تک زندگی کی لذتوں کی اجازت دیتا ہے۔

دیو جانسن علم اور دانش کو انسانی مراتب کا معیار قرار دیتا ہے۔ وہ علم و آگاہی کا خزانہ تو ہے مگر امیر اور فقیر دونوں کو انسانیت کے معیار پر پرکھتا ہے۔ وہ عام آدمی کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہے مگر بادشاہ کے لئے ایک لمحہ ضائع کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ وہ فقیر کی کیٹا میں دعوت قبول کرلیتا ہے مگر شاہ کے محل اور دسترخوان کے قریب نہیں جاتا۔ دیو جانسن گرم روٹی، ٹھنڈے پانی اور دھوپ سے زیادہ کسی چیز کا طلب گار نہیں۔

پنڈت کلہن کی راج ترنگنی اور کوتیلیہ کی ارتھ شاستر بھی بے مثال ہیں۔ کلہن نے بادشاہوں

کی تاریخ تو لکھی ہے مگر محض تعریف تک ہی محدود نہیں رہا۔ وہ جن کی تاریخ لکھتا ہے ان سے کسی تعریفی سند، جاگیر اور جائیداد کا طلبگار نہیں۔

وہ کسی پبلشر، پروف ریڈر اور دیباچہ نویس کا بھی محتاج نہیں۔ وہ حیلے بہانے سے اپنی بیوی، بیٹی، بیٹوں، بہو بیگم اور دوستوں، رشتہ داروں کو اپنی تحریر میں فٹ نہیں کرتا۔ وہ کسی سے نفرت اور محبت بھی نہیں کرتا اور نہ ہی بے وجہ کسی کی تعریف کرتا ہے۔

کوتیلیہ تو ہے ہی بادشاہ گر۔ وہ بادشاہوں، شہزادوں اور وزیروں، مشیروں کی تربیت کرتا ہے اور انہیں کامیابی کے گر سکھاتا ہے۔ وہ اپنی ریاست کی خارجہ اور داخلہ پالیسی مرتب کرتا ہے اور پھر بادشاہ کو حکم دیتا ہے کہ اس پر عمل کرے۔ وہ کسی صلے کا محتاج نہیں اور نہ ہی کسی محل اور جاگیر کا طلبگار ہے۔ وہ چاہتا تو خود بھی بادشاہ بن سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے سامنے بادشاہ کی اہمیت شطرنج کے مہرے کے برابر ہے جسے وہ اپنی چالوں میں استعمال کرتا ہے۔

تم تو کسی کتبے کا ذکر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

کتبے کا ہی ذکر کر رہی ہوں جو شاراگن گاؤں کے آثار سے ملا تھا۔ ایسے بے شمار تاریخی آثار شمالی علاقوں، افغانستان کے پہاڑی دروں اور کھنڈرات میں موجود ہیں بلکہ انسانی ہوس وحرص سے محفوظ ہیں۔ ان تاریخی اثاثوں کے اولین حقدار ہمارے ملک کی عوام ہیں مگر لالچی افسر اور حکمران سمگلروں کی مدد سے ان تاریخی آثار کو دوسرے ممالک کو بیچ کر مال بناتے ہیں۔

شاراگن گاؤں اس علاقے کا واحد گاؤں نہیں جسے گلیشیئر نے انسانی آنکھ کے لئے آزاد کر دیا ہے۔ یہ گلیشیئر صدیوں کی برفباری اور پھر پہاڑوں سے سرکتے برفانی تودوں کے نشیبی علاقوں میں ٹھہراؤ کے بعد وجود پذیر ہوتے ہیں۔ برفانی طوفانوں اور زلزلوں نے بھی گلیشیئر سازی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ٹھنڈے یخ طوفانوں نے برفوں کی رنگت اور ہیت کو تبدیل کیا اور زلزلوں نے گہری کھائیاں اور دراڑیں بنا کر گلیشیئر کو تیزی سے سرکنے اور پگھلنے سے روک دیا۔ اگر گلیشیئر تیزی سے سرکیں اور ان کا حجم کم ہو جائے تو جلدی پگھل جاتیں ہیں۔ کسے پتہ کہ جہاں آج سنولیک ہے وہاں کبھی کوئی شہر آباد تھا یا کوئی بڑی جھیل تھی جسے قدرت نے ٹھنڈا کر دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کے ٹو، ہسپر اور بیافو کی چوٹیوں سے سرکنے والے برفانی تودے ایک ایسی وادی میں جمع ہوگئے جہاں گہری کھائیوں نے انہیں ٹھہراؤ دیا اور پھر مزید برفوں نے ان تودوں کے حجم کو بڑھا کر انہیں سخت، مضبوط اور کچھ جگہوں پر ہموار کر دیا۔

ظاہر ہے کہ گلیشیئر سازی کا قدرتی عمل صدیوں پر محیط ہے اور انسان اس عمل کا حصہ ہے۔
جوں جوں برفیں چوٹیوں سے وادیوں پر قابض ہوئیں انسانی آبادیوں نے ان کی آمد پر اپنے گھر، شہر اور کھیت کھلیان خالی کر دیے۔ شمالی علاقوں کا کوئی گلیشیر ایسا نہیں جس کے پڑوس میں انسان آباد نہیں۔ ان لوگوں کی بھی ایک تاریخ ہے، ایک تمدن ہے اور ایک تمدنی تاریخ ان کا ورثہ ہے جو کروڑوں اربوں ٹن برفوں کے نیچے دب کر انسانی آنکھ سے اوجھل ہو گیا ہے۔

برفوں اور صحراؤں کی کہانی میں کافی حد تک مماثلت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صحراؤں کی ریت، مٹی اور پتھروں پر انسانی قوت کو دسترس ہے کہ وہ انہیں ہٹا کر تاریخ کے گمشدہ حقائق سے پردہ اٹھائے مگر برفیں انسانی طاقت پر حاوی ہیں۔ صحراؤں پر آندھیاں اور طوفان آئیں تو ان کی ہیت بدل جاتی ہے مگر گلیشیر ہواؤں سے مضبوطی اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ سورج کی گرمی اور زمینی حادثات سے جتنا پانی گلیشیر سے خارج ہوتا ہے۔ برفانی طوفان اور ہوائیں اس کمی کو پورا کر دیتے ہیں۔ مزید برفوں، طوفانوں اور زمینی خدوخال میں آنے والی تبدیلیوں سے گلیشیر انسانوں سے مزید زمین چھین لیتے ہیں۔ یہ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ گلیشیر انسان سے چھینا ہوا ورثہ اسے اپنی خوشی سے واپس کر دے۔

قطبین کے بعد دنیا میں برف کا سب سے بڑا ذخیرہ سیاہ چن گلیشیر اور اس سے ملحقہ گلیشیرز کا نظام ہے۔ ان کے نیچے کیا ہے کسی کو پتہ نہیں۔ یہ برفانی وجود کیسے اور کتنے عرصہ میں بنے صرف قیاس کی حد تک ہی کچھ کہا جا سکتا ہے حقیقی علم صرف کارساز حکمت کو ہی ہے۔ جہاں تک شارا گن گاؤں سے ملنے والی تختی کا کتبے کا تعلق ہے تو یہ ان واقعات کی ایک کڑی جس کی مدد سے قدیم ترین انسانی تاریخ اور تہذیب کو کھوجنے کا وسیلہ پیدا ہو سکتا ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ دنیا کی تاریخ کے اولین دور کا آغاز مصر سے ہوا ہے۔ علم، حکمت، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، ظروف سازی، تصویری تحریر، تصویر کشی، منظر نگاری سے لیکر غذائی اجناس کی حفاظت، گودام سازی، سونے، چاندی، پیتل اور لوہے کے زیورات تک جدید دور کا کوئی ایسا ہنر اور فن نہیں جسے مصریوں نے اس دور میں فنکارانہ بلندی تک نہ پہنچایا ہو۔ ایک عام قاری کی علمی سرحد اہرام مصر، فرعون اور ممی سازی پر اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم مصری تہذیب، تہذیبوں کی ماں ہے۔ بابل کا تہذیبی ورثہ اور سوڈانی اہراموں کی کہانی

مصری تہذیب ہی کا ایک حصہ ہے۔ چونکہ یہ سب علاقے مصری حکمرانوں کے زیرنگین تھے۔ بعد میں ایسے بھی ادوار آئے کہ مصریوں نے ایران اور ایرانیوں نے مصر کی زمینوں کو روند ڈالا۔ مصری اور ایرانی تہذیبوں کے ملاپ اور ٹکراؤ سے چینی، ہندی اور یونانی تہذیبوں نے بھی اثر لیا چونکہ مصر اور ایران سے نقل مکانی کرنے والے علماً اور حکمت سازوں نے علم وفن کی روشنی سے دیگر تہذیبی ورثوں میں بھی چمک پیدا کی اور انہیں نئے اور اچھوتے علم اور فن سے متعارف کروایا۔ قدیم دور کے حالات اور مصری تہذیب وثقافت پر سب سے پہلے یونانیوں نے ہی قلم اٹھایا۔ ہیروڈوٹس پہلا یونانی سیاح اور مورخ ہے جس نے مصری تہذیب پر ایک مستند کتاب لکھی۔ دیودرس نے بھی تحقیق میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور مصری تہذیب کے کئی گمشدہ ابواب تلاشنے میں کامیاب ہوا۔ ہک یتاس نامی یونانی مورخ عرصہ تک مصر کے بادشاہ بطلیموس کے دربار سے منسلک رہا اور مصری تاریخ کو کتابی شکل دی جس کے حوالے آج بھی تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ تو تھے یونانی جنہوں نے مصر کی تہذیب پر لکھا مگر مصری بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ مشہور مصری مورخ جو پیشے کے لحاظ سے پجاری اور مبلغ تھا نے یونانی زبان پر دسترس حاصل کی اور مصر اور یونان کی تہذیبوں کے حوالے سے ایک عمدہ کتاب تحریر کی جس کے اب حوالے ہی باقی ہیں۔ 1789ء میں نپولین نے مصر فتح کیا اور وہاں کے تاریخی ورثے پر تحقیق کا کام بھی کیا۔ فرانسیسی ماہرین کے کام پر مشتمل یہ تصویری تاریخ اور خاکے بعد کے ادوار میں تاریخ کے طلباً کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

اب تمہیں ایک دلچسپ بات بتلاتی ہوں۔ نینا نے کہا۔

ہوایوں کے سکندریہ کے قریب رشیدیہ گاؤں کے باہر ایک فرانسیسی فوجی افسر جوانوں سے مورچے کھدوا رہا تھا کہ مٹی کے ایک ٹیلے سے ایک کتبہ برآمد ہوا۔ یہ واقع 1799ء کا ہے۔ کتبے کو صاف کر کے دیکھا گیا تو اس پر کچھ تصاویر، یونانی زبان کے کچھ الفاظ کے علاوہ ایک نامعلوم زبان میں بھی کچھ کندہ کیا گیا تھا۔ 1802ء میں یہ کتبہ تحقیق کی غرض سے لندن بھجوادیا گیا تو پتہ چلا کہ اس پر یونانی خط تصویر اور دماطی زبانوں کی تحریریں کندہ ہیں۔ اس کتبے کو پڑھنے کے لئے علم القیاس کی مدد سے برطانیہ کے مشہور ماہر لسانیات وعبادات ٹامس ینگ اور فرنسیسی محقق شامولیاں نے اہم رول ادا کیا۔ بعد کی کھوج اور اس کتبے پر لکھی تحریر سے پتہ چلا کہ یہ کتبہ بطلیموس پنجم کے دور کا ہے جس پر بادشاہ کے کارنامے اور روحانی مدارج کا ذکر کیا گیا ہے۔

قدیم دور میں مصری اپنی تاریخ چمڑے، کپڑے یا کاغذ کے بجائے کتبوں، دیواروں اور بڑی بڑی چٹانوں پر کندہ کرتے تھے تاکہ تحریریں مٹنے نہ پائیں۔ یہ لوگ اس فن میں اتنے ماہر تھے کہ مصور اور کندہ کار بادشاہوں کے کئی کئی ادوار تصویری شکل میں بیان کرتے تاکہ دیکھنے والا کسی تحریر کو پڑھنے کا محتاج ہی نہ ہو۔

اب تم پوچھو گے۔ کیسے۔

ہاں پوچھنے ہی والا تھا۔ میں نے کہا۔

ایسے ہی جیسے تم ایک بادشاہ کے دور کی حقیقی فلم میں دیکھ رہے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ فلم پردہ سکرین پر چلتی ہے اور ان تصاویر کو دیکھنے والا خود چل پھر کر قدیم مندروں، معبدوں، محلات کی دیواروں اور چھتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ جو کچھ ہم فلموں میں دیکھتے ہیں ویسے ہی مناظر دیواروں پر تصویری شکل میں ڈھال دیئے گئے جسے سمجھنا اور اس پر تحقیق کرنا نسبتاً آسان ہے۔

روایات میں ہے کہ کنعان میں جب قحط پڑا اور حضرت یعقوبؑ کے بیٹے غلے کے حصول کے لئے مصر پہنچے تو انہیں ایک ایسی سرائے میں ٹھہرایا گیا جس کی دیواروں اور چھت پر حضرت یوسفؑ کے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعات تصویری شکل میں موجود تھے۔ گھر سے بھائیوں کے ساتھ سیر وشکار کے لئے نکلنا، جنگل میں بھائیوں کی بے مروتی اور تشدد، کنویں میں پھینکنا، قافلے کی آمد اور کنویں کی قید سے رہائی، مصر کے بازاروں میں غلاموں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور شاہی سوداگر کے ہاتھوں فروخت ہونا، عزیز مصر کے گھر میں بحیثیت غلام خدمت کے لئے چنا جانا، زلیخا کے ساتھ پیش آنے والے حادثات، قید خانے کی زندگی، عزیز مصر کے خواب، خوابوں کی تعبیر، عزیز مصر کے دربار میں حاضری اور مصر کی بادشاہی۔

روایات میں یہ بھی ہے کہ برادران یوسفؑ نے یہ مناظر دیکھے تو خوفزدہ ہو گئے مگر حضرت یوسفؑ کی طرف سے اچھے برتاؤ اور غلے کے فراہمی نے ان کا خوف دور کر دیا۔ بردران یوسفؑ کا خوف تو جاتا رہا مگر تجسس ختم نہ ہوا۔ قیام مصر کے دوران سرائے کے مناظر کے متعلق دریافت کیا تو پتہ چلا کہ یہ مناظر دور قدیم کے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی نامعلوم مصور نے مدتوں پہلے ایک پیغمبر کی آمد کے حوالے سے پیش گوئیاں کیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ تب تک حضرت یوسفؑ نے پیغمبری کا اعلان نہیں کیا تھا چونکہ چاند، سورج اور گیارہ ستاروں نے انہیں سجدہ بعد میں کیا۔ حضرت یوسفؑ کے اس خواب کی تعبیر بردران یوسفؑ کے دوسرے سفر کے بعد

سامنے آئی جب حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں اور بیوی سمیت حضرت یوسفؑ کے سامنے سجدہ تعظیمی بجالایا اور ان کی پیغمبری کو اللہ کے حکم اور حضرت یوسفؑ کے خواب کی تعبیر کی روشنی میں تسلیم کیا۔

نینا۔ کیا ان اہراموں، مندروں اور گورستانوں میں کسی پیغمبر کی نشانی بھی ہے؟ میں نے پوچھا۔

نہیں۔ عزیزان مصر کا دور فرعونوں کے دور سے پہلے کا ہے۔ مصر پر غیر مصریوں نے بھی حکمرانی کی، جن میں ایرانی، یونانی اور رومی حملہ آور شامل تھے مگر فرعون کا لقب صرف مصریوں کے لئے منتخب کیا گیا اور انہیں لوگوں نے شاہی گورستان، مقبرے، اہرام اور مردوں کو مسالے لگا کر محفوظ کرنے کا ہنر اپنایا۔

اہراموں اور قبرستانوں سے ملنے والی تحریروں، مجسموں، شاہی مردوں، تصویروں اور ان کے استعمال کی اشیاء سے ماہرین نے وقت کا تعین کیا اور ان کے ادوار کا اندازہ بھی لگایا۔ ان اشیاء کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ 35 سو قبل از مسیح میں مصر کا پہلا شاہی خاندان حکمرانی کا حقدار ٹھہرا جس کا بادشاہ نارمر تھا۔ ان حوالوں کے مطابق یہ سلسلہ 11 سو قبل از مسیح تک جاری رہا اور بیسویں خاندان کے بعد فراعنہ مصر کا اقتدار اختتام کی طرف مائل ہوا۔ آخری شاہی خاندان کے زوال پر مصر کئی چھوٹی چھوٹی حکمرانیوں میں تقسیم ہوا جہاں پوجاریوں، کاہنوں جاگیرداروں سے لیکر ڈاکوؤں، لٹیروں اور قبائلی سرداروں تک نے بادشاہتیں قائم کر لیں۔ مصر کی شاہانہ حیثیت اور شوکت کا سورج غروب ہو گیا اور افراتفری نے عوام کو بدحال کر دیا۔ سب سے پہلے لبیہ اور پھر نوبیا کے حکمرانوں نے مصر پر قبضہ کیا تیسرے مرحلے پر 525 قبل مسیح میں ایران نے قوت آزمائی کی اور 332 میں سکندر نے فتح کا جھنڈا لہرایا۔ 30 قبل مسیح میں رومیوں نے مصر فتح کیا اور 640 میں حضرت عمرؓ کے جری جرنیل اور مسلمان مجاہد عمر بن العاصؓ نے مصر فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مسلمانوں نے مصریوں کو رومی حکمران ہرقل کے نمائندے مقوقس سے آزادی دلوائی۔ درحقیقت مصر کی مہم مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان لڑی گئی جو کہ مصریوں کے لیے ایک نجات تھی۔ 1517ء میں ترکوں نے مصر فتح کیا اور 1880ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال پر انگریز مصر پر قابض ہو گئے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد انگریزوں نے مصر سے اپنا تسلط تو اٹھا لیا مگر شاہ فاروق کی

برطانیہ اور فرانس کچھ اس طرح معاونت کرتے جیسے آج کل امریکہ اور اتحادی پاکستان، افغانستان اور عراق پر مہربان ہیں۔ انگریزی تسلط سے خلاصی کے لئے جن لوگوں نے کوششیں کیں ان میں اخوان المسلمین کے شیخ حسن البنااوران کے ساتھی، فوجی افسروں میں انورالسادات اور جمال عبدالناصراوران کا انقلابی گروپ قابل ذکر ہیں۔ 1952ء میں شاہ فاروق بھی رخصت ہوا تو کئی سال تک مصر میں افراتفری کا عالم رہا۔ انقلابیوں نے اخوان المسلمین سے رشتہ توڑ لیا اور چن چن کر ان کے لیڈروں کو پھانسیاں دیں۔ ناصر نے عرب سوشلزم کا نعرہ لگایا مگر عرب اسرائیل جنگوں میں ناکام رہا۔ ناصر نے مایوسی کے عالم میں سویت یونین سے رشتہ جوڑا مگر روسیوں نے ناصر کو مایوس کیا۔ ناصر ہی کے دور میں نہرسویز کو قومیانے اورفرانس اور برطانیہ کے اسرائیل کے ساتھ ملکر مصر پر حملے کا واقعہ رونما ہوا جسے برطانوی عوام نے ایک دھوکہ دہی پر مبنی چال قرار دے کر 10 ڈاؤننگ سٹریٹ پر گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش کردی اور امریکہ اور روس نے معاملے کو برطانوی حق میں حل کیا مگر اسرائیلیوں نے صحرائے سینا سے واپسی سے انکار کردیا۔ اسرائیل نے اس کا نیا نام شرم الشیخ رکھا اور ناصر کے بعد انورالسادات نے مصر پر حکمرانی کی اور اس کے دور کے اہم واقعات 1973 کی عرب اسرائیل جنگ جسے رمضان المبارک کی جنگ بھی کہا جاتا ہے، اسرائیل کے ہڑپ شدہ علاقے کی واپسی اورکیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہیں۔کیمپ ڈیوڈ کے بعد عرب اسرائیل تعلقات کی نوعیت بدل گئی اور مصر کو سنیائی میں تیل کے کنوؤں سمیت شرم الشیخ کے اہم مقام پر دسترس حاصل ہوگئی۔ اس معاہدے کے بعد مصر، اردن، عرب امارات اور کچھ دوسرے عرب ملکوں نے اسرائیل کوتسلیم کرلیا۔ یہ معاہدہ مصراور اسرائیل کے درمیان نئے تعلقات کا باعث بنا جس کی بناء پر شام، لبنان اور فلسطین پر اسرائیل کو من مانی کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اسرائیل، بھارت، برطانیہ اور امریکہ کے درمیان دوستی اور مفاد کے نئے رشتے قائم ہوئے اور بہت سے عرب ممالک کا جھکاؤ بھارت اور امریکہ کی طرف ہوگیا۔

کیمپ ڈیوڈ نے مصریوں کا کھویا ہوا وقار تو کسی حد تک بحال کیا مگر عرب نیشنل ازم اپنی موت آپ مرگیا۔کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے کے بعد اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کے سبھی ممالک تک سفارتی رسائی ہوگئی۔ جو کام اسرائیل کے خفیہ ادارے ترکی، بھارت اور سابق سویت یونین کے ذریعے کرتے تھے اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی۔

ترکی کیوں؟ میں نے پوچھا۔

ترکی خلافت عثمانیہ کے بعد سیکولر ملک بن گیا۔ترکی واحد مسلمان آبادی والا ملک تھا جس کے ساتھ اسرائیل کے سفارتی تعلقات تھے۔اس لئے کسی بھی قسم کی خفیہ کاروائی اور اطلاع کے لیے اسرائیل ان ممالک کی خفیہ ایجنسیوں، سفارتی عملے اور دیگر وسائل کی مدد سے اپنا کام نکالتا۔

اگر ہم موجودہ دھشت گردی کی لہر کا ایک مختلف زاویے سے جائزہ لیں تو اس کا تعلق بھی کسی حدتک کیمپ ڈیوڈ ہی سے ملتا ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے کہا۔

نینا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

جسطرح 9/11 کے بعد دنیا کی ہیت بدل گئی اور نت نئی تھیوریاں قائم ہوئیں ویسے ہی دوسری جنگ عظیم کے خاتمے، سویت یونین کے افغانستان پر قبضے اور پھر انخلاء، امریکہ کی خطے کے ممالک خاص کر پاکستان اور افغانستان کے معاملات سے عدم دلچسپی اور چین کے سپر پاور بننے سے دنیا کے معاملات متاثر ہوئے، ویسے ہی کیمپ ڈیوڈ معاہدے نے تیل کی دولت سے مالا مال دنیا کے سب سے بڑے خزانے مشرق وسطیٰ کے معاملات بھی بدل دیئے۔ایک طرف عرب ممالک اور اسرائیل میں قربت بڑھی اور امریکہ نے عرب امارت اور سعودی عرب میں قائم اپنے اڈوں کو نہ صرف زیادہ مضبوط اور محفوظ بنانا شروع کر دیا بلکہ مقامی حکومتوں کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کردی۔ امریکہ اور اس کے اتحادی مغربی ممالک نے مشرق وسطیٰ میں اپنی سفارتی اور تجارتی پالیسی کو نیا رخ دیا اور بلیک میلنگ کا رویہ اپنا کر حکمرانوں اور مقامی لوگوں میں نفرت کی خلیج حائل کردی۔سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کو مغربی اور امریکی پالیسی ساز انسانی حقوق اور جمہوری اقدار کا ڈراوہ دکھلا کر زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے لگے اور عرب ممالک میں اپنی موجودگی اور برتری کی وجہ سے عوام کی نظروں میں گرنے لگے۔

عوام نے مغربی ممالک اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ عراق، ایران، لیبیا، شام، لبنان، سوڈان اور یمن سمیت بہت سے عرب افریقی ممالک کے ساتھ مغربی اور امریکی رویے اور دشمنی کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا۔ ایکطرف حکمران طبقہ امریکی اور مغربی ممالک کی گود میں آفیت تلاشنے لگا تو دوسری طرف عوام حکمرانوں اور ان کے پروردہ مغربی ممالک اور امریکہ کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار کرنے لگے۔یہی وہ عرب

عوام تھے جنہیں اسلام کے عظیم مجاہد قرار دیکر سویت یونین کے خلاف افغانستان میں قربانیاں دینے کیلئے تیار کیا گیا اور طویل عرصہ تک انھیں میدان جنگ کا ہیرو اور اسلام کا سپاہی بنا کر پیش کیا گیا مگر عراق کے خلاف مغربی اور امریکی جارحیت، سوڈان کی تقسیم اور ایک اور اسرائیل کے قیام کی سازش، ایرانی معاملات میں کھلی مداخلت، افغانستان کی خانہ جنگی کی صورت میں انہیں مجاہدوں کو ملک دشمن، انسانیت کے قاتل اور عالمی دھشت گرد قرار دیکر ساری دنیا کو آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا۔

القاعدہ سمیت جتنی تحریکیں چل رہی ہیں ان پر اسلام اور مسلمان کا لیبل لگا کر اس کی مارکیٹ ویلیو تو بڑھائی جاسکتی ہے مگر حقیقت سے روگردانی ممکن نہیں۔ اسلامی دہشت گردی اور مسلم بنیاد پرستی کی اصطلاحیں گڑنے میں جتنا زور مغربی اور امریکی میڈیا اور تھنک ٹینک نے لگایا اس سے کہیں بڑھ کر معاونت مغربی اور امریکی خوشنودی کے خواہاں مسلمان ممالک، حکمرانوں، میڈیا اور نام نہاد اھل علم و دانش نے کی۔

مگر نینا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تحریکیں بہرحال موجود ہیں اور ان کی بعض کاروائیاں غیر انسانی اور قابل مذمت ہیں۔

میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس موضوع پر کچھ کہوں یہ بتادوں کہ مصری تہذیب دنیا کی تمام تہذیبوں کی ماں ہے۔ یونانی، ایرانی، ہندی اور چینی تہذیبوں میں اتنا دم نہیں اور نہ ہی ہم ان کے آثار سے ملنے والی نشانیوں سے انہیں ہمہ گیر تہذیبیں کہہ سکتے ہیں۔ مصری تہذیب کے آثار ڈارک ایج Dark age کی بھی نفی کرتے ہیں۔ اگر ہم مصری تہذیب کو قرآنی تاریخ کے تناظر میں دیکھیں تو حضرت آدمؑ سے لیکر آج تک کوئی ایسا دور نہیں جہاں انسان ایک تمدن سے جڑا ہوا نہیں ملتا۔

اگر ہم افریقہ اور جنوبی امریکہ میں بسنے والے جنگلی قبائل کو دیکھیں تو ان کی بھی ایک تہذیب ہے۔ وہ جدید اور ماڈرن انسانوں سے تو ملتے ہیں۔ سائنس دان اور محقق ان کی فلمیں بناتے ہیں۔ ان کے اجزاء پر تحقیق بھی کرتے ہیں مگر انہیں قائل کر کے نیویارک، لندن اور پیرس لیجا کر بسا نہیں سکتے۔ اگر ان کی خوراک کیڑے مکوڑے، ریچھ، بندر ہیں تو کتا، بلی، چوہا اور سانپ چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگا پور اور تائیوان میں بھی دسترخوان کی زینت ہیں۔

گھوڑے، گدھے اور خچر منگولیا سے پیرس اور خنزیر لندن، نیویارک اور ماسکو میں بھی قصابوں کی دکانوں میں لٹکے انسانی زبان کے ذائقے کے منتظر رہتے ہیں۔

مصری تہذیب کا یہ بھی کمال ہے کہ اسے ہر دور میں ایک پیغمبر کی رہنمائی ملی جسکا ذکر جدید تحقیق سے نکال دیا گیا ہے۔ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ ماضی کے ان گنت بادشاہوں کی حنوط شدہ لاشیں مع ان کے خزانوں کے لوٹ لئے گئے مگر یہ لوگ اس بات کی طرف بلکل اشارہ نہیں کرتے کہ سیزر، نپولین اور آخر میں انگریزی دور میں کس قدر لوٹ مار ہوئی اور جو کچھ اہل مغرب نے وہاں سے لوٹا وہ کہاں گیا۔ جدید تحقیق کا ایک گھناؤناں پہلو یہ بھی ہے کہ فرعونوں کے علاوہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں اور عزیزان مصر کی طرف بلکل توجہ نہیں دی گئی، بہت دیر بعد کہیں جا کر ایک مدھم حوالہ ملتا ہے کہ المعارف نامی خانقاہ کا بھی ایک وجود ہے جہاں حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو پناہ ملی تھی۔ اسی طرح بائبل میں پیدائش کے باب میں ذکر ہے کہ حضرت یوسفؑ کے حکم پر حضرت یعقوبؑ کی لاش کو مصالحہ لگا کر محفوظ کیا گیا اور یہ عمل چالیس دن میں مکمل ہوا۔ اس حوالے سے یہودی مرنے والوں کا سوگ چالیس روز تک منانے لگے جبکہ اہل مصر میں سوگ کا رواج ستر دنوں پر محیط تھا۔

تمھارا اپنا کیا خیال ہے؟ ان روایات میں کچھ حقیقت بھی ہے یا محض افسانوی روایات ہیں۔ میں نے پوچھا۔

اس میں حقیقت کا شایئہ نہیں۔ نینا نے کہا۔

پھر کہنے لگی۔

پیغمبروں، ولیوں، رشیوں اور شہیدوں کی لاشیں عام انسانوں جیسی نہیں ہوتیں۔ اس کے جسموں کی مٹی اتنی پاکیزہ اور پوتر ہوتی ہے کہ زمین کی مٹی اسے کھا نہیں سکتی۔ تزکیہ اور مجاہدہ ان کے اجسام میں ایسی قوت بھر دیتا ہے کہ مٹی کے اجزاء اس پر اثر نہیں کرتے۔ 1947ء سے 1971ء تک کی جنگوں میں شہید ہونے والوں کی لاشیں ابھی تک مل رہی ہیں اور ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ تم نے عبداللہ عزام کی کتاب "میدان پکارتے ہیں" پڑھی ہے؟

نینا نے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے کہا۔

ضرور پڑھو۔ شیخ عبداللہ عزام کی تحریر تو عربی میں ہے اور یہ اسکا ترجمہ ہے۔ اگر شہید کا اتنا بڑا

مرتبہ ہے تو پیغمبر کو مصالحہ لگانے کی بات سمجھ نہیں آتی۔ پھر پیغمبر بھی حضرت یعقوبؑ جیسا۔ ساری زندگی ہی تزکیہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ ادوار کے پیغمبروں نے الہامی کتابوں کے ساتھ شریعت کا نفاذ بھی کیا جس کی روشنی میں بہت سے قائدے اور قانون بھی بدل گئے۔ بعض ادوار ایسے بھی ہوئے کہ ایک سے زیادہ پیغمبر ایک ہی وقت میں ہوئے اور ایک ہی شرعی نظام نافذ العمل رہا۔ شادی بیاہ کے احکامات، حلال وحرام چیزوں کا حکم، رشتے ناطوں کا احترام، تجہیز وتکفین، عبادات کے طریقوں سے لیکر معاشرتی میل جول اور حقوق وفرائض کا تعین ایک شرعی نظام کا خاصہ رہا۔

جیسے۔ میں نے کہا۔

جیسے حضرت عیسیٰؑ ایک کتاب تو لائے مگر شرعی نظام حضرت موسیٰؑ ہی کا رائج رہا اور وہ ان ہی کے دین پر آئے۔ حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ ایک ہی وقت کے پیغمبر ہیں جنکا پیغام اور شریعت ایک ہی تھی۔ ایسی ہی مثال حضرت یحییٰؑ، حضرت عمرانؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت یعقوبؑ کی ہے مگر کسی بھی پیغمبر کو رحلت کے بعد حنوط کیا جانا کسی شریعت سے ثابت نہیں۔

جدید تحقیق سے پیغمبروں کے ادوار اور لوٹے ہوئے خزانوں کے سراغ سے انکار نے بہت سے شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ سوائے توت عنخ آمون کے حالات زندگی اور خزانے کے باقی ادوار کو ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا گیا مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ یونانی، فرانسیسی، رومی اور انگریز حملہ آوروں نے سرزین مصر سے کتنا زر وجواہر غائب کیا اور اسے کہاں لے گئے۔

دوسری جنگ عظیٰ کے بعد کچھ نوادرات مصر کو واپس بھی کئے گئے اور بہت سے اب بھی یورپ کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا اس لوٹ مار کی بڑی مثال ہے۔ آج بھی ملکہ برطانیہ اس چوری شدہ ہیرے کو اپنے تاج میں سجائے سر پر رکھتی ہے اور برطانوی حکومت اور معاشرہ دنیا کو انسانی حقوق، آزادی اور امن کا درس دیتا ہے۔

مصری تہذیب اور اس پر ہونے والی جدید تحقیق مغربی محققین کی علمی استعداد اور ظرف کا ایک پہلو روشناس کراتی ہے جس میں بددیانتی کا عنصر بھی شامل ہے۔ وہ اپنے علم وجستجو کا دائرہ مشرق ومغرب تک تو بڑھاتے ہیں مگر فوائد اپنے گھر تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کھوج اور مہم جوئی میں چوری، ڈاکے اور دیگر قباحتوں سے حاصل شدہ دولت کو اپنے حقوق میں شامل

کر لیتے ہیں اور دوسروں پر قدغن لگاتے ہیں۔

ایسا ہی معاملہ ہمارے شمالی علاقوں کا ہے۔شاراگن گاؤں سے ملنے والی تختی کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں مگر یہ سچ ہے کہ گلیشیئر کی برفوں نے ایک گمشدہ تہذیب سے پردہ اٹھایا جسکی خبر اہل مغرب کو ہے۔شاراگن، مستاگ اور درہ شمشال ایک حقیقت ہے جس کی دوسری جانب ایک تہذیب اپنے قدیم سے جدید تک کا سفر کرتی ایک بڑی قوت میں بدل چکی ہے۔ یہ قوت جسے جدید چین کہتے ہیں اور جو ماضی قریب میں گریٹ گیم کا اہم حصہ رہی ہے اب ایک ایسی قوت بن گئی ہے جس کا اثر مشرق اور مغرب میں یکساں محسوس کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آنے والے دور میں ہمارے شمالی علاقے ایک اور گریٹ گیم کا میدان بنیں گے۔دکھ کی بات ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قائد یا قومی سطح کا لیڈر نہیں جسکی نظر مستقبل پر ہو۔ جو لوگ آج حکمران ہیں ان کا مسئلہ قومی خوشحالی،عزت اور وقار نہیں بلکہ اہل مغرب اور امریکہ کی خوشنودی ہے۔اس خوشنودی اور غلامی کو ہی ہمارے سیاسی قائدین اور پالیسی ساز کارندے تقدیر کا کھیل تصور کرتے ہیں۔

ہمارے سیاستدان اور حکمران ملک اور عوام کو ایسے ہی لوٹتے ہیں جسطرح مصر کے قبرستانوں، مزاروں اور مقبروں کو ڈاکوؤں اور لٹیروں نے لوٹا اور اپنے اجداد کی ہڈیاں بھی غیر ملکیوں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔جس ملک کی اشرافیہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو اور حکمران غیر ملکی ایجنٹوں کا روپ دھار لیں اس کی زمین کسی بھی شیطانی کھیل کا میدان بن سکتی ہے۔

قومیں بیرونی حملہ آوروں کی یلغار سے نہیں بلکہ اپنوں کی عیاری، ہوس اور بداعمالی سے تباہ ہوتی ہیں۔ ہندوستان ہی کی مثال لے لو۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہروپ میں چند سو گورے ہند کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے جن کے پاس نیل اور گرم مصالحے کی تجارت کا اجازت نامہ تھا۔ پھر ڈھاکہ کی ململ انھیں بنگال لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مرہٹوں، جاٹوں اور دکن کے نظام کی سازشوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز ایک بڑی قوت بن گئے۔سب سے پہلے انگریزوں نے فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کا خاتمہ کیا اور پھر کبھی مرہٹوں، کبھی جاٹوں اور کبھی نظام کی سرپرستی کرتے ہوئے سراج الدولہ سے لے کر ٹیپو سلطان، شاہ عالم ثانی اور آخر میں بہادر شاہ ظفر کی کاغذی سلطنت کا خاتمہ کر کے برصغیر کے مالک اور وارث بن گئے۔

پتہ ہے اس ساری کاروائی میں انگریز نے کونسی قوت استعمال کی؟ نینا نے سوال کیا۔

جدید ٹیکنالوجی، نئی بندوقیں، رائفلیں، گھڑ سوار کیولری، برچھے، نیزے اور توپیں۔ میں نے جواب دیا۔

نینا نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اکیڈیمک جواب۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

یہ ویسا ہی جواب ہے کہ کسی پاکستانی سے پوچھو کے پاکستان کی موجودہ حالت کا ذمہ دار کون ہے تو جواب ملے گا امریکہ۔ اگر یہی سوال کسی بھارتی سے پوچھا جائے تو جواب ملے گا کرپٹ سیاستدان، بے لگام نوکر شاہی جنہیں حکومتی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔

دیکھو بھائی۔ بندوقیں، بارود، توپیں اور دیگر جنگی سامان فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے پاس بھی تھا مگر ان کی جیب میں کوئی میر جعفر، میر صادق، پورنیا اور شیوا جی نہ تھا۔

سراج الدولہ کے پاس فرانسیسی توپیں تھیں مگر میر جعفر کے آدمیوں نے بارش کے دوران بارود پر پڑا ترپال ہٹا دیا اور بارود گیلا کر دیا۔ پھر ولزلی کو پیغام بھیجا کہ نواب کی توپیں بیکار ہیں اسلیے ہتھیار نہ پھینکنا۔ میر جعفر نے اگلا پیغام بھیج کر بچے کھچے انگریزوں سے کامیاب حملہ کروایا اور سراج الدولہ کو شہید کر دیا اور خود بنگال کا نواب بن گیا جسے کمپنی بہادر کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ ایسی ہی کہانی، شاہ عالم ثانی، سلطان ٹیپو، جھانسی کی رانی، بیگم حضرت محل اور جنرل بخت خان کی ہے۔

انگریز کی 99 فیصد فوج ہندوستانی مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی جو انگریز کے حکم سے ایک کے بعد ایک ہندوستانی ریاست کو فتح کرتے انگریز کی غلامی میں دیتے رہے۔ کسی نے مذہب، نسل اور فرقے کا خیال نہ کیا اور آقا کے حکم پر اپنے ہی بھائیوں، بیٹوں اور بیٹیوں کے گلے کاٹتے رہے۔ آج افغانستان کی حالت دیکھ لو! کبھی ایک طبقہ روسیوں کو بلا لاتا ہے اور دوسرا امریکہ اور نیٹو کو اور اپنے ہی لوگوں کا خون بہاتا ہے۔ ہی حال پاکستان کا ہے۔ پنجابی طالبان اور پاکستانی طالبان ایک باقاعدہ فوج بن کر اپنے ہی ملک پر حملہ آور ہیں اور اغیار کے ہاتھوں کھیل رہے ہیں۔

یہی حالت سیاسی لیڈروں اور سیاسی جماعتوں کی ہے۔ طالبان گلے کاٹ رہے ہیں اور سیاستدان اور حکمران غیر ملکی اشاروں پر اپنے ہی ملک کے وسائل لوٹ رہے ہیں۔ یوں دیکھیں تو دونوں طرف طالبان ہی ہیں۔ گلے کاٹنے والے اور بموں سے اڑانے والے کام آسان

کر دیتے ہیں اور جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا انہیں خود ہی مٹی میں دبا بھی دیتے ہیں۔ بعض جگہوں پر اتنا بارود لگاتے ہیں کہ کفن دفن کیلئے بھی کچھ نہیں بچتا۔ وہ جو سیاست اور جمہوریت کی آڑ میں لوٹتے ہیں ان کا طریقہ زیادہ دردناک اور ظالمانہ ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے بلٹ پروف مرسڈیز کاروں میں گھومتے ہیں۔ ان کا اَن پانی بھی یورپ اور امریکہ سے آتا ہے۔ ان کے سوٹ پیرس کے درزی سلائی کرتے ہیں اور ہوٹل کے جس فلور پر رہتے ہیں سارا فلور ہی بک کرا لیتے ہیں تا کہ اُن کی عیاشیوں اور خرمستیوں کا کوئی گواہ نہ ہو۔ دیگر عیش و آرام اتنا کہ عرب شہزادے اور شیخ شرما جاتے ہیں۔ جمہوریت کے نام پر لوٹ مار اور ڈاکہ زنی ہماری سیاست کا نیا روپ ہے۔ پاکستان کے ولی عہد نے فرمایا ہے کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔ شاہی فرمان جاری ہوتے ہی لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ وزیروں مشیروں اور نوکر شاہی نے ہر ادارے کو لوٹنا اور عوم سے انتقام لینا شروع کر دیا۔

سیاسی اور جمہوری طالبان نے غربت، مہنگائی، قانون شکنی، عیش و عشرت اور بے حسی کو اسقدر ترقی دی کہ عام آدمی اپنی عزت نفس سے بھی محروم ہو گیا۔

لوگ جمہوریت کی برکت سے سسک سسک کر مر رہے ہیں اور جو خود نہیں مرتے وہ دوسروں کو مار کر اپنے مرنے کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ جب طالبان مار مار کر تھک جاتے ہیں اور ٹیلیویژن چینلوں پر موت کا کوئی تازہ منظر دکھائی نہیں دیتا تو کراچی میں سیاسی جماعتیں اس منظر کشی کا انتظام کرتی ہیں۔

ٹارگٹ کلنگ کی اصطلاح بھی جمہوی انتقام کی ایک کڑی ہے۔ تین چار دنوں میں پندرہ بیس لوگوں کو نشانہ باندھ کر مارا جاتا ہے پھر گورنر ہاؤس میں سیاستدان، بیوروکریٹ اور وزیر مشیر مل بیٹھے ہیں اور مسلے کا حل نکالتے ہیں۔ مسئلہ حل ہوتا ہے۔ مرنے والوں کو دفنا دیا جاتا ہے۔ قاتل نہیں ملتا کچھ لوگ پکڑے جاتے ہیں جنھیں کچھ روز بعد باہمی مفاہمت اور جذبہ خیر سگالی کے پیش نظر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حکمران جماعتوں کی کور کمیٹیوں کا اجلاس ہوتا ہے۔ امن وامان کی صورت حال پر غور کیا جاتا ہے۔ مرنے والوں کیلئے دعائے مغفرت ہوتی ہے اور موت کا نیا ایجنڈا تیار کیا جاتا ہے۔

نینا۔ پھر طالبان اور حکمران میں فرق کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

کہا نا! مارنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ طالبان کی موت قدرے آسان ہے اور

حکمرانوں کا طریقہ بھیانک، دردناک، بے آبرو آنا اور بے غیرتانہ ہے۔

بے غیرتانہ سے کیا مطلب؟ میں نے کہا۔

بندہ بے غیرت، بے آبرو اور ذلیل وخور ہوکر اذیت ناک موت مرتا ہے۔

تم انگریز حکمرانوں کی تابعدار دیسی فوجوں کی بات کرہی تھی۔

میں نے موضوع بدلا۔

ہاں! اگر واقعی تم حقیقت میں دلچسپی رکھتے ہو تو سیتا رام کی سرگزشت پڑھو۔

یہ سیتا رام کون تھے؟

میں نے پوچھا۔

سیتا رام برٹش انڈین آرمی کا سپاہی تھا۔ پورا نام سیتا رام پانڈے تھا۔ سیتا رام **1812ء** میں بنگال کی ایک دیسی رجمنٹ میں بھرتی ہوا اور **1860ء** میں بحیثیت صوبیدار ریٹائر ہوا۔ سیتا رام کی کہانی ہندباسیوں کی گورا فرمانبرداری کی سچی اور عجیب وغریب کتھا ہے۔

سیتا رم انگریز کے حکم پر سکھوں، مرہٹوں، ہندوؤں اور مسلمان راجوں سے لیکر نیپال کے گورکھوں تک لڑا۔ وہ زخمی اور قید ہوا مگر کمپنی بہادر کا وفادار رہا۔ وہ پہلی افغان جنگ میں شرکت کیلئے سندھ کے صحراؤں سے گزرتا درہ بولان کے راستے کوئٹہ اور قندہار پہنچا اور پھر افغان باغیوں کی رہنمائی میں اپنے سینکڑوں ہندوستانی ساتھیوں اور انگریز افسروں کی ماتحتی میں کابل میں داخل ہوا۔ انگریز نے بالاحصار پر فتح کا جھنڈا لہرایا، کچھ باغیوں کو قتل کیا اور جو بچ گئے وہ پہاڑوں میں روپوش ہوگئے

طالبان سٹائل۔

میں نے کہا۔

ہاں! بلکہ افغان سٹائل۔ نینا نے جواب دیا اور پھر بولی۔

افغانوں نے برف باری کا انتظار کیا اور جب کابل کے اردگرد پہاڑوں نے برف کی چادر اوڑھ لی اور کابل کی گلیوں اور بازاروں کا نقشہ برف نے بدل دیا تو پہاڑں میں چھپے افغان واپس آگئے۔ گورے فوجیوں، افسروں اور ہندی سپاہ کو چن چن کر قتل کیا۔ جو بچ گئے انھیں ہندوستان جانے کی اجازت تو دے دی مگر راستے میں جگہ جگہ گھات لگا کر انھیں تہہ تیغ کردیا۔ سیتا رام پانڈے پاوندوں کی قید میں آیا اور پھر بکتا، بچتا اور بھاگتا ہندوستان پہنچا۔

سیتا رام اڑتیس سال فوج میں رہا اور وفاداری کی عمدہ مثال بنا رہا۔ سیتا رام کو پنشن پر بھیجنے سے پہلے صوبیدار کا عہدہ ملا جسے برائے نام ہی کہا جا سکتا ہے۔

سیتارام کی زندگی کا سب سے دکھی اور دردناک دور 1857ء کی جنگ آزادی کے باغیوں کو گولیوں سے اڑانا تھا۔ انگریز کے حکم پر وہ یہ کام بھی کرتا رہا اور ایک دن جن باغیوں کو گولی مارنے وہ آیا ان میں اسکا اپنا جوان بیٹا بھی شامل تھا۔

نینا! تم نے پہلے بھی اس غلامی، سفا کی، اور درندگی کا ذکر کیا ہے۔

میں نے کہا۔

ہاں! نینا نے جواب دیا۔

کوئی دوسری بات کرو۔ میں نے کہا۔

میں دوسری بات کیلئے ہی یہ بات کر رہی تھی۔

سیتارام ہند باسیوں کی داستان کا ایک کردار ہے جنھوں نے انگریز کی وفاداری میں اپنوں کا قتل کیا، اپنی حکمرانی اور حکومت تباہ کی اور ایک غیر ملکی تجارتی کمپنی کو دنیا کی عظیم سلطنت کا مختار کل بنا دیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ ہند کے ہندو، سکھ اور مسلمان اپنے غیر ملکی آقاؤں کی خاطر لڑنے مرنے اور چند ٹکوں کے معاوضے کی خاطر افغانستان، ایران، ترکی، مصر، اٹلی اور جرمنی سے لیکر جاپان تک چلے گئے اور اپنی جوانیاں ملکہ معظم کے تاج اور سلطنت کی رکھوالی کیلئے نذرانہ کر دیں۔

اب اسکا دوسرا رخ دیکھو۔

انگریز کی چالبازیوں اور حکمران طبقے کی عیاشیوں، بداعمالیوں اور اندرونی سازشوں کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ تو ہو گیا مگر مصر اور ترکی نے انگریز کی چوہدراہٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ترکی جرمن کیمپ میں چلا گیا، ایران کی حیثیت بھی مشکوک اور متنازعہ رہی چونکہ ایرانی قوم نے انگریز اور روس کی بالادستی قبول نہ کی۔ یہی حال مصر کا ہوا۔ شاہ فواد کے بعد شاہ فاروق کمسنی کے دور میں بادشاہ بنا جس پر اس کی ماں، انگریز مشیروں اور ملٹری کا اثر تھا مگر بعض اوقات وہ ایسے فیصلے بھی کر دیتا جو انگریز کیلئے ندامت کا باعث بنتے۔

جیسے کبھی کبھی حامد کرزائی کے اندر کا پٹھان کروٹ لیتا ہے اور امریکہ اور اس کے اتحادی پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا۔

ہاں! تقریباً ایسے ہی۔ نینا نے ہنس کر کہا۔

میں شاہ فاروق اور مصریوں کی بات کر رہی تھی۔ دوسری عالمی جنگ میں اتحادیوں کا ہیڈ کوارٹر مصر میں تھا اور جرمنوں نے بن غازی پر قبضہ کر کے برطانوی افواج کو بڑا دھکا لگایا۔ جنرل رومل لیبیا آیا تو مصر میں حالات برطانیہ کے خلاف ہو گئے۔ یہ 1942 کا واقع ہے کہ برطانیہ نے شاہ فاروق پر دباؤ ڈالا کہ وہ برطانوی ایجنٹ مصطفیٰ نحاس پاشا کو حکومت سازی کی دعوت دے تا کہ مصطفیٰ مصری رائے عامہ کو برطانیہ کے حق میں ہموار کرے۔ شاہ فاروق نے انکار کیا تو برطانوی ٹینکوں نے ابادین محل کا محاصرہ کر لیا اور زبردستی شاہ کے نام سے فرمان جاری کروا کر نحاس پاشا کی حکومت قائم کر دی۔

انگریز کی یہ چال بھی ناکام ہوئی۔ مصری فوج کے نوجوان افسروں جمال عبدل ناصر اور انورالسادات کے حامیوں نے بغاوت کر دی۔ مصری عوام نے نوجوان افسروں اور اخوان المسلیمون کے حق میں مظاہرے کیے۔ جرمن جرنیلوں کو قاہرہ پر حملہ کی دعوت دی اور مدد کیلیے خط لکھے۔ چرچل نے ڈپلومیسی کا کھیل کھیلنا چاہا مگر ناکام رہا۔ برطانوی پالیسی میں کچھ لچک آئی اور مصری فوجوں کو بھی جدید ہتھیار زیادہ تنخواہیں اور مراعات دیکر میدان جنگ میں تعنیات کیا مگر مصریوں نے انگریز کی جنگ لڑنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی حکومت نے مجبوراً ان علاقوں پر بھی خود کنٹرول سنبھالا اور بعض جگہوں پر انکا دفاع کمزور ہو گیا۔

ان دنوں ایک اور واقع نے انگریز کو شدید صدمہ پہنچایا جب مصری فوجی یونٹوں نے انگریز کی خاطر جنگ لڑنے سے انکار کر دیا تو انگریزوں نے حکم جاری کیا کہ اگر ہماری خاطر لڑتے نہیں تو ہتھیار واپس کر دو۔ مصریوں نے یہ بھی نہ مانا اور ہتھیار واپس کرنے سے بھی انکاری ہو گئے۔ انگریزوں نے پہلے آنکھیں دکھائیں اور مصری فوج کو غیر مسلح کرنے کی دھمکی دی مگر حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔

مصر، ایران اور ترکی ہند کے مقابلے میں چھوٹے ملک تھے۔ وسائل اور آبادی کی کمی تھی مگر قومی غیرت اور جذبہ حب الوطنی کا فقدان نہ تھا۔ کچھ لوگ انگریز کے حامی بھی تھے مگر بحیثیت قوم ان تینوں ممالک میں جذبہ جرأت مثالی رہا۔

اب اگر ہم بھارت، پاکستان اور افغانستان کا موازنہ کریں تو افغانستان اور بھارت کی پوزیشن پاکستان کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

افغانستان پر نیٹو افواج کا قبضہ ہے اور سوائے چند لوگوں کے سارے افغان قبائل امریکہ اور ان کے حامیوں کے خلاف بحالت جنگ ہیں۔ افغان طالبان کا طریقہ کار ویسا ہی ہے جیسے یوگو سلاویہ کے مارشل ٹیٹو کا جرمنوں کے خلاف تھا۔ شروع شروع میں ٹیٹو کو روس کی طرف سے مدد ملتی تھی مگر کم تھی۔ ٹیٹو کے گوریلہ دستے جرمنوں سے چھینے ہوئے ہتھیار جرمنوں ہی کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ آج طالبان کی بھی یہ حالت ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ان کی مدد نہیں کرتا اور نہ ہی کرسکتا ہے مگر پھر بھی وہ دنیا بھر کی جدید ترین افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔

تم نے مرجا آپریشن کا سنا ہے؟ نینا نے پوچھا۔

سنا ہے مگر تفصیل معلوم نہیں۔ میں نے کہا۔

مرجا جنوبی افغانستان میں ایک چھوٹی سی بازار ہے جہاں چند کچی پکی دکانیں، ایک گاؤں اور کچھ باغات اور کھیت ہیں۔ یہ ایک نیم پہاڑی، نیم صحرائی علاقے کا شاپنگ سنٹر ہے جہاں سے لوگ ضروریات کی چند چیزیں خریدتے ہیں اور اپنا فالتو غلہ، پھل، سبزیاں، اون، چمڑا، لکڑی وغیرہ بیچتے ہیں بلکہ ان چیزوں کے بدلے میں چائے، چینی، ادویات، تیل وغیرہ لیتے ہیں۔ افغان دیہاتیوں کی زیادہ ضروریات نہیں ہوتیں۔ یہ لوگ دودھ، قہوے، لسی یا پھر پھلوں کی چٹنی کے ساتھ روٹی کھالیتے ہیں۔ برطانوی اور امریکی افواج نے کئی ماہ تک میڈیا پر شور مچایا کہ مرجا پر ایک بڑا حملہ ہونے والا ہے جو طالبان کیلئے مہلک ثابت ہوگا بلکہ ان کے مکمل خاتمے کا باعث بھی بنے گا۔ پچیس ہزار کے لشکر کو جدید ٹینکوں، ہیلی کاپٹروں اور ہوائی جہازوں کی مدد حاصل ہوگی اور دنیا بھر کے خفیہ اطلاعات دینے والے ادارے اس یلغار کی معاونت کرینگے۔ امریکی اور برطانوی حکومتوں کے منصوبوں کی خبر ہوتے ہی دنیا بھر کے کرنٹ اور پرنٹ میڈیا نے خبروں، تبصروں اور تجزیوں کے انبار لگا دیے اور طالبان کے مکمل خاتمے اور کابل میں قائم کردہ مغربی حمائتکاروں کی حکومت کی مضبوطی کی پیشگوئیاں کیں۔

مجھ سمیت وہ سب لوگ جو نہ تو تجزیہ نگار تھے اور نہ ہی کسی تھنک ٹینک کا حصہ، برطانوی اور امریکی خودفہمی پر مبنی بازی گری پر ہنس رہے تھے کہ یہ لوگ کیوں اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

تمھارے ہنسنے کی وجہ؟ میں نے پوچھا۔

اگر کوئی کہے کہ تمھارے گاؤں کے باہر جو درختوں کا جھنڈ ہے۔سڑک کے کنارے دس کچی پکی دکانیں اور چھپر ہوٹل ہیں۔سڑک کے کنارے جو ریت کے ٹیلے ہیں وہاں امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتیں تقریباً تین ڈویژن پیدل فوج اور سینکڑوں ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور دیگر جدید سازوسامان کے ساتھ حملہ کرنے والی ہیں تو تم اس پر کیا کہو گے؟ نینا نے سوال کیا۔

میں کہوں گا یہ کسی پاگل نے یا پھر کسی نشئی نے پاگل پن کے دورے کے دوران یا پھر چرس کا سوٹا لگا کر بھڑ ماری ہے۔میں نے جواب دیا۔

ہم بھی اسی لیے ہنسے بلکہ ہنستے ہنستے رو پڑے چونکہ ہم ان صحراؤں، کچے گھروں پر مشتمل دیہاتوں اور بازروں سے واقف ہیں۔نینا نے کہا اور پھر بولی۔

مگر یہ ہوا۔امریکہ اور برطانیہ نے مرجا پر حملہ کیا۔بستی پر ہوائی اور زمینی فوج نے گولہ باری کی۔بڑے بڑے پٹھو اٹھائے، بھاری بوٹوں اور ہتھیاروں کا بوجھ اٹھائے برطانوی اور امریکی فوجی اپنے حکمرانوں کو کوستے مرجا کی گلیوں، درختوں کے جھنڈ، ریت کے ٹیلوں پر پہنچے تو خوف اور دہشت ان کے چہروں پر عیاں تھی جو ان کی سب سے بڑی دشمن بھی تھی۔

مرجا پہنچنے سے پہلے ان خوف زدہ فوجیوں نے ایک جنازے اور ایک بارات کو طالبان کی پلٹن سمجھ کر ان پر ہوائی حملہ کیا اور سینکڑوں بے گناہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھون ڈالا۔کئی روز تک وہ اسے طالبان پر کامیاب حملہ کہنے پر ڈٹے رہے اور بعد میں معذرت کر لی۔

مرجا میں لڑائی کا احوال سناؤ۔میں نے کہا۔

کونسی لڑائی؟ نینا نے الٹا سوال کر دیا۔

وہی لڑائی جسکا میڈیا پر پرچار ہوا۔میں نے کہا۔

میں نے کہا نا کہ یہ لڑائی خوف، ندامت، ہٹ دھرمی، جدید ٹیکنالوجی کے گھمنڈ اور تکبر کی لڑائی تھی۔جب یہ فوجیں مرجا جا رہی تھیں تو طالبان نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھا کر بہت سی گاڑیوں اور ٹینکوں کو تباہ کیا، بہت سے فوجی بھی مارے گئے مگر طالبان نظر نہ آئے۔اَن دیکھے دشمن، بارودی سرنگوں اور راکٹوں کی اچانک بارش کے خوف میں مبتلا یہ فوج وقت مقرر سے کئی ہفتے بعد مرجا پہنچی تو وہاں صرف گاؤں کے چند لوگ تھے۔فوجیوں نے پوزیشنیں سنبھالیں تو گاؤں کے بچے اور بوڑھے ان سے ملنے آ گئے۔حال احوال پوچھا۔افغان مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں کھانے اور چائے کی دعوت دی جو مغربی اخلاقیات کا شیوہ تو نہیں مگر

شرمندگی اور ندامت کا باعث ضرور ہے۔

نینا ان لوگوں کو فوجیوں سے ڈر نہیں لگتا؟ میں نے پوچھا۔

افغان گاڑی اور ہتھیار سے نہیں ڈرتا۔ ہر افغان پیدائشی ڈرائیور اور فائیر رہوتا ہے۔ وہ ایک بار ٹینک، ٹرک، موٹر کار، رائفل، پستول سے لیکر توپ تک کا بغور معائنہ کر لے یا کسی کو چلاتے دیکھ لے تو اگلی بار وہ یہ کام خود کر لیتا ہے۔ گاڑی اور ہتھیار افغان کی کمزوری ہے۔ ایک بار اسے چیز پسند آجائے تو وہ اسے حاصل کر کے رہتا ہے۔

تم افغانوں کا بھارتیوں اور پاکستانیوں سے موازنہ کر رہی تھی؟ میں نے نینا کو یاد دلایا۔

میں ذہنیت کی بات کر رہی تھی۔

افغان ذہنیت نہیں بدلی۔ وہ جان و مال کی قربانی دے سکتا ہے۔ باہم لڑتا ہے اور قبائلی دشمنیاں صدیوں سے جاری ہیں۔۔۔ وہ غربت وافلاس میں زندہ رہ سکتا ہے مگر غلامی اور بیچارگی قبول نہیں کرتا۔ اسے اپنے چٹیل میدانوں، بے آب صحراؤں، برف پوش پہاڑوں اور ندی نالوں سے عشق ہے۔ وہ کسی غیر ملکی کو اپنی سرزمین پر برداشت نہیں کر سکتا۔

میں ایک بار ایک افغان مجاہد کمانڈر سے ملی جسکا تعلق گردیز کے ایک نواحی قصبے مچل غو سے تھا۔ انتہائی سنجیدہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ دہلی یونیورسٹی کا گریجویٹ اور سری نگر یونیورسٹی سے ماسٹر ڈگری حاصل کی تھی اور انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے کمیشن لینے کے بعد سردار داؤد کے دور میں فوج میں میجر کے عہدے پر فائز رہا اور روسی مداخلت پر مجاہدین سے مل گیا۔ اس شخص نے دنیا دیکھی تھی۔ ربانی حکومت نے اسے پاکستان اور سعودی عرب میں سفارت کاری کیلئے بھی چنا اور کافی عرصہ تک وہ ان ممالک میں سفارتی مشن پر بھی رہا۔

میری طویل گفتگو کے دوران اس نے ایک انتہائی اہم بات کی کہ افغانوں کو کرائے پر تو لیا جا سکتا ہے خریدا نہیں جا سکتا۔ میری حیرانگی پر بولا کہ انگریزوں نے پہلی اور دوسری افغان جنگ کے دوران کچھ افغانوں کو ساتھ ملایا مگر خرید نہ سکے اور نتیجہ انگریز کی شکست اور بربادی میں نکلا۔ روسیوں نے تاریخ سے سبق نہ سیکھا اور ایک ٹولے کو کرائے پر حاصل کیا اور پورے افغانستان میں ٹینکوں کے کئی ڈویژن لگا دیے اور افغانستان کے آسمانوں پر جہازوں اور ھیلی کاپٹروں کا سائیہ کر دیا مگر نتیجہ شکست اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔ اب بھارت سمیت امریکہ سارے مغربی اور مشرقی اتحادیوں کو افغانستان میں لے آیا ہے تاکہ شکست اور ندامت کے اثرات

اکیلئے اسکے سر نہ آئیں۔اب ذرا بھارت کی طرف بھی دیکھوتو منظر میں تبدیلی ہے۔

کیسی تبدیلی؟میں نے پوچھا۔

ذہنیت،سوچ،قومی وقاراور دوراندیشی کی تبدیلی۔

آج کا بھارت سیتارام کا بھارت نہیں،کوئی ملک بھارت پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرسکتا۔کسی بھارتی سیاستدان کے اثاثے بیرون ملک نہیں۔کانگریس کی لیڈر سونیا گاندھی ہے مگر فیصلے کانگریسی رہنما ہی کرتے ہیں۔سونیا کی حیثیت واجبی اور تمثیلی ہے تاکہ نہرو خاندان کے نام سے عوام الناس کی وابستگی قائم رہے۔نہرو اور بھٹو خاندان میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔نہرو کی حیثیت بھارت میں ویسی ہی تھی جیسی قائداعظم کی پاکستان میں۔امریکہ ہو یا برطانیہ یا کوئی دوسرا ملک وہ بھارت کو اپنا باجگزار نہیں سمجھتا اور نہ ہی بھارتی ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔امریکہ کا معمولی افسر اور تیسرے درجے کا سفارتکار پاکستانی صدر اور وزیراعظم کے گھر اور دفتر جا سکتا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر حکم جاری کرتا ہے۔یہی افسر جب بھارت، بنگلہ دیش، بھوٹان،سری لنکا اور نیپال پہنچتا ہے تو اسے اپنی اوقات اور حدود میں رہنا ہوتا ہے۔وہ اپنے ہم رتبہ اور ہم منصب شخصیات سے ملتا ہے اور کام کی بات کرتا ہے۔

قصور کس کا ہے؟میں نے پوچھا۔

پاکستانی عوام اور قومی ذہنیت کا۔ہمارے ہاں کرائے کے سیاسی لیڈر، سفارتکار، جرنیل، صحافی، بیوروکریٹ اور دانشور تو میسر ہیں ہی مگر سونے پر سہاگہ کہ ساری قوم ان لیڈروں کی ایماء پر بکنے کو تیار ہی نہیں رہتی بلکہ بک جاتی ہے۔اس کی ایک مثال ریمنڈ ڈیوس کے ہاتھوں مرنے والے وہ تین نوجوان ہیں جن کا سودا ججوں ، جرنیلوں اور سیاسی لیڈروں نے کیا اور یوں ہر پاکستانی کی ایک قیمت مقرر کردی۔اب امریکہ والوں پر منحصر ہے کہ وہ کب پاکستانی شکار کرنے آتے ہیں اور دیت دیکر چلے جاتے ہیں۔موجودہ فوجی اور سیاسی قیادت نے یہ ہنر بھی مشرف سے سیکھا۔فرق صرف اتنا ہے کہ مشرف ڈئرکٹ رقم لے کر پاکستانی امریکیوں کے حوالے کرتا تھا اور اس کے جانشینوں نے اسے دیت کا نام دے دیا ہے جبکہ یہ دیت فاٹا والوں پر لاگو نہیں ہوتی چونکہ فاٹا کی عوام کیلئے قوانین علیحدہ ہیں۔

اب تم پوچھو گے کیسے تو میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔

بتاؤ۔بلکہ سمجھاؤ۔میں نے کہا۔

ہمارے سیاستدانوں نے ابتدا ہی غلطیوں سے کی جسکی پہلی اینٹ لیاقت علی خان نے رکھی۔ مسئلہ کشمیر برطانیہ اور بھارت کا پیدا کردہ تو ہے ہی مگر اسے مزید الجھانے میں مرحوم لیاقت علی خان کے کردار کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح امریکہ نوازی اور روس کی اہمیت کو کم کرنے میں بھی مرحوم نے ایک ایسا رول ادا کیا جسکی قیمت ہم آج تک چکا رہے ہیں۔ لیاقت علی خان کے بعد سازشوں کا دور شروع ہوا جو کسی نہ کسی صورت نسل در نسل منتقل ہوتا موجودہ سیاسی کلچر کا حصہ بن چکا ہے۔ اسمبلیوں اور سیاسی پارٹیوں میں ہم خیال گروپ، فارورڈ بلاک اور مولانا فضل الرحمٰن کے سیاسی پینترے جنھیں وہ آئینی تناظر اور ملکی مفادات میں بدلتے ہیں اس امر کی زندہ مثالیں ہیں۔

قائداعظم کے بعد حسین شہید سہروردی، ذوالفقار علی بھٹو اور بینظیر بھٹو اچھے اور باصلاحیت سیاستدان تھے۔ حسین شہید سہروردی کا وقت اور حالات نے ساتھ نہ دیا اور سازشی ٹولہ انہیں ملک بدر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ لوگ جو بھٹو، مجیب اور یحییٰ ومشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ملزم ٹھہراتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ اس حادثے کا اصل مجرم ایوب خان ہے جس نے مشرقی پاکستان کی حقیقی سیاسی قیادت اور پاکستان سے عشق کرنے والے قائدین کو ایڈو کی چھری سے قتل کیا اور مجیب جیسی قیادت کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو باصلاحیت لیڈر تو تھے مگر نہ وہ اپنی صلاحیتوں کا فائدہ اٹھا سکے اور نہ ہی اپنے منصوبوں کی تکمیل کیلئے صبر وتحمل کا مظاہرہ کرسکے۔ بھٹو کی پرورش جاگیردارانہ اور آمرانہ انداز میں ہوئی۔ وہ عوام کو رعایا اور اپنے ساتھیوں کو ماتحت سمجھتے تھے۔ ان کے وہ دوست جو انہیں جیسے ماحول کی پیداوا تھے ماتحت اور باجگزار حیثیت میں پارٹی میں نہ رہ سکے۔ وہ جنھوں نے علم بغاوت بلند کیا وہ ذلیل وخوار ہوئے اور جنھوں نے چپ سادھ لی وہ بھٹو کے زوال پر بھی چپ ہی رہے۔ بھٹو کے دوست بھٹو کے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے۔ وہ وقت پر چپ رہے اور جب وقت گزر گیا تو ضیاء الحق سے بھٹو کی زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ وقت ایسا ہے کہ ضیاء الحق بھٹو کی جان بخشی نہیں کریگا اور اگر ایسا ہوگیا تو پہلے ضیاء الحق جائے گا اور پھر بھٹو۔

کہاں؟ میں نے پوچھا۔

دنیا سے۔ نینا نے جواب دیا۔

دیکھو۔ اگر ضیاء الحق بھٹو کو بخش دیتا تو بھٹو کبھی ضیاء الحق کو معاف نہ کرتا۔ ضیاء الحق کی ذلت و رسوائی میں فوج کے بہت سے اعلیٰ عہدیدار بھی شامل ہوتے اور پھر ایک خونی انقلاب کی صورت میں بھٹو بھی اپنے ساتھیوں سمیت جاتے۔

مرحوم غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر نے قوم کو یہ تو بتایا کہ وہ بھٹو کی جان بخشی کیلئے ضیاء الحق سے رابطے میں تھے مگر یہ نہیں بتایا کہ ضیاء نے انہیں کیا جواب دیا۔

جواب کیا تھا؟ میں نے پوچھا۔

جواب یہ تھا کہ جس طرح تم نے بھٹو کے کہنے پر آرمی، نیوی اور ائیرفورس چیف کو وزیراعظم ہاؤس سے اغوا کر کے ذلیل کیا اور پھر گن پوائینٹ پر استعفیٰ لیا، فوج اس رسوائی کو کبھی نہیں بھولے گی اور آئندہ کبھی تم لوگوں کے چکمے میں نہیں آئے گی۔

بھٹو نے ایک طرف شاندار کام کیے۔ کامرہ، ٹیکسلا، سنجوال اور ایٹمی پلانٹ جیسے پراجیکٹ، ہر شہری کو پاسپورٹ کی سہولت اور بیرون ملک روزگار کے مواقع یقیناً سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں مگر دوسری جانب بھٹو نے اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہ کی اور سب پر یکساں غضب ناک ہوئے۔ بھٹو کے کچھ دشمن جان سے بھی گئے اور دوست ذلت و رسوائی کی مثال بنے۔ بھٹو نے اشرافیہ کے مقابلے میں معاشرے کے ایسے لوگوں کو سیاست میں متعارف کروایا جو آگے چلکر ایک ایسے سیاسی کلچر کا حصہ بن گئے جسکا مقصد شرفا کو بے عزت کرنا، ملکی اداروں کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرنا، دھونس دھاندلی اور ناجائز طریقوں سے دولت اکٹھی کرنا اور مخالفین کو عبرت کی مثال بنانا تھا۔ بدقسمتی یہ کہ ان لوگوں نے اس کلچر کو بھٹوازم کا نام دیکر ایک نئی اصطلاع اخذ کی اور جو لوگ اس کلچر کا حصہ بنے انھیں جیالہ کہا جانے لگا۔

اس کلچر اور جیالہ ازم کا مقابلہ کرنے کیلئے دیگر سیاسی پارٹیوں جن میں مذہبی سیاسی پارٹیاں بھی شامل ہیں ایسے ہی کلچر کو فروغ دیا اور بغیر کوئی نام لیے اپنے اپنے لبادے میں جیالے اور متوالے بھرتی کر لئے۔ جس ملک کا سیاسی کلچر کرپشن دھونس دھاندلی، اداروں اور اشرافیہ کی تذلیل اور لاقانونیت ہو وہاں ڈکٹیٹرشپ سے بہترین نظام حکومت ہو ہی نہیں سکتا۔ پاکستانی عوام کی بدقسمی کہ اس ملک میں کچھ بھی خالص نہیں ہوتا۔ نہ جمہوریت اور نہ ہی آمریت۔ آمروں کے ساتھ سیاستدان، قانون دان، آئینی ماہرین اور سول سوسائٹی کا ایک طبقہ بھی برسراقتدار آتا ہے اور آمر کے زیر سایہ استحصال کرتا ہے۔ جمہویت دراصل آمریت سے کئے گئے کسی نہ کسی

معائدے مفاہمت یا پھر مجبوری کی صورت میں آتی ہے جسکا طریقہ حکمرانی آمرانہ ہوتا ہے۔ ہر سینٹر، ایم این اے اور ایم پی اے ہی نہیں بلکہ ان کے رشتہ دار، گماشتے اور جیالے متوالے سبھی ملک کے صدر اور وزیرِاعظم ہوتے ہیں۔ وہ جسے چاہیں ذلیل و رسوا کردیں، اس کی عزت و ناموس سے کھیلیں، زمین جائیدا، دکان و مکان پر قبضہ کرلیں یہ سب عدلیہ اور انتظامیہ کی نگرانی میں کروایا جاتا ہے اور عوام کے ایک بڑے طبقے کی بھی انہیں حمائت حاصل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شہر بیرونی حملہ آور اور فاتح حکمران بساتے ہیں اور پھر شہر والے اسے برباد کرتے ہیں۔ جب لوگ شہروں اور بستیوں کو سیاسی عقائد اور مذہبی مسالک کے نام پر برباد کرنے کا تہیہ کرلیں تو انہیں بچانے کوئی نہیں آتا البتہ اجڑی بستیوں اور لٹے شہروں سے بچا کھچا لوٹنے چور، ڈاکو اور لٹیرے ضرور آتے ہیں۔ اب تو یہ چور، ڈاکو اور لٹیرے بھی بے صبر ہوگئے ہیں۔ جب سے ہم نے اپنی بستیوں اور شہروں کو برباد کرنے کا ارادہ کیا ہے یہ لوگ بھی بھیس بدل کر ہماری صفوں میں داخل ہوگئے ہیں تا کہ بربادی کا عمل تیز ہو اور لوٹ مار میں دیر نہ لگے۔ وہ خود ہی ہمارے سیاستدانوں، لیڈروں، افسروں اور حاکموں کو نت نئے طریقے بتانے لگے ہیں کہ شہروں اور بستیوں کو کیسے اور کم سے کم وقت میں برباد کیا جاتا ہے اور لوٹی ہوئی دولت کو کیسے اور کہاں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ وہ جو ملک اور مذہب کے نام پر بربادی کا بیڑا اٹھاتے ہیں انہیں بھی معقول معاوضہ اور ماحول مہیا کیا جاتا ہے تا کہ مکمل بربادی میں دیر نہ لگے۔

اب اس کی ایک مثال بھی سن لو۔ 1960ء کا واقعہ ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر کریگ امریکی قونصلیٹ کا پولیٹیکل افسر تھا۔ یہ شخص پورے پاکستان میں گھومتا پھرتا اور لوگوں کو بتاتا کی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا کوئی رشتہ نہیں چونکہ ان کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ ہے اس لیے بہتر ہے کی دونوں حصے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں ۔ یہ باتیں وہ پاکستانی اشرافیہ، بیوروکریسی ،فوجی جرنیلوں اور صحافیوں کے سامنے کرتا مگر کسی میں جراءت و غیرت نہ ہوتی کہ وہ اس کا منہ بند کرتا اور اسے ملک سے نکالتا۔ کریگ دراصل وہی بتا رہا تھا جو امریکہ اور بھارت کی پاکستان کے مستقبل کی پالیسی تھی۔ دس سال بعد جب پاکستان ٹوٹ گیا تو امریکہ میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کریگ نے کہا کہ وہ لوگ جو بھارت پر الزام لگاتے ہیں کہ بھارت نے پاکستان کے اندرونی معاملات اور سیاسی چپقلش سے فاعدہ اٹھا کر مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی وہ سراسر غلط ہیں۔ کریگ نے کہا۔۔۔۔۔ دوستو یاد رکھو۔۔۔۔۔ جب تمہارے گھر

میں آگ لگی ہوتو ہمسائے کو پورا حق ہے کہ وہ جسقدر تمہارے گھر کا سامان لوٹ سکے لوٹ لے ۔بدقسمتی سے آج بھی پاکستان میں آگ لگی ہے اور اس بار بھارت ہی نہیں امریکہ سمیت نیٹو کی شکل میں ساری دنیا ہمارے پڑوس میں ہے اور کریگ کے فلسفے کے مطابق پاکستان کو لوٹنے کا حق رکھتی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی سن لو۔ 1971ء کی جنگ کے بعد امریکہ نے اسی ڈاکٹر کریگ کو پاکستان میں سفیر لگانا چاہا تو ذوالفقار علی بھٹو نے انکار کر دیا۔مگر جب بے نظیر اقتدار میں آئی تو ڈاکٹر کریگ کو امریکن انسٹیٹیوٹ آف پاکستان سٹڈیز کا سربراہ بنا دیا گیا۔موجودہ دور میں تو سارے معاملات ہی امریکہ کے ہاتھ میں ہیں ۔کیانی صاحب جمہوریت کے رکھوالے ہیں ، زرداری ،عبدالرحمان ملک ،حسین حقانی اور ان کے خدام امریکہ بھارت اور افغانستان کے دوست ہیں اور پاکستان اور پاکستانی عوام ان سب کے مشترکہ دشمن ہیں ۔

کیا یہ سب کامیاب بھی ہونگے ۔میں نے پوچھا۔

کسی حد تک تو کامیاب ہوگئے ہیں۔تھوڑی اور کامیابی بھی ممکن ہے مگر مکمل بربادی نہیں۔نینا نے جواب دیا۔

وہ کیوں؟ میں نے کہا۔

مسلکی جہاد اور سیاسی لوٹ مار کرنے والوں کا ایک ہی مشن ہے جنہیں چالیس فیصد عوام کی حمایت بھی حاصل ہے۔ساٹھ فیصد کا مسلک اور عقیدہ مختلف ہے اور انہیں ایک قائد کی ضرورت ہے۔

کیسے قائد کی ؟ میں نے سوال کیا۔

جو قائداعظمؒ کی طرح دوراندیش ہو۔جو حسین شہید سہروردی کی طرح صلح جو اور بردبار ہو، جو بھٹو کی طرح ذہین ہو، جو دیندار ہو مگر مسلک کا محتاج اور متکبر نہ ہو، جو عوام میں سے ہو اور سچائی پر عمل پیرا ہو، جو قانون کا احترام کرنے والا اور عام آدمی کا دکھ درد سمجھنے والا ہو، جس کی حفاظت ،پروٹوکول، رہائش اور خوراک پر کروڑوں خرچ نہ ہوتے ہوں، وہ جو حکمران تو ہو مگر حکم خداوندی کے تابع بھی ہو۔جو روح کی حقیقت اور روحانیت کی قوت پر یقین رکھتا ہو۔

یعنی کوئی پیر فقیر یا گدی نشین ہو؟ میں نے کہا۔

تم غلط سمجھے۔نینا نے جواب دیا۔

پیری، فقیری اور گدی نشینی مختلف چیزیں ہیں۔ پیر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح کچھ لوگوں کو اپنا مطیع وفرمانبردار بنا لیتا ہے۔ جو کچھ مریدوں کو اکٹھا کر لیتا ہے یا کچھ لوگ احتراماً یا کسی وسوسے، خوف، کسی لالچ، کسی شعبدے بازی یا کسی مقصد کیلئے اسے اپنا پیر، گرو، استاد، رہبر ور ہنما یا پھر مرشد مان لیتے ہیں اور اس کے ارشادات کو حکم کا درجہ دیتے ہیں۔ ایسا شخص مادی یا ناسوتی عامل اور ایک سیاسی شعبدہ باز بھی ہوسکتا ہے۔ وہ ایک اچھا آدمی اور دیانتدار شخص بھی ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک روائتی پیر ولیّ اللہ بھی ہو چونکہ اللہ کا ولی اور سچا پیرو کار ظاھری، مادی شعبدوں سے مبرا ہوتا ہے۔ اسی طرح فقیر مانگنے والا بھی ہوتا ہے اور دینے والا بھی جبکہ گدی نشین کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ بعض درباروں اور گدیوں پر محکمہ اوقاف کے پٹوای اور تحصیلدار بھی بیٹھے ہیں اور کچھ گدیوں پر بیٹھے سجادہ نشین اور گدی نشین ذاتی زندگیوں میں شریعت اور طریقت تو کجا دین سے ہی بیزار ہیں۔

قائد اعظمؒ نہ پیر تھے اور نہ گدی نشین مگر اچھے اور نفیس انسان تھے۔ وہ قانون دان بھی تھے اور قانون کا احترام بھی کرتے تھے۔ موجودہ دور میں مہاتیر محمد اور محمود احمدی نژاد کی مثالیں سامنے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ سمیت دیگر مغربی مما لک کا نظام حکومت بھی مثالی ہے۔ صدر یا وزیر اعظم یا کسی وزیر کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ من مانی کرے، دوستوں اور رشتہ داروں کو یا پارٹی عہدیداروں اور ورکروں کو پلاٹ، پرمٹ اور ٹھیکے دیتا پھرے۔ کھانوں اور سرکاری دعوتوں پر کروڑوں اڑا دے اور کوئی پوچھے والا نہ ہو۔ مگر بدقسمتی سے یہ سب پاکستان میں ہے جس کا بنانے والا قائد اعظم ایک رومال، ایک صابن کی ٹکیہ یا ایک تولیہ بھی سرکاری خزانے سے نہیں لیتا تھا۔ اب اسی پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم اپنی رہائش اور خوراک پر کروڑوں خرچ کرتا ہے۔ اپنی حفاظت پر اربوں اور اسی حساب سے بیرونی دوروں پر خرچ آتا ہے۔ اسمبلی ممبروں کی اپنی شان ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کمیٹی کا معزز ممبر ہوتا ہے جہاں سے اسے اضافی معاوضہ، بیرون ملک دورے اور دیگر سہولیات میسر ہوتی ہیں جو ایک وزیر کے برابر ہی ہیں۔

ایسا ملک ترقی کیسے کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

ترقی بھی کر رہا ہے؟ نینا نے جواب دیا۔

تم کہو گے کیسے تو سنو۔

وزیر، مشیر، حکمران پارٹی ورکر، ٹھیکیدار ور دیگر مدد گار بمعہ اسمبلی ممبران کے ہر سال قومی

خزانے سے اربوں روپے ہتھیالیتے ہیں جسکا تقریباً ساٹھ فیصد وہ بنکاروں، سمگلروں، سفارتکاروں اور دوستوں یاروں کی مدد سے بیرون ملک شفٹ کردیتے ہیں جبکہ چالیس فیصد ملک کے اندر ہی رکھتے ہیں۔ اس چالیس فیصد سے یہ لوگ اپنی عیش وآرام کیلئے وسیع کوٹھیاں، محلات اور فارم ہاؤس تعمیر کرتے ہیں جس پر ہر سال اربوں خرچ ہوتے ہیں۔ شہروں کے باہر نئی ہاؤسنگ سکیمیں بنتی ہیں۔ سڑکیں اور پُل بنتے ہیں جو اس چالیس فیصد کا حصہ نہیں بلکہ بچے کھچے بجٹ کا زیاں ہوتا ہے مگر کچھ نہ کچھ کام تو ہوتا ہے جس سے مزدور راج کا کام بھی چلتا ہے۔

توتمھارے نزدیک یہ ترقی ہے؟ میں نے کہا۔

ہاں! یہی ترقی ہے۔ نینا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس ترقی کا فائدہ یہ ہے کہ سیاستدانوں کے رشتہ داروں اور کچھ خاص قسم کے پارٹی ورکروں کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ میں ایسے سینکڑوں نام بتا سکتی ہوں جو معمولی حیثیت سے سیاست اور سیاسی کرپشن کی برکت سے کروڑوں نہیں بلکہ اربوں پتی بن گئے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے کرتا دھرتا لوگوں کو ہی دیکھو کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اب تو عام آدمی بھی پوچھتا ہے کہ اسے بھی کرپشن اور لوٹ مار کا حق ہونا چاہیے۔ اگر اسمبلی ممبر، وزیر اور سینیٹر کی کرپشن اور لوٹ مار کی بات کروتو اسکا استحقاق مجروح ہوتا ہے۔ صحافی، جرنیل یا بیوروکریٹ کی لوٹ کھسوٹ پر کوئی کچھ کہہ دے تو الزام تراشی کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ جج کی کرپشن اور چوری کی بات کروتوھین عدالت کا جرم بن جاتا ہے تو چور، ڈاکو اور سمگلر بھی تو اسی معاشرے کا فرد ہے۔ اسکا استحقاق بھی تو ہے اسے بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے بھی کچھ نہ کچھ قانونی تحفظ ہونا چاہیئے۔ ایک عام ڈاکو یا چور پنجاب بینک سے دس بیس ارب نہیں نکال سکتا۔ دوتین سو ارب کے قرضے لیکر معاف نہیں کرواتا۔ پی آئی اے، ریلوے، سٹیل مل اور دیگر کارپوریشنوں کو دیوالیہ کرکے کھربوں بیرون ملک منتقل نہیں کرتا تو اسے چھوٹی چوری پر بڑی اور سخت سزا کیوں۔ فغان ٹرانزٹ ٹریڈ ہی کو دیکھ لو۔ صوبہ سرحد کی بڑی بڑی شخصیات اور خاندان ہر سال اربوں ڈالر کماتے ہیں مگر سائیکل پر کپڑے کے چند تھان باڑہ سے صدر بازار لانے والے سمگلر کو سزا ملتی ہے۔

نینا تم کیسی بات کرتی ہو۔

کیا ملک کی حکمرانی چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھ دے دینی چاہیے۔ ابھی تم ایک آئیڈیل حکمران، صالح قیادت اور بے لوث قائد کی بات کررہی تھی۔ میں نے کہا۔

ہاں کر رہی تھی کہ ایسا ہو جائے تو اچھا ہے مگر اب نہ قائداعظمؒ واپس آئینگے، نہ سہروردی اور بھٹو۔اب جسطرح کا سیاسی میٹریل مارکیٹ میں ہے اس سے تو بہتر ہے کہ چھوٹے چور، ڈاکو اور سمگلر آجائیں جو اربوں اور کھربوں کا ڈاکہ نہ ڈالیں۔ میں تو چاہونگی کہ الیکشن سے پہلے ایک اشتہار دیا جائے کہ ایسے پڑھے لکھے، ذھین اور شاطر ڈاکو اور چور الیکشن لڑ سکتے ہیں جنھوں نے کسی غریب کو نہ لوٹا ہو۔ کسی کو واردات کے دوران قتل نہ کیا ہو، کسی کی بہو، بیٹی یا بیوی کی عزت نہ لوٹی ہو، جو کسی بڑے گدی نشین کا مرید نہ رہا ہو، جو کسی وڈیرے، جاگیردار، نو دولتیے، لٹیرے یا سمگلر سیاستدان کا باڈی گارڈ یا چمچہ نہ رہا ہو۔ وہ وارداتیں ڈنکے کی چوٹ پر کرنے کا صاف شفاف ریکارڈ رکھتا ہو اور اسے ہر طرح کے وارداتیوں اور کرپشن کے مرض میں مبتلا مریضوں کی پہچان ہو۔

اس کا فائدہ؟ میں نے پوچھا۔

بہت فائدہ ہوگا بلکہ افاقہ ہوگا۔

سب کو پتہ ہوگا کہ یہ ایک وارداتیہ ہے اور اسے پولیس، پٹواری، کلرک سے لیکر سیکریٹریوں تک کی نفسیات کا پتہ ہے اور وہ ان سے نبٹنا جانتا ہے۔

تجربہ ناکام بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا۔

میں تم سے متفق ہوں۔ نینا نے جواب دیا۔

مگر تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔

چھوٹا ڈاکو سُدھر جائے تو ولی بن جاتا ہے۔ نہ سُدھرے تو درندگی پر اُتر آتا ہے۔

ہمارا ملک ایک ایسی تجربہ گاہ ہے جہاں آئے دن کوئی نہ کوئی تجربہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایوب خان کا تعلق لوئیر مڈل کلاس سے تھا۔ اس کے اندر ایک طرف تو دولت کی ہوس تھی اور دوسری طرف ایک بڑا خان اور گھرانہ جس سے وہ تعلق نہ رکھتا تھا تخلیق کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ ایوب خان نے زمینیں اور جائیدادیں بنائیں، بچوں کی شادیاں بڑے صنعتی سیاسی گھرانوں، نوابوں اور جاگیردار خاندانوں میں کیں تاکہ اسکے گھرانے کی پہچان ہوسکے۔

یحییٰ خان بھی ایک مستقل پہچان کے چکر میں تھا اور عام انتخابات کے بعد اپنا سیاسی رول چاہتا تھا۔ اپنے مستقل سیاسی کردار کے چکر میں یحییٰ خان بھٹو اور مجیب کے چکر میں آگیا جس سے بھارت نے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔

بھٹو بلاشبہ ایک شاطر اور ذہین سیاستدان تھا جسے عام آدمی کے مسائل کا بھی ادراک تھا مگر طریق حکمرانی شاہانہ اور جاگیردارانہ تھا۔ بھٹو اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ پورے جنوب مشرق ایشیاء میں ایک نمایاں اور مستقل کردار کا خواہاں تھا جس کا حصول بھٹو جیسی شخصیت کیلئے ناممکن بھی نہ تھا۔ بھٹو کی طبیعت میں جوش، بغض، عدم برداشت اور تکبر نہ ہوتا تو آج نہ صرف پاکستان ایک عظیم اور ترقی یافتہ ملک ہوتا بلکہ عین ممکن تھا کہ یورپی یونین کی طرز پر ایک طاقتور مسلم بلاک وجود پذیر ہو کر دنیا کی سیاست اور معیشت میں ایک توازن پیدا کرتا۔ بھٹو کے جوشیلے پن سے نہ صرف اندرونی مخالفین نے فائدہ اٹھایا بلکہ بیرونی قوتوں نے بھی اپنے استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف اُبھرتی ہوئی قوت کو ختم کرنے کا موقع ضائع نہ کیا اور بھٹو کا خاتمہ کر دیا۔

بھٹو نے اشرافیہ اور دوستوں کی تذلیل کی اور ایسے لوگوں کو سیاسی منظر پر لایا جن کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا۔ لینن اور سٹالن کی طرح بھٹو نے بھی اپنے قریبی لوگوں کو مخمصے کا شکار کر دیا کہ کب کس کی باری آنی ہے۔ کیمونسٹ انقلاب کے بعد پچھلے ادوار کے حامیوں کے ساتھ جو ہوا سو ہوا مگر سویت یونین پر گرفت قائم کرنے والی جماعت کے اعلیٰ عہدیداروں، فوجی جرنیلوں، سفارکاروں اور اعلیٰ حکومتی اہلکاروں کے ساتھ اس سے بھی برا ہوا۔ لینن گراڈ اور کریملن کی شاہراؤں اور بلند و بالا عمارتوں پر جن انقلابیوں اور حکومتی ستونوں کی قد آدم تصویریں لگی ہوتیں اور ان کی انقلابی خدمات اور عظیم سویت یونین کی تعمیر و ترقی میں جن کے اعلیٰ ذہنوں کے تعریفی کلمات پر بنی بینرز جگہ جگہ سجے ہوتے اگلے روز ان کی وطن فروشی، جرمنی اور انگلیڈ سے سازباز اور کیمونسٹ پاٹی سے غداری کی خبریں اچانک منظر عام پر آتیں۔ غداروں کو ان کے بستروں سے ان کے بیوی بچوں کے سامنے گھسیٹ کر لیجایا جاتا، پہلے سے تیار شدہ دستاویزات پر دستخط کروائے جاتے، تمام غدار اپنا جرم خاموشی سے قبول کرتے، عدالتیں ریڈی میڈ بیانات پر مبنی فیصلہ سناتیں اور دوسرے روز دس بیس غدار فائرنگ سکواڈ کے سامنے آخری ہچکی لیکر اپنی جان عظیم سویت انقلاب سے غداری کے جرم میں گنوا دیتے۔

وہ لوگ جو کسی پارٹی یا محفل میں لینن اور سٹالن کے دائیں یا بائیں بیٹھے ووڈکا کے گھونٹ لیتے اہم امور پر سرگوشیاں کر رہے ہوتے اگلے روز وہ بھی کسی اندھیری کوٹھڑی میں پڑے سوچوں میں گم ہوتے کہ انھوں نے کب اور کہاں کسی جرمن یا انگریز کی شکل دیکھی تھی اور کس کے ساتھ کیا بات کی تھی جو وطن، قوم اور پارٹی سے غداری کے زمرے میں آتی ہے۔

پارٹی کے وہ وفادار جو من گھڑت اور فرضی مقدمات تیار کرتے، جھوٹے گواہ پیش کرتے، راتوں کو گرفتاریاں عمل میں لاتے، عدالتوں میں بیٹھ کر موت کے پروانوں پر دستخط کرتے اکثر ان میں سے بھی دھر لیے جاتے۔ ایک برطانوی سفارتکار اپنی یاداشتوں پر مبنی کتاب میں لکھتا ہے کہ روسی سفارتکار، ایڈمرل، جنرل اور ائر مارشل قومی تقریبات میں سہمے ہوئے اور خوفزدہ دکھائی دیتے۔ وہ غیر ملکی سفارتکاروں خصوصاً جرمن اور برطانوی سفارتی عملے سے دور بھاگتے اور ان کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے کہ کہیں آنکھوں کے اشاروں پر مبنی غداری کا الزام نہ لگ جائے۔ کامریڈ لینن اور سٹالن تو خال خال ہی نظر آتے اور اکثر یہ تاثر دیا جاتا کہ ان کے اختیارات انتہائی محدود ہیں اصل حکمرانی کیمونسٹ پارٹی کی ہے اور سارے فیصلے پولٹ بیورو کرتی ہے۔ عدالتیں آزاد ہیں اور ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ وطن فروشوں کی نشاندھی کر کے حب الوطنی کا ثبوت دے۔ مگر سچ یہ تھا کہ فیصلے ایک ہی شخص اور اس کے ذاتی دوستوں پر مشتمل ایک محدود طبقہ کرتا تھا۔ وہی حکمران اور جج تھے، وہی پولٹ بیورو اور کیمونسٹ پارٹی تھے۔ باقی سب دکھاوا اور شعبدہ تھا۔

یہ سب سوویت یونین میں تو چل گیا مگر بھٹو بھول گے کہ پاکستان کی مٹی زرخیز ہے جس پر چار موسموں کا اثر ہے۔ نیشنل کومیسار اور ایف ایس ایف کی کاروائیوں میں مطابقت پیدا نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی دلائی کیمپ میں سائبیریا جیسا خنک ماحول بن سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھٹو ایک قابل اور ذہین شخصیت کے حامل روائتی سیاستدان تھے۔ وہ بیک وقت ایک سخت گیر جاگیردار، ایک نرم دل عوام دوست فقیر، ایک درویش صفت مدبر اور سیاسی دانشور، ایک سوشلسٹ انقلابی و رریفامر سے لیکر عالمی سطح پر ابھرنے والے روشن خیال فلاسفر کا کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔ بھٹو کی اس تیز رفتار فنکاری نے ان کی صلاحیتوں کی راہ میں روڑے اٹکا دیئے اور وہ کوئی بھی کام یکسوئی سے نہ کر سکے۔ اندرون ملک وہ کسی سیاستدان کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اپنی پارٹی کے سینئر ممبران اور اہم کارکنوں کو اپنا ماتحت تصور کرتے تھے۔ بھٹو اپنے دوستوں کی تذلیل دشمن سمجھ کر کرتے تا کہ ہر کسی کو اپنا مرتبہ اور مقام یاد رہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ ان کے دوست بھی ان ہی کی طرح جاگیردارانہ بیک گراؤنڈ رکھتے ہیں اور ان کے اندر بھی وہ حاکمانہ اور سخت گیر خون گردش کر رہا ہے جو بھٹو کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ بھٹو نے جن دوستوں کی مدد سے اپنا سیاسی پلیٹ فارم سجایا، اقتدار ملنے پر وہ سب بھٹو سے جدا ہو گئے جو بچ گئے وہ بے حیثیت اور

باجگزار بن گئے۔ بھٹو نہ تنقید برداشت کرتے تھے اور نہ ہی تجاویز کو اہمیت دیتے تھے۔ بھٹو کی سیاسی تربیت اسکندر مرزا اور ایوب خان نے کی جسکا رنگ ان کی شخصیت میں نمایاں تھا۔

بھٹو کی شخصیت کا مثبت پہلو ان کی ذہانت، اداروں کا قیام اور عام آدمی کی فلاح و بہبود ہے۔ بھٹو کے نیشنلائیزیشن پروگرام سے ملک کی معیشت کو نقصان پہنچا اور نجی ملکیت میں چلنے والے کارخانے بند ہو گئے۔ معیشت دانوں کا خیال ہے کہ صنعتیں قومیانے کے بجائے اگر اصلاحات کے ذریعے مزدوروں اور محنت کشوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنایا جاتا تو ترقی کا پہیہ تیز کرنے سے ملک ترقی کرتا۔ یونین سازی نے صنعتی ترقی پر منفی اثر ڈالا اور مفاد پرست عناصر نے یونین مافیا کی شکل اختیار کر لی۔ اس عمل سے نہ صرف صنعتی تنزلی کا آغاز ہوا بلکہ بڑے صنعت کار اور تاجر بھٹو مخالف کیمپ میں جا بیٹھے اور بالآخر بھٹو کے خاتمے کا باعث بنے۔

بھٹو کے مخالف معترض ہیں کہ بھٹو نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا مگر اسے پورا کرنے میں ناکام رہے۔ مخالفین اگر یہ کہیں کہ بھٹو کے پروگرام کو ان کے جانشین جاری رکھنے میں ناکام رہے تو بات سمجھ آتی ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

روٹی، کپڑا اور مکان دراصل وسائل کی دستیابی کا نام ہے۔ بھٹو نے اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ہر پاکستانی کیلئے پاسپورٹ کا حصول آسان بنایا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں تیل کی دولت سے آنے والی خوشحالی سے بھرپور فائدہ حاصل کیا۔ لاکھوں مزدور اور ہنرمند عرب ممالک میں ہونے والی تعمیرات کا حصہ بنے اور اربوں روپے کما کر اپنی اور ملک کی خوشحالی کا باعث بنے۔ وہ لوگ جو کبھی لاہور اور کراچی بھی نہ گئے تھے افریقی ملک لیبیا تک جا پہنچے اور وہ جو تھوڑا بہت پڑھے لکھے اور آئندہ کی منصوبہ بندی کا ادراک رکھتے تھے دوسرے مرحلے میں یورپ اور امریکہ جا پہنچے۔ پاکستانیوں، بھارتیوں، بنگلہ دیشیوں اور افغانوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ وہ جہاں جائیں اکیلے نہیں رہتے۔ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کسی نہ کسی بہانے اپنے عزیز رشتہ داروں، محلے داروں اور قبیلے برادری والوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔ یوں چراغ سے چراغ جلتا ہے اور چند سالوں میں ایک محلّہ اور پھر ایک گاؤں امریکہ، یورپ، مشرق وسطیٰ، آسٹریلیا یا نیوزی لینڈ کے کسی دور دراز شہر میں آباد ہو جاتا ہے۔

ہمارا خاندانی نظام بھی خوشحالی کا باعث ہے۔ بیرون ملک سے پیسہ آیا تو لوگوں نے چھوٹے

موٹے کاروبار کئے، نئے مکان تعمیر کیے اور بعض علاقوں میں اپنی مدد آپ کے تحت سڑکیں بھی تعمیر کرلیں۔ میرے نزدیک یہی خوشحالی بھٹو کا روٹی کپڑا اور مکان تھا۔ بھٹو میں جبر و تکبر تو تھا مگر کرپشن، بدعہدی اور بے اصولی نہیں تھی۔ اگر بھٹو پی این اے کی تحریک اور ضیاءالحق کی چال سے بچ جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ممکن ہے کہ وہ اپنی خامیوں پر کنٹرول کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے اور اپنی خوبیوں کو مزید نکھار کر قومی خدمت کا کام احسن طریقے سے انجام دیتے۔ بھٹو نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی جس کیلئے ٹیکنیشن، ایڈمنسٹریٹر اور سائنس دان پاکستانی یونیورسٹیوں نے پیدا کئے۔ آج اس پروگرام سے بھی لاکھوں لوگ منسلک ہیں۔ بھٹو دور میں ہی پاکستان آرڈیننس فیکٹریوں میں وسعت ہوئی اور بہت سی نئی فیکٹریاں لگیں جو آج پاکستان کیلئے زرمبادلہ کمانے کا باعث ہیں۔ اسی طرح ایروناٹیکل کیمپلکس کامرہ اور ہیوی ری بلڈ فیکٹری ٹیکسلا جیسے پروجیکٹ ہیں جو روٹی کپڑا اور مکان فلسفے کا عملی ثبوت ہیں۔ بھٹو دور میں زرعی شعبے میں بھی بہت کام ہوا۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد اور بارانی کالج راولپنڈی جیسے اداروں میں نئے ڈسپلن متعارف ہوئے اور اس شعبے میں تحقیقی کام ہوا۔ سندھ میں رائیس ریسرچ پروجیکٹ پر کام ہوا جبکہ سٹیل ملز جیسے پروجیکٹ نے صنعتی ترقی کی نئی راہیں کھولیں۔

بھٹو دور میں کیرج فیکٹری راولپنڈی اور رسالپور میں بھی بہت کام ہوا جبکہ ٹیلی کمیونیکشن کے شعبے میں ٹی آئی پی ہری پور میں بھی توسیع ہوئی اور نئے پروگرام شروع ہوئے مگر بدقسمتی سے سوائے ان اداروں کے جو افواج پاکستان اور وزارت دفاع سے منسلک تھے باقی سب کرپشن، یونین بازی، سیاسی چالبازی کا شکار ہو کر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ بھٹو بیک وقت ایک زہر بھی تھا اور تریاق بھی۔ بھٹو نے تریاق تو عمدگی سے استعمال کیا مگر زہر کا بے وقت اور کہیں کہیں بیجا استعمال بھی ہوا جو خود بھٹو کیلئے بھی زہر قاتل ثابت ہوا۔

نینا میں نے یہ بھی پڑھا اور سنا ہے کہ سی آئی اے نے بھٹو کو منظر سے ہٹانے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ میں نے پوچھا۔

ہاں یہ تو حقیقت ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ضیاءالحق ذہانت، قابلیت اور آؤٹ لُک کی وجہ سے کبھی بھی فوج میں اعلیٰ عہدے کیلئے موزوں تصور نہیں کئے جاتے تھے۔ ضیاءالحق کا ملٹری کیریئر بھی درمیانہ تھا۔ وہ کبھی بھی پہلے پانچ اور دس میں نہیں رہے۔

اسکا مطلب۔۔۔ میں نے سوال کیا۔

ایوب خان نے سینڈھرسٹ سے کمیشن لیا، یحییٰ خان بھی فوج کا قابل ترین اور دلیر افسر تھا، یحییٰ خان بہت اچھا منصوبہ ساز اور منتظم بھی تھا جس کا کبھی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسی طرح جنرل گل حسن، جنرل آصف نواز جنجوعہ اور دیگر بہت سے جرنیل اپنی قابلیت، ذہانت اور دلیری کیلئے مشہور تھے جن میں جنرل امیر حمزہ، جنرل اعظم خان اور جنرل اکبر کا نام شامل ہے۔ سول سروس اور فوج میں مقابلے کے امتحان اور تربیت کے اختتام پر قابلیت کی پوزیشن کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فوج میں پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والے کیڈٹس کو اعزازی شمشیر اور صدارتی طلائی تمغہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پہلی پانچ اور دس پوزیشنوں کی بھی اہمیت ہے جو آگے چل کر ترقی کا باعث بنتی ہے۔

تم کہنا چاہتی ہو کہ ضیاء الحق نہ تین میں تھے اور نہ تیرہ میں۔ میں نے کہا۔

ٹھیک سمجھے ہو۔ نینا نے جواب دیا۔

سیانے کہتے ہیں کہ ضیاء الحق اگر فوج میں نہ آتے تو جماعت اسلامی کے امیر ہوتے۔

یہ بھی درست ہے۔ نینا نے سر ہلایا۔

بھٹو اور ضیاء الحق میں جب کوئی بات مشترک نہ تھی تو بھٹو نے ایسے آدمی کے ہاتھ ننگی تلوار کیوں دے دی؟ میں نے پوچھا۔

سب جانتے ہیں کہ شاہ ایران کے بعد امریکی سی آئی اے کا سب سے بڑا وفادار اردن کا شاہ حسین تھا۔ اردن میں تعیناتی کے دوران بریگیڈیر ضیاء الحق نے اردن کے بادشاہ کے خلاف فلسطینیوں کی بغاوت کو بے دردی سے کچلا اور ٹینکوں کے کئی سکواڈرن فلسطینی کیمپوں پر چڑھا کر ان کا صفایا کر دیا۔ اسی دوران ضیاء الحق کے سعودی شاہی خاندان سے بھی مراسم قائم ہوئے۔ اگر فلسطینی بغاوت اردن میں کامیاب ہو جاتی تو ان کا اگلا ہدف سعودی عرب ہوتا۔ فلسطینی باغیوں کو شام، مصر، عراق اور لیبیا کی کھلی حمایت حاصل تھی جبکہ عرب امارات میں ان کے حامیوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ عرب دنیا سے باہر سویت یونین، بھارت، فرانس، مشرقی جرمنی اور ایران بھی فلسطینی گوریلوں کے حمائتی تھے۔ یمن ایک نیوٹرل حیثیت میں تھا چونکہ اس دور میں شمالی اور جنوبی یمن کی اپنی چپقلش جاری تھی۔

ضیاء الحق نہ صرف اردن بچانے میں مددگار ثابت ہوئے بلکہ سعودی عرب کیلئے پیدا ہونے والے خطرے کو بھی ختم کر دیا۔

ضیاء الحق کے پروموشن کیلئے جہاں امریکہ کے دو انتہائی اہم اور قابل بھروسہ اسلامی ملکوں نے کام کیا وہیں امریکی چالیں بھی کام آئیں۔

اس کے علاوہ۔ میں نے پوچھا۔

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ نینا نے جواب دیا۔

مثلاً۔ میں نے کہا۔

برادری ازم، ضیاء الحق کی سادہ طبیعت، عاجزی وانکساری، بظاہر وفاداری اور چاپلوسی۔

باقی تو سب ٹھیک ہے مگر برادری ازم کیسے۔ پھر بھٹو جیسے شخص کیلئے برادری ازم کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔ میں نے پوچھا۔

یہی تو المیہ ہے۔ نینا نے کہا۔

جب کسی کی شامت اعمال آتی ہے تو وہ چھوٹی اور بیکار باتوں کو اہمیت دیتا ہے۔ شائد اسی انسانی کمزوری کو دیکھتے ہوئے مشہور کشمیری شاعر، دانشور اور مفکر غنی کاشمیری نے کہا تھا کہ ''اے نادان تو اپنے دشمنوں اور چرب زبان دوستوں سے غافل نہ رہ۔ دریا کا پانی دیوار کے قدم چومتا ہے مگر بالآخر اسے گرا دیتا ہے۔'' چرب زبان دوست کبھی دوست نہیں بلکہ دوست نما دشمن ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے کہ میرا دشمن وہ ہے جو میری تعریف کرے اور خوبیاں بیان کرے۔ دوست وہ ہے جو میرے اچھے کاموں پر خاموش رہے اور خامیوں کو کھل کر بیان کرے اور تنقید کرے۔ حضرت عمر فاروقؓ جب کوئی فیصلہ کرتے تو اصحاب رسولؐ کی طرف متوجہ ہو کر خاموشی اختیار کرتے۔ جواب نہ آنے پر حتمی فیصلہ صادر کرتے۔ اگر کوئی صحابی رسولؐ اس پر تنقید کرتا تو آپ فیصلے کا اختیار مجلس شوریٰ کو دیکر اس سے مُبرا ہو جاتے۔ اگر کوئی فیصلہ اصحاب رسولؐ کو پسند نہ آتا یا وہ اسے حضورؐ کے فیصلوں اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نہ پاتے تو اکثر کہہ دیتے کہ یا امیر المومنین آپ یہ مقدمہ حضرت علیؓ کے سپرد کر دیں۔

حضرت عمرؓ جب حضرت علیؓ کا فیصلہ سنتے تو اسے بہتر اور ہمیشہ درست پاتے۔ حضرت علیؓ کی علمی بصیرت، دانشوری، حالات کے مطابق شرعی قوانین کے اندر رہتے ہوئے درست فیصلوں کی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ مجھے کوئی ایسی شام نہ دے جب علیؓ میرے ساتھ نہ ہوں۔

تم بھٹو اور ضیاء الحق کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

اب بھی انہیں کی بات کر رہی ہوں۔ نینا نے جواب دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

بھٹوایک عظیم دانشور تھے مگر دین اور تاریخ اسلام کا مطالعہ واجبی تھا۔اس کے برعکس مغربی سیاستدانوں، قانون دانوں اور دانشوروں نے ہمیشہ سے یہ اصول اپنایا ہے کہ وہ قرآن، اسلامی قوانین اور تاریخ اسلام کا گہرائی سے مطاالعہ کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین، نامور اصحاب رسولؐ کی زندگیوں کا مطالعہ مغربی مفکرین کی عقلی اور فکری سوچ کا ہمیشہ ہی محور رہا ہے۔ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ گاندھی جی کی پرارتھنا میں قرآنی آیات شامل تھیں۔ جب کبھی انہیں ضرورت پڑتی وہ پیغبر اسلامﷺ کی زندگی کا حوالہ دیتے۔ قائداعظمؒ نے قرآنی احکامات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور قرآنی احکامات اور اسلامی قوانین کی بنا پر بعض ایسے مقدمات میں اپنے حریفوں کو ششدرہ کر دیا جو قائداعظمؒ کو ایک سیکولر قانون دان اور مذہبی معاملات کے حوالے سے آسان حدف سمجھتے تھے۔

اسی حوالے سے ایک مثال اسرائیل کی بھی ہے۔ اسرائیل پر ایک دور ایسا بھی آیا جب اسرئیلی حکومت کو سخت ترین مالی مشکلات کا سامنا تھا۔ اسی دوران اسرائیل کو برطانیہ سے ہتھیاروں کی خریداری کیلئے بھاری رقم بھی ادا کرنی تھی جسے اسرائیلی کابینہ موخر کر کے بجٹ خسارہ پورا کرنے پر زور دے رہی تھی۔ اسرائیلی وزیراعظم گولڈا میئر نے کابینہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور ہتھیاروں کی خریداری کو اہمیت دی۔

کہتے ہیں کہ برطانوی وزیر دفاع نے اسرائیل کا دورہ کیا اور وزیراعظم سے ملنے ان کے گھر چلا گیا جو اس وقت اپنے کچن میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ برطانوی وزیر دفاع نے اسرائیلی وزیراعظم سے ہتھیاروں کی خریداری کو اولیت دینے کی وجہ پوچھی تو وزیراعظم نے بتایا کہ ہمارے دشمن عرب ہیں۔ تمھیں پتہ ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ کا وصال ہوا تو ان کے کپڑوں میں بہت سے پیوند لگے تھے، پاپوش پرانے تھے اور بستر فرش پر تھا مگر حضرت عائشہؓ کے حجرے کی دیوار پر بارہ بے نیام تلواریں لٹک رہی تھیں۔ لینن، سٹالن، خروشیف جوزف مزینی، چواین لائی، ماؤزے تنگ، ڈاکٹر سن یاتسن، نپولین، چرچل نہرو، گاندھی، اندرا گاندھی، ڈیگال، آئزن ہاور اور دیگر بیشمار ایسی شخصیات جنھوں نے اپنی قوموں کی تقدیر بدلنے اور تاریخ کا رخ موڑنے میں نمایاں کار ہائے نمایاں انجام دیے وہ قرآنی اور اسلامی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھیں۔ لیبیا کے شاہ ادریس، مصر کے شاہ فاروق اور ایران کے رضا شاہ پہلوی صرف نام کے مسلمان تھے۔ انہیں صرف اتنا ہی اسلام آتا تھا جتنا قوم کو بیوقوف بنانے کے کام آسکتا تھا۔ یہی

حال ایوب خان، یحییٰ خان، غلام محمد و دیگر حکمرانوں کا تھا۔ میں نے اکثر پاکستانی سیاستدانوں، قانون دانوں، دانشوروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ پریکٹسنگ مسلمان نہیں ہیں۔

یعنی صرف تھیوریٹیکل مسلم ہیں؟ میں نے کہا۔

ہاں! کہہ سکتے ہو۔ نینا بولی۔

اس تھیوریٹیکل سے مراد یہ کہ وہ نماز، روزے، حج، زکواۃ کے عادی نہیں، صرف کلمہ گو ہیں۔ نام اسلامی ہے اور مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے وغیرہ۔

جیسے غالب نے کہا تھا کہ آدھا مسلمان ہوں۔ شراب پیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا۔ میں نے پھر کہا۔

مگر یہ سور بھی کھاتے ہیں، شراب بھی پیتے ہیں اور مردار بھی کھالیتے ہیں۔ شیر کشمیر شیخ عبداللہ کے پوتے نے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں کہا کہ وہ جھٹکے والی مرغی کھاتا ہے بقول اسکے جھٹکے والی مرغی ذائقہ دار ہوتی ہے۔

بھٹو صاحب نے بھی کہا تھا کہ شراب پیتا ہوں عوام کا خون نہیں پیتا۔

یحییٰ، پیرزادہ، حمید اور گل حسن نے ایوب خان سے استعفےٰ لینے کے بعد جی ایچ کیو میں شراب کی محفل سجا کر جشن منایا۔

تم بھٹو اور ضیاء الحق کی بات کر رہی تھی۔ میں نے پھر کہا۔

وہی کر رہی ہوں۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہر حکمران اور سیاستدان کو قرآنی تعلیمات اور تاریخ اسلامی سے واقف ہونا چاہیے مگر بدقسمتی کہ ایسا نہیں ہوتا۔ بھٹو صاحب کی طرح بینظیر جیسی دانشور خاتون کا بھی قرآن اور تاریخ اسلام کا مطالعہ سطحی تھا۔ عوامی نیشنل پارٹی سمیت کچھ سیاسی جماعتیں اور طبقات تو کھلم کھلا اسلام بیزاری کا اعلان کر چکے ہیں اور وہ ملک کے نام سے لفظ اسلامی مٹانے کا بھی عندیہ دے چکے ہیں۔

نواز شریف تو اخبار بھی نہیں پڑھتے۔ انہیں تاریخ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں مگر نماز روزے کے پابند ہیں۔ بلوچی اور سندھی قوم پرستوں کا حال بھی اے این پی جیسا ہے۔

میں نے یہ بہت سی باتیں اس لیے کی ہیں کہ جو شخص قرآن اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرے

وہ عام زندگی میں دھوکہ نہیں کھاتا۔ چاپلوس اور خوشامدی لوگوں کے جال میں نہیں آتا اور درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے۔

دیکھو! قرآن اور اسلام صرف مسلمانوں کا دین اور کتاب نہیں۔ قرآن انسانیت کی رہنمائی کیلئے اتارا گیا اور اسلام انسانیت کا دین ہے۔

یہ تمہارا آزمودہ نسخہ ہے؟ میں نے پوچھا۔

سو فیصد اور لوہے پر لکیر ہے۔ نینا نے جواب دیا۔

ضیاء الحق تو دین سمجھنے والے تھے، قرآن بھی پڑھتے تھے، احادیث کا علم بھی تھا مگر محمد خان جونیجو کو نہ سمجھ سکے۔ میں نے کہا۔

نہیں ایسا نہیں تھا۔ نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

محمد خان جونیجو کو جیسا ضیاء الحق نے سمجھا تھا اور جانا تھا وہ ویسے ہی تھے۔ محمد خان جونیجو کے پیچھے کھڑے لوگ انہیں ضیاء الحق سے دور لے گئے اور وہ ان کے کہنے پر عمل کرنے لگے۔ چھوٹی گاڑیوں میں جرنیلوں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو بٹھانا، چھوٹے مکانوں کی تعمیر پر فضول پیسہ خرچ کروانا، ضیاء الحق سے بار بار مارشل لاء اٹھانے اور صدارتی اختیارات میں کمی کا مطالبہ کرنا، اوجڑی کیمپ کے حادثے پر دسویں کور کمانڈر کو ہٹانے اور کورٹ مارشل کا مطالبہ کرنا اور جنیوا امن معاہدے پر جلد بازی کرنے جیسے کام کروانے والے نہ جونیجو صاحب کے دوست تھے اور نہ ہی ضیاء الحق کے بہی خواہ تھے۔

جونیجو اگر شاطر ہوتے تو وہ ایسی بچگانہ حرکتیں نہ کرتے۔ فوج کے ایک حوالدار کو بھی پتہ ہے کہ فوج کا کمانڈ سسٹم کیا ہے۔ کسی بھی کور کمانڈر کا آئی ایس آئی کے کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پنڈی کے قریب اور بھی بہت سے ادارے ہیں۔ فرض کرو اگر واہ فیکٹری میں کچھ ہو جائے تو اسکا ذمہ چیئرمین پی او ایف واہ کے سر ہے نہ کہ دسویں کور کمانڈر کے سر۔ اگر جونیجو صاحب سمجھدار سیاستدان ہوتے تو وہ شاطر سیاستدانوں کے چکر میں آ کر ایسا مطالبہ ہرگز نہ کرتے۔ اسی طرح جنیوا معاہدے میں جلد بازی سے افغانستان کے حالات ایسے بگڑے کہ شائد کبھی درست نہ ہوں۔

ضیاء الحق چاہتے تھے کہ روسیوں کی موجودگی میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی افغانستان میں الیکشن ہوں اور روسی ایک منتخب افغان حکومت کو اقتدار سونپ کر افغانستان سے نکلیں۔ اسی

دوران آپریشن سلام جس کے سربراہ پرنس کریم آغا خان تھے افغانستان میں تعمیر وترقی کا کام شروع کرے تاکہ روسی انخلاء کے بعد نئی افغان حکومت کے قیام، مہاجرین کی واپسی اور جنگ زدہ تباہ حال افغانستان میں تعمیرات کا کام ایک ساتھ شروع ہو۔مگر جونیجو صاحب نے کسی کی سنے بغیر جنیوا معاہدے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی دکھائی اور نتیجہ ایک کے بعد دوسرا انقلاب اور خونریزی کی صورت میں نکلا جس نے آخر کار ساری دنیا میں اپنے اثرات دکھائے اور پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لیکر افغانستان جیسے ہی حالات پیدا کردیئے۔

تم گریٹ گیم کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہو کہ ضیاء الحق کی موت کے بعد سپریم کورٹ نے جونیجو حکومت بحال کردی مگر جنرل اسلم بیگ نے نئے انتخابات پر زور دیا۔۔۔اگر خفیہ طاقتوں کا پنجہ مضبوط نہ ہوتا تو اسلم بیگ سپریم کورٹ کے فیصلے کا احترام کرتے اور جونیجو حکومت کو بحال کر کے انہیں باقی ٹرم پوری کرنے دیتے۔

چونکہ جونیجو صاحب سے جو کام مفاد پرست عناصر نے لینا تھا وہ لے چکے تھے اسلئے انہیں غیر ضروری اور کسی توجہ کے قابل نہ سمجھا گیا۔ بعد میں سپریم کورٹ نے بھی اسلم بیگ کے خلاف ایک ڈرامہ بازی کی اور خاموش ہوگئے ورنہ اسلم بیگ کی کیا جرأت کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر حاوی ہو کر نئے الیکشن کرواتے اور اقتدار بینظیر کو سونپ کر پھر اس کی بھی چھٹی کروادیتے۔

دیکھو اقتدار کے کھیل میں جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ جو کھیلتا ہے وہ کھلاڑی نہیں ہوتا۔ یہ سب پتلیوں کا تماشا ہے جنھیں کھلانے والے ہاتھ پردے کے پیچھے ہوتے ہیں۔ بھٹو صاحب اگر قرآن اور تاریخ اسلام کو اسی طرح پڑھتے جیسے وہ چانکیا، میکاولی اور کارل مارکس کو پڑھتے تھے تو کبھی ضیاء الحق کو آرمی چیف نہ بناتے۔

ضیاء الحق کی بطور آرمی چیف سلیکشن میں اردن ،سعودی شاہی خاندان اور امریکی سی آئی اے کے علاوہ برادری ازم کا بھی اثر تھا۔ میں نے بہت سے تحقیقاتی مضامین جو بھٹو خاندان پر لکھے گئے میں پڑھا ہے کہ بھٹو سندھ کے راجپوت ہیں مگر جن دنوں بھٹو اقتدار میں آئے یہ بات منظر عام پر آئی کہ بھٹو سندھ کے آرائیں ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو کل پاکستان انجمن آرائیاں کا صدر بنایا گیا جسے بعض دانشور ایک سازش بھی سمجھتے ہیں۔ بھٹو دور حکومت میں جنرل ضیاء الحق اور جنرل فیض علی چشتی جنکا تعلق آرائیں قبیلے سے تھا با اثر جرنیل تھے جو بھٹو کے زوال اور پھر موت کا باعث بنے۔

اس میں شک نہیں کہ بھٹو ضیاء الحق کی سادگی اور جی حضوری کے ساتھ ساتھ اپنی ہی برادری کا بندہ ہونے کی وجہ سے متاثر تھے۔ جس طرح سیاست میں بھٹو نے کسی مضبوط شخص کو برداشت نہ کیا اور جے اے رحیم جیسے ساتھیوں کو نشان عبرت بنایا ویسے ہی وہ فوج میں بھی ایسے شخص کو سپہ سالار رکھنا چاہتے تھے جس کا تعلق مارشل ریس سے نہ ہو اور وہ فوج میں دیگر جرنیلوں پر غلبہ اور برتری رکھنے والا بھی نہ ہو۔

تمھارا مطلب واضح نہیں۔ میں نے پوچھا۔

فوجی کاروائی ہمیشہ گروپ ایکشن ہوتا ہے۔ ایوب خان کو سکندر مرزا نے وزیر دفاع بنایا اور سمجھا کہ ایوب خان کو دو عہدوں پر تعینات کر کے اس نے اپنی صدارت محفوظ کر لی۔ سکندر مرزا سے لیکر موجودہ حکمران آصف علی زرداری یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ کھیتی باڑی کیلئے ہل، بیل اور ٹریکٹر کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ ہاتھیوں، ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی۔ سکندر مرزا نے ایوب خان پر بھروسہ کیا اور ایوب خان نے اپنے ساتھیوں جنرل اعظم، جنرل شیخ، جنرل برکی اور دیگر کی مدد سے مرزا کو چلتا کیا۔ جیسا ایوب نے سکندر مرزا کے ساتھ کیا ویسا ہی ایوب خان کے ساتھ بھی ہوا۔ ایوب نے یحیٰی خان کو کلی وال یعنی پشوری بھائی سمجھ کر آرمی چیف بنایا۔ ایوب کا خیال تھا کہ یحیٰی خان قزلباش کسی مضبوط بیک گراؤنڈ کا حامل نہیں اس لیے وفادار رہے گا۔ جو غلطی ایوب خان نے کی وہی ذوالفقار علی بھٹو کے بعد نواز شریف نے دہرائی۔

یحیٰی خان نے جنرل پیرزادہ، گل حسن اور حمید کے ساتھ ملکر ایوب خان کو ان کے گاؤں ریحانہ تک محدود کر دیا۔ ایوب خان کے پریس سیکریٹری نے یحیٰی خان کی صدارت کے پہلے دن کی روئیداد میں لکھا کہ یحیٰی، حمید، گل حسن اور پیرزادہ سٹاف روم میں ایک ریڈیو سیٹ کے گرد بیٹھے ایوب خان کا آخری خطاب سن رہے تھے۔ چاروں بظاہر خوش تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے ڈاکوؤں کا ایک ٹولہ نقب لگا رہا ہو۔ خطاب کے اختتام پر شراب کا دور چلا اور قومی مجرموں کے ٹولے نے فتح کا جشن منایا۔

ائیر مارشل اصغر خان نے اپنی کتاب میں بھی اسکا ذکر کیا ہے۔ میں نے کہا۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا مگر عبرت کسی نے حاصل نہیں کی۔ نینا نے جواب دیا۔

اب آگے سنو۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

یحییٰ خان ایک مکمل ملٹری مین تھا۔ جہاں تک عیش وعشرت کا تعلق ہے تو یحییٰ بدقسمت تھا کہ بھٹواور مجیب جیسے شاطر سیاستدانوں کے نرغے میں آ کر بدنام ہوا اور سارے جرنیلوں کے گناہ اور جرم اسکے گلے پڑ گئے۔ یحییٰ ہی شرابی کبابی نہ تھا بلکہ یہ شوق سبھی جرنیلوں کے تھے۔ وہ جرنیل جو ضیاءالحق کے دور میں مبلغ اسلام بن گئے وہ بھی جوانی میں رنگیلے تھے۔ ضیاءالحق کے دور میں بھی بہت سے ایسے تھے جو کسی کو خاطر میں لائے بغیر سب کچھ کرتے تھے مگر ضیاء میں جرأت نہ تھی کہ وہ ان کو گرفت میں لاتا۔

کوئی ایک مثال۔ میں نے کہا۔

فضل حق ،کلو، سروپ، اقبال، ایک نہیں درجنوں مثالیں ہیں۔

پرویز مشرف ہی کو لے لو۔ پرویز مشرف کی ایک ماہ کی عیاشی یحییٰ خان کی ساری زندگی کے برابر ہے۔ یحییٰ خان طاقت کے گھمنڈ اور شراب کے نشے میں مگن بھٹو اور مجیب کے سیاسی کھیل کا مہرہ بن گیا اور اس کی فوجی قابلیت سیاسی میدان میں مات کھا گئی۔

وجہ۔ میں نے پوچھا۔

وجہ یہ کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہتے ہیں کہ مشرف نے اخبار کے ایڈیٹروں اور سینئر صحافیوں کی ایک میٹنگ بلائی اور ایک سوال کے جواب پر کچھ برہم ہوتے ہوئے۔ مجید نظامی سے پوچھا کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے۔

تمھیں پتہ ہے، مجید نظامی نے کیا جواب دیا۔

نہیں۔ میں نے کہا۔

مجید نظامی نے کہا کہ میں آپ کی جگہ کیوں ہوتا۔ میرا جو کام ہے میں کر رہا ہوں۔ آپ کو بھی اپنا کام کرنا چاہئے تھا۔ جو آپ اب کر رہے ہیں یہ آپ کا کام نہیں۔

مگر نینا پاکستان میں تو کوئی بھی اپنا کام نہیں کرتا۔ جس ملک کی سیاسی جماعتیں ٹریڈ کارپوریشنوں کا روپ دھار لیں، سیاسی جماعتوں پر مخصوص گھرانوں کا قبضہ ہو، آئین صرف امیروں، جاگیرداروں اور مخصوص سیاسی گھرانوں کے تحفظ کا امین ہو، کرپشن سیاست کا لازمہ او رحکمرانوں کا حق ہو، قانون عوام کو سزا اور خواص کو جزاء دینے کا نام ہو، اعلیٰ عدالتوں کے جج سیاسی جماعتوں کے پسندیدہ افراد ہوں اور نچلی سطح پر ججوں کو من مانی کا اختیار ہو تو ایسے معاشرے اور ریاست میں ہر طاقتور کا استحقاق بنتا ہے کہ وہ دوسروں کی کمزوریوں، کوتاہیوں ور

بداعمالیوں کا بھرپور فائدہ اٹھائے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔مگر المیہ یہ ہے کہ کوئی طاقتور اپنی بھرپور طاقت استعمال کر کے ایک ہی بار گند صاف کر جائے تو بات بنے۔مگر یہاں ہر طاقتور مزید گندگی اور آلودگی بکھیر جاتا ہے۔

تم یحییٰ خان کی بات کر رہی تھی۔میں نے کہا۔

نہیں بھٹو کی بات کر رہی تھی۔نینا نے جواب دیا۔

یحییٰ کا ذکر اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یحییٰ کو چونکہ کام نہیں آتا تھا اس لئے ناکام ہو گیا۔ جسطرح بھٹو اپنے سیاسی تدبر اور جاگیردارانہ ذھنیت اور تکبر کی وجہ سے ضیاء الحق کی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر رہا ویسے ہی یحییٰ خان، مجیب اور بھٹو کی ذھنیت نہ پڑھ سکا۔اسکا تھنک ٹینک ناکام ہوا اور اسکے انٹیلی جنس ادارے بیکار ثابت ہوئے۔ یحییٰ نے گلے میں بدنامی کا طوق ڈالا جسکا وہ اکیلا حقدار نہ تھا۔

یحییٰ بے فکر اور لالچی نہ ہوتا تو جب تک مجیب کے چھ نکات سے بھارت نوازی، لسانی اور علاقائی بدبو نہ نکل جاتی وہ الیکشن کی حامی ہی نہ بھرتا۔راجہ تری دیورائے نے یحییٰ خان کو مشورہ دیا تھا کہ ون یونٹ کے خاتمے کے بعد سارے ملک میں بلدیاتی انتخابات کراؤ اور دیکھو کہ عوام کا مزاج اور سیاسی جماعتوں کی کس قدر پذیرائی ہے۔انتہائی شفاف اور غیر جانبدارانہ انتخاب کے بعد بنیادی سیاسی ادارے مضبوط ہونگے اور بہت سے خدشات اور بھارتی چالبازی کسی قدر کمزور ہو جائے گی۔ بلدیاتی نظام کی بحالی کے بعد بھٹو، اصغر خان، مجیب، بھاشانی، غفار خان اور مولانا مودودی سمیت سبھی کو اپنی اپنی اہمیت کا احساس ہوگا اور ان کی توجہ کسی ایک نقطے پر مرکوز نہ رہے گی۔

نورالامین نے سمندری طوفان کے بعد یحییٰ کو مشورہ دیا کہ طوفان کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں لاکھوں لوگ مر گئے ہیں اور ایک کروڑ کے قریب بے گھر ہوئے ہیں اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک سال کیلئے الیکشن ملتوی کر دو اور فوج کی مدد سے بحالی کا کام شروع کرو۔

افراتفری کے عالم میں محض اپنی خودغرضانہ منصوبہ بندی کو دوام بخشنے کی خاطر ملکی سالمیت کو داؤ پر نہ لگاؤ۔الیکشن کے بعد مجیب اور بھٹو کے مزاج بدل جائینگے اور آنے والی کسی بھی حکومت میں تمھارا کوئی کردار نہ ہوگا۔الیکشن کے بعد بھارت مجیب اور غفار خان کی کھل کر حمایت کریگا اور ملک سلامت نہ رہیگا۔اگر یحییٰ خان ان مشوروں پر عمل کرتا اور دو سال تک معاملہ ٹل جاتا تو شاید

مشرقی پاکستان والا حادثہ نہ ہوتا۔

مگر پہلے تم نے کہا ہے کہ یحییٰ اور اس کے ٹولے نے ایوب خان سے اقتدار چھینا تھا۔

ہاں کہا تھا اور یہ حقیقت ہے۔ نینا نے جواب دیا اور پھر بولی۔

اگر ایوب خان اقتدار کے نشے کو ایک لمحے کیلئے موخر کر کے حقیقت حال کا جائزہ لیتا اور جو کچھ بھٹو نے 1965ء کی جنگ بپا کروانے سے لیکر تاشقند میں ایوب خان کو شرمندگی سے دو چار کرنے تک کیا تھا اسے قوم کے سامنے رکھتا اور نہ صرف اسے برطرف کرتا بلکہ سزا بھی دیتا تو حالات مختلف ہوتے۔ ایوب خان نے صرف بھٹو کو وزارت سے الگ کیا اور پھر اسے یحییٰ خان اور گل حسن کے ساتھ گٹھ جوڑ کا بھرپور موقع فراہم کیا۔ بجائے گول میز کانفرنس کے انعقاد اور ذہنی طور پر بکھرے ہوئے سیاستدانوں سے مشورہ کرنے کے ایوب خان خود ون یونٹ توڑ کر صوبائی خودمختاری کا اعلان کرتا، بنیادی جمہوریت کے نظام کو ختم کر کے پہلے مرحلے میں بلدیاتی انتخابات کرواتا، مشرقی پاکستان سے کسی غیر جانبدار اور محبِّ وطن شخص کو اپنا نائب صدر بناتا اور عام انتخابات کی تاریخ دیکر انتخابات سے تین ماہ قبل سپیکر کی صدارت میں ایک عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیتا۔

اور یہ جماعت اسلامی کے مشرقی ونگ کے امیر پروفیسر غلام اعظم کا مشورہ تھا۔ میں نے کہا۔

تمھیں کیسے پتہ چلا۔ نینا نے پوچھا۔

پچھلے سال میں بنگلہ دیش گیا تھا۔ وہاں بہت سے بزرگ سیاستدانوں سے ملاقات ہوئی اور بہت سی باتیں جو پاکستانی سیاستدان اور پریس نہیں بتاتی پتہ چلیں۔

ان کی باتیں سچی ہیں چونکہ اب انھیں تو پاکستان سے کوئی غرض نہیں۔ نینا نے کہا۔

مگر ان کے دلوں میں درد ہے۔ جدائی کا درد۔ قتل و غارت گری کا درد، ذلت و رسوائی کا درد اور سب سے بڑھ کر سیاستدانوں کی نااہلی و جرنیلوں کی ہوس اقتدار اور لوٹ مار کا دکھ اور درد۔

مگر لاہور، کراچی، پشاور اور اسلام آباد میں کسی کو نہ درد ہے اور نہ غیرت اور احساس۔ نینا نے جواب دیا۔

بنگلہ دیش کے وہ لوگ جو کبھی پاکستانی تھے پاکستان کی تباہی کا ذمہ دار ایوب خان کو ٹھہراتے ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے۔اگر ایوب خان صحیح راستے پر چلتا تو بات پرویز مشرف تک نہ آتی۔نینا نے بات جاری رکھی۔

مگر۔۔۔۔۔۔۔

مگر اس میں سیاستدانوں کا بھی برابر کا حصہ ہے۔عدلیہ اور انتظامیہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہی اور ملک کی تباہی اور اس کے باسیوں کی بدحالی میں برابر کی شریک رہی۔فوج اور سول سوسائیٹی نے بھی گھناؤنا کردار ادا کیا۔بلکہ میں یہ بھی کہوں گی کہ عوام بھی اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ ان لیڈروں کو مسترد کرتے، برادریوں،قبیلوں اور ذاتوں کے چکر سے نکل کر بحیثیت قوم کوئی کردار ادا کرتے تو آج جس بدحالی کا شکار ہیں نہ ہوتے۔

ایوب خان اور یحیٰی خان نے بے بصیرتی اور ہوس اقتدار کا مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے کی تذلیل کرتے اور ملک کو تباہی کی طرف دھکیلتے اپنے انجام کو پہنچے تو مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے اپنے حصے کی زمین پر اقتدار کے جھنڈے گاڑ دیئے۔بنگلہ بندو اور فخر ایشیاء کو قوم نے نجات دہندہ تصور کر لیا۔ائر مارشل رحیم خان اور یحیٰی خان کے یار اقتدار جنرل گل حسن نے یحیٰی خان کی کنپٹی پر پستول رکھ کر استعفٰی لیا اور اقتدار بھٹو کے حوالے کر دیا۔

پھر۔میں نے پوچھا۔

پھر بھٹو نے گل حسن، رحیم خان اور نیول چیف کو اسلام آباد میٹنگ کیلئے طلب کیا، ان کی تذلیل کی، انھیں ایک گاڑی میں ٹھونسا، شیر پنجاب غلام مصطفٰی کھر کی نگرانی میں انھیں اغواء کیا اور لاہور بھجوا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسی دن بھٹو نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے اور فوج نے آئندہ کسی سیاستدان پر اعتماد نہ کرنے کا عہد کر لیا۔

تمھاری بات کا نچوڑ یہ کہ گورنر جنرل ملک غلام محمد اور جسٹس منیر نے دھوکہ دہی اور برادری ازم کا کھیل شروع کیا، اسکندر مرزا نے ایوب خان کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کیا، ایوبی ٹولے نے اسکندر مرزا کو چلتا کیا اور طویل مدت تک اقتدار پر قابض رہا، ایوب خان کے بیٹوں، دوستوں اور رشتہ داروں نے کرپشن اور لوٹ مار کی تاکہ وہ پختون قبائل میں روائتی خان اور بڑے خاندانوں کی صف میں شامل ہو سکیں۔ایوبی دور میں تعمیر و ترقی کے بیشمار کام بھی ہوئے۔بھٹو پر ایوب خان نے اندھا اعتماد کیا جو ایوبی اقتدار اور ملک کیلئے زہر قاتل ثابت ہوا۔" انڈیا فرام

کرزن ٹونہرو اینڈ آفٹر" کا مصنف درگا داس لکھتا ہے کہ بھٹو کے متعلق نواب آف کالا باغ کی رائے اچھی نہ تھی اور وہ اکثر ایوب خان کو باور کرواتے تھے کہ بھٹو تمھیں اور اس ملک کی یکجہتی کو لے ڈوبے گا۔ نواب کالا باغ نے 1965ء کی جنگ سے پہلے ایوب خان کو وارننگ دی کہ بھٹو ایک شاطر سیاستدان ہے اس کی جنگی منصوبہ بندی ناقص اور بے وقت ہے۔ بھٹو کے خاندان میں کبھی کسی نے تلوار، رائفل یا توپ نہیں چلائی اسلئے ایسے شخص پر اعتماد درست نہیں۔ بھٹو کی اقوام متحدہ میں جذباتی کاروائی اور تاشقند میں ایوب خان کی تذلیل کے منصوبے نے ایوب پر واضع کر دیا کہ بھٹو قابل اعتماد نہیں۔ بھٹو کو ایوب خان نے کابینہ سے برخاست کیا تو وہ پہلے ولی خان کی پارٹی میں شمولیت کے خواہاں تھے پھر یحییٰ خان کے مشورے پر اپنی پارٹی تشکیل دی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ائر مارشل اصغر خان او دیگر سیاستدانوں کے ہمراہ ایوب خان کے خلاف تحریک چلائی جس میں یحییٰ خان اور دیگر جرنیلوں کی خاموش رضا مندی اور حمایت بھی شامل تھی۔ بھٹو اور مجیب نے اپنی اپنی جگہ یحییٰ خان کو یقین دلایا کہ اگر وہ جلد از جلد الیکشن کروا کر اقتدار سول حکومت کے حوالے کر دے تو اس میں یحییٰ خان اور فوج کا ایک مستقل کردار رکھا جائے گا۔ اس مستقل کردار سے مراد یحییٰ خان کو مزید پانچ سال کیلئے کمانڈر ان چیف اور صدر کے عہدوں پر فائز رکھنا تھا مگر حقیقت میں بھٹو اور مجیب دونوں یحییٰ خان کو داؤ لگا رہے تھے۔ ایک طرف وہ یحییٰ خان کو بیوقوف بنا رہے تھے اور دوسری جانب فوج ہی کے اندر ذوالفقار علی بھٹو نے ائر مارشل رحیم خان اور جنرل گل حسن پر مشتمل ایک دوسرا گروپ تشکیل دے دیا اور انھیں یقین دلایا کہ سویلین حکومت کنٹرول سنبھالتے ہی یحییٰ، حمید، پیرزادہ اور دیگر کو فارغ کر کے اقتدار کی سنبھالی میں گل حسن گروپ کو شامل کریگا۔ یحییٰ کو شک گزرا تو اس نے بھی مجیب الرحمٰن سے ایسی ہی انڈر سٹینڈنگ قائم کر لی۔ یحییٰ نے شوق اقتدار میں نہ قدرتی آفات کا فائدہ اُٹھایا اور نہ بلدیاتی انتخابات کروائے اور عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو دو بڑی سیاسی قوتیں بنا دیا اور ساتھ ہی بھارت کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنے پہلے سے تیار شدہ منصوبے کے مطابق مشرقی پاکستان میں دھشت گردی اور پھر مکمل فوجی حملے پر عمل پیرا ہو سکے۔ اگر یحییٰ خان ایک سال کا وقفہ کر کے مشرقی پاکستان میں مکمل بحالی تک الیکشن ملتوی کر دیتا تو بہت سے حادثات ٹل جاتے۔ سقوط ڈھاکہ سے پہلے بھٹو نے یو این او میں جو جذباتی رول ادا کیا اس کی مثال بھی ایسے ہی ہے کہ مرتے ہوئے مریض کو فوری طبی امداد دینے کے بجھائے اس کا آکسیجن سلنڈر ہی توڑ دیا جائے۔

بھارتی منصوبہ کامیاب ہوا، نوے ہزار پاکستانی فوجی قیدی بن گئے چونکہ ان کے پاس جنگ اور سرینڈر کے علاوہ کوئی متبادل منصوبہ ہی نہ تھا۔

ائر مارشل رحیم خان نے ذوالفقار علی بھٹو کو یقین دلایا کہ اقتدار کی کرسی آپ کی منتظر ہے، گل حسن ے جی ایچ کیو پر اپنا تسلط قائم کرلیا ہے اور یحییٰ گروپ کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا، یحییٰ کو ایبٹ آباد میں نظر بند کردیا گیا اور گل حسن کو سی این سی بنادیا گیا۔ بھٹو اور مجیب اپنے اپنے ہاف میں کامیاب ہوگئے، اُدھر تم اِدھر ہم فلسفہ پروان چڑھا اور پاکستان دولخت ہوگیا۔ بھٹو نے اقتدار سنبھالا اور اپنے منشور کے مطابق حکمرانی کا آغاز کیا۔ بھٹو اقتدار کے گھوڑے کی پشت پر تھا اور بچا کھچا پاکستان اسکے گھوڑے کی سموں کے نیچے تھا۔ بھٹو نے پہلی فرصت میں اپنے دشمن تلاش کئے ورنہ وہ چاہتے تو چند افراد پر مشتمل اپوزیشن کو جمہوری اور پارلیمانی احترام دیکر انہیں ساتھ رکھتے۔ صحافیوں، سیاسی مخالفین اور اپوزیشن لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونسنے کے بعد بھٹو نے اپنی پارٹی پر توجہ دی اور اپنے سب ساتھیوں کو ان کا مقام دکھایا اور باور کروایا کہ جیالے پن کا مطلب ہر سطح پر حکم کی تعمیل اور باجگزاری ہے۔ بھٹو ازم کا مطلب بھٹو خاندان کا ادب و احترام ہے۔ بھٹو کے وہ ساتھی جنہوں نے اُسے اقتدار کی کرسی پر بٹھایا تھا کو اغواء کرکے ان سے زبردستی استعفےٰ لے لئے۔ جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم چاہتے تو مجیب الرحمٰن کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ خان کو بھی پابند سلاسل کرکے ایک کمیشن بٹھاتے اور تینوں کو سزا دیکر نشان عبرت بنا دیتے چونکہ دونوں جرنیل بھٹو کے ساتھی تھے جسکا صلہ بھٹو نے ذلت اور رسوائی کی صورت میں دیا۔

تمھارا یہ بھی کہنا ہے کہ بھٹو اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود سیاست کے ایسے کھلاڑی تھے جو مدمقابل کو صرف ہرانا نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کرنا چاہتے تھے۔ مجیب الرحمٰن اور مشرقی پاکستان کی موجودگی بھٹو اور بھٹو ازم کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ بھٹو کو ہرگز منظور نہ تھا کہ وہ حزب اختلاف کے لیڈر بنیں۔ مجیب الرحمٰن اور مشرقی پاکستان کی موجودگی میں بھٹو کبھی بھی اقتدار میں نہ آتے اس لیے بھٹو ازم کے فلسفے کی ایک کڑی مجیب اور مشرقی پاکستان سے چھٹکارہ تھا جس کیلئے یحییٰ خان کو استعمال کیا گیا۔

بھٹو دوستوں اور دشمنوں کیلئے یکساں خطرناک تھے۔ بھٹو دشمنی کا مطلب ذلت اور رسوائی، موت یا پھر جیل تھا اور دوستی سے مراد تابعداری، باجگزاری اور جی حضوری تھا۔ بھٹو تقلید اور تنقید

برداشت نہ کرتے تھے بلکہ دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ بھٹو جیسا دانشور اور فلاسفر جس نے اپنے دائمی اقتدار کیلئے مغربی پاکستان کو پاکستان بنایا، برادری ازم جیسے فرسودہ شکنجے میں جکڑا گیا اور مار دیا گیا۔ سردار شوکت حیات خان نے اپنی تحریر میں بھٹو کی سزائے موت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

Bhutto was hanged on the phoney charge may be it was punishment for some other sin such as the murder of East Pakisatan.

ضیاء الحق کے متعلق بھی تمھارا کہنا ہے کہ وہ سی آئی اے، مسلکی مصلحت اور برادری ازم کی پیداوار تھے جس میں ان کی بظاہر سادگی، پرہیزگاری، وفاداری اور تابعداری کا عنصر بھی شامل تھا۔ تم یہ بھی کہتی ہو کہ ضیاء الحق انتہائی پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے جنھیں بھٹو جیسا شاطر اور ذہین سیاستدان بھی نہ سمجھ سکا۔ میں نے پوچھا۔

تم ٹھیک سمجھے۔ جب کسی شخص کو اپنے علم، تجربے، طاقت، رعب اور دبدبے کی بنا پر یقین ہوجائے کہ کوئی دوسرا اس کی جگہ نہیں لے سکتا اور اسکا وجود اور شخصیت لوگوں کی ضرورت بن گئی ہے۔ اگر وہ نہ ہوا تو مروجہ نظام میں خلل پڑجائے گا تو جان لو یہ اس شخص کے زوال کی ابتدأ ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ انسان کا فخر یہ ہے کہ وہ اپنے کسی کارنامے پر فخر نہ کرے۔ نسل انسانی کی معراج اور کامل شخصیت پیغمبر اسلام ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ کے متعلق قرآن پاک میں ربّ کائنات نے فرمایا۔ محمد ﷺ صرف ایک رسول ہیں جن سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ آپ ﷺ کے وصال پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں آیات مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ محمد ﷺ کی پرستش کرتے تھے وہ جان لیں کہ آج آپ ﷺ کا وصال ہوگیا ہے مگر وہ لوگ جو اللہ کے حکم کے تابع ہیں وہ بھی جان لیں کہ اللہ کی ذات ہمیشہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

بھٹو اگر چانکیہ اور میکاولی کے بجائے قرآنی تعلیمات اور اسلامی تاریخ پر توجہ دیتے تو وہ نہ صرف ایک طویل عرصہ تک اس ملک کے حکمران رہتے بلکہ قوم کی تقدیر بدلنے کا بھی سبب بنتے۔ بھٹو کا زعم تھا کہ ہمالیہ ان کی موت پر آنسو بہائے گا اور قوم کا بچہ بچہ ان کیلئے کٹ مرنے کو تیار ہوگا۔ خون کی ندیاں بہہ جائینگی اور ان کے فدائی جیل کے دروازے توڑ کر انہیں ایوان اقتدار میں لے جائینگے۔ انہیں آخری دن تک یہ احساس نہ ہوا کہ ضیاء الحق واقعی انہیں موت کے

دروازے میں دھکیلنے والا ہے۔

بھٹو عالمی سیاست میں ایک ایسا نام ہے جسے تاریخ کے اوراق سے مٹایا نہ جائے گا۔ بھٹو پاکستان اور پاکستانی عوام کی ضرورت تھے جسکا احساس خود بھٹو کو بھی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قائداعظمؒ کے بعد بھٹو کی صورت میں ہماری قوم کو ایک لیڈر ملا جو اپنے ہی پھیلائے ہوئے پھندے میں پھنس کر ضائع ہوگیا۔

بھٹو کی کشمیر پالیسی کیا تھی؟ میں نے پوچھا۔

بھٹو کی کوئی کشمیر پالیسی نہ تھی۔ نینا نے فوراً جواب دیا۔ اور پھر بولی۔

بھٹو کا پاکستان صرف مغربی پاکستان تھا جس پر وہ تاحیات حکمرانی کرنا چاہتے تھے۔ شملہ معائدے کی رو سے مسئلہ کشمیر اپنی اصلی ہیت کھو چکا ہے۔ اب یہ ایک عالمی مسئلہ نہیں بلکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک علاقائی مسئلہ ہے جسے دونوں ملکوں نے باہمی رضامندی سے حل کرنا ہے۔ شملہ معائدے کی رو سے سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن میں بدل دیا گیا اور اس مسئلے کو حل کرنے کا کوئی ٹائم فریم بھی نہیں دیا گیا۔ شملہ معاہدے کی روح کہتی ہے کہ بھٹو صاحب نے آزاد کشمیر پر اکتفا کرلیا تھا اور وہ جلد ہی اسے پاکستان کا صوبہ بنانے والے تھے۔ اس سلسلہ میں بھٹو اور سردار قیوم کے درمیان مذاکرات بھی ہوئے اور بھٹو سے شدید اختلافات کی وجہ سے صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم کو نہ صرف حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے بلکہ لمبی مدت کیلئے جیل کی ہوا بھی کھائی۔ آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کا قیام، پیپلز پارٹی کی حکومت، کشمیر کونسل اور عبوری آئین درحقیقت آزاد کشمیر کے معاملات میں مداخلت کا آغاز تھا جسے انجام تک پہنچانے کیلئے بھٹو صاحب کو موت نے وقت نہ دیا اور ان کی زندگی کی شام ہوگئی۔

پیپلز پارٹی کے رہنماؤں، انٹیلی جنس اداروں اور سول بیوروکریسی کے نمائندگان نے ٹانڈہ ڈیم ریسٹ ہاؤس کوہاٹ میں محاذ رائے شماری کے قائدین سے طویل ملاقاتیں کیں اور انہیں تحریک آزادی کشمیر سے دستبرداری پر مجبور کیا۔ آخر بات نہ بنی تو بھٹو صاحب نے مقبول بٹ شہید کو تاحیات آزاد کشمیر کا گورنر تعینات کرنے کی آفر دی جسے شہید کشمیر نے مسترد کردیا۔ بھٹو صاحب نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے مقبول بٹ شہید کو مقبوضہ کشمیر جا کر جدوجہد کرنے کا مشورہ دیا اور وہاں رہتے ہوئے انھیں بھرپور مالی امداد دینے کا وعدہ بھی کیا مگر۔۔۔۔

مگر کیا؟ میں نے سوال کیا۔

بقول آصف علی زرداری کے سیاسی وعدے اور معاہدے قرآنی آیات نہیں ہوتے۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

مگر یہ کہ مقبول بٹ شہید مقبوضہ کشمیر چلے گئے اور وہاں تحریک کو متحرک کیا۔ وہ گوریلہ جنگ اور سیاسی جدوجہد کے بیک وقت حامی تھے او دونوں محاذوں کے ماہر مانے جاتے تھے۔ مقبول بٹ شہید نے تیاری مکمل کی تو بھٹو صاحب کی طرف سے مالی مدد نہ آنی تھی اور نہ ہی آئی۔ شہید کشمیر کے اہم ساتھی ڈاکٹر فاروق حیدر مرحوم کے مطابق راولپنڈی اور کراچی میں مقیم ساتھیوں نے پیپلز پارٹی کے اراکین بشمول خورشید حسن میر سے رابطہ کیا مگر کسی نے مثبت جواب نہ دیا جبکہ بھٹو صاحب نے سنی ان سنی کردی۔ بعد کے حالات نے مقبول بٹ شہید کو بھارتیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور آخر کار ان کی پارٹی کے چند جوشیلے جوانوں کی جذباتی حرکت ان کی شہادت کا باعث بن گئی۔

مقبول بٹ کی گرفتاری اور شہادت نے پاکستان میں پیپلز پارٹی کی تب کی حکومت اور پھر بعد کی حکومتوں کے کشمیر سے متعلق خدشات دور کردیے اور ان کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ فوری طور پر دور ہوگئی۔ کے ایچ خورشید اور سردار ابراہیم کو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے حق میں قائل کرلیا تھا جبکہ بعد کے حالات اور ذاتی مفادات نے سردار عبدالقیوم کے مفاداتی جہاد اور خودساختہ القاب کی حیثیت کو بھی عیاں کردیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا صوبہ بنانے میں سردار عبدالقیوم نہیں بلکہ کرنل مرزا حسن اصل رکاوٹ تھے۔ کرنل مرزا حسن کے بھٹو سے اختلافات ہوئے تو انہیں بھی جیل جانا پڑا۔ سردار عبدالقیوم اگر بھٹو سے ڈیل کرلیتے تو انکا اور انکے خاندان کا آزاد کشمیر کی سیاست میں کوئی مقام نہ رہتا۔ سردار صاحب نے اپنے خاندان کے مستقبل کی خاطر جیل کاٹی اور بعد میں اسے بھرپور طریقے سے کیش بھی کروالیا۔ ضیاء الحق کے دور میں جنرل حیات خان نے بھی سردار عبدالقیوم کو جیل میں ڈالا مگر جلد ہی سردار عبدالقیوم اور ضیاء الحق کے درمیان ڈیل ہوگئی اور دشمنی محض دوستی میں ہی نہیں بلکہ مرشدی اور مریدی میں بدل گئی جس کی روئیداد جناب رفیق ڈوگر نے اپنی کتاب اصلی ضیاء الحق کے صفحات پر قلمبند کی ہے۔

بھٹو سے متفق ہونے کا مطلب کاروبارِ سیاست سے دستبردار ہونے کے مترادف تھا۔ جناب کے ایچ خورشید اور سردار ابراہیم جیسے قد آور سیاستدانوں نے بھٹو دوستی کی بھاری قیمت

چکائی۔ جسطرح بھٹو نے اپنے لیے نیا پاکستان بنایا جہاں وہ کسی دوسرے کو برداشت نہ کرتے تھے ویسے ہی سردار عبدالقیوم نے تحریک آزادی کشمیر کی کوکھ سے جنم لینے والی ریاست آزاد کشمیر پر اپنے خاندان کی حکمرانی کا تہیہ کرلیا جس سے وہ کسی صورت دستبردار نہ ہونا چاہتے تھے۔ چوہدری غلام عباس، کے ایچ خورشید اور سردار محمد ابراہیم خان سیاست کو نہ تو کاروبار اور نہ ہی کھیل تماشہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک سیاست، ریاست، جمہوریت اور حکومت کا تصور سردار محمد عبدالقیوم سے الگ تھا۔ ایک ٹیلیویژن انٹرویو میں سردار عبدالقیوم خان نے خود کہا کہ روحانیت اور سیاست الگ الگ شعبے ہیں۔ سیاست ایک کھیل ہے جبکہ روحانیت کا مقام الگ ہے۔ سردار قیوم اپنے بیان کی ادائیگی میں بھول گئے کہ ایک سچا اور روحانی شخص کبھی ایسا کھیل نہیں کھیلتا جس میں جھوٹ، فراڈ، چکمہ اور شعبدہ بازی ہو۔ روحانیت کے پیروکار کبھی دنیاوی دولت اور شہرت کے طلبگار نہیں ہوتے۔ سردار عبدالقیوم کی ساری سیاست فوجی آمروں، ڈکٹیٹروں اور جابر حکمرانوں کی پشت پناہی کی مرہون منت رہی ہے۔ ایوب خان کے دور میں جناب کے ایچ خورشید کی حکومت جبراً برطرف کی گئی اور انہیں جیل میں ڈالا گیا، ان کے خاندان کو تکالیف کے شکنجے میں جکڑا گیا مگر اس مردحریت کے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ سردار عبدالقیوم اور ان کی پارٹی نے ایوبی دور میں چپ سادھ رکھی اور کے ایچ خورشید کے دلیرانہ اقدامات کے راستے میں رکاوٹ بنے رہے۔ ضیاء الحق برسراقتدار آئے تو سردار عبدالقیوم نے اپنی تاریخی بندوق جسے چلا کر وہ مجاہد اوّل بنے تھے ضیاء الحق کے آگے سرنڈر کردی اور انہیں اپنی مریدی میں لے لیا۔ پرویز مشرف آیا تو سردار اور ابن سردار نے سید پرویز شرف شاہ کی نہ صرف مریدی اختیار کی بلکہ اس ظالم اور بے حس حکمران کے ہر غیر آئینی ہتھکنڈوں کو سراہا۔ سردار اور ابن سردار نے مشرف کے کشمیر فارمولوں کی تائید وحمائت میں بھی دیر نہ لگائی اور کشمیر برائے فروخت کے اشتہاروں کے ماڈل بن گئے۔ سردار عتیق احمد خان نے مشرفی عشق میں نہال ہوکر ملٹری ڈیموکریسی کی اصطلاح گھڑی اور اپنی کرپشن پر دبیز پردہ ڈالنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ اعزاز سردار عتیق ہی ہو حاصل ہوا کہ مشرف کے کرپشن پارٹنر شوکت عزیز کی خوشنودی کیلئے اسمبلی میں کھڑے ہوکر ذوالفقار علی بھٹو جیسے دانشور سیاستدان کیلئے انتہائی توہین آمیز اور غیر شائستہ الفاظ استعمال کیے۔

مشرف کے بعد زرداری حکومت آئی تو سردار عتیق نے منظور وٹو اور یوسف رضا گیلانی کی مدد سے ''کشمیر بیچو'' پالیسی اختیار کرتے ہوئے میرپور میں ہزاروں ایکڑ زمین یوسف رضا گیلانی

کے بیٹوں کو بیچنے کا منصوبہ بنایا۔ مظفرآباد اور سرینگر کے درمیان ہونے والی تجارت میں وٹو کو حصہ دار بنانے کا طریقہ بھی تلاش کیا گیا اور دیگر حکومتی ٹھیکوں اور کاروبار سیاست میں سرکاری افسران سمیت پیپلز پارٹی کے اہم رہنماؤں کو فائدہ پہنچایا گیا۔

حیرت کی بات ہے کہ بھٹو کے نام نہاد جانشین وہ سب خرافات یکسر بھول گئے اور ابن سردار کو نہ صرف حکمرانی کی گدی پر بٹھایا بلکہ اسے اپنی بھرپور حمایت کا بھی یقین دلایا۔

تو پھر سردار قیوم یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ سیاست ایسا کھیل ہے جسکا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔

میں نے نینا کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

میں نے کب کہا کہ سردار قیوم نے غلط کہا تھا۔

نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ سردار قیوم کا استدلال غلط تھا۔ روحانی شخص کبھی مفاداتی سیاست کے کھیل میں نہیں پڑتا۔ بلکہ اگر ایسا شخص روحانیت کے کسی بھی درجے پر ہو تو وہ اپنا مقام ہی کھو بیٹھتا ہے۔

ہوسکتا ہے سردار قیوم بھی اپنا مقام کھو بیٹھے ہوں۔ میں نے کہا۔

ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ نینا نے جواب دیا۔

اس کی پرکھ کیا ہے؟ میں نے سوال کیا۔

اس کا جواب تو ایک ولی اکمل ہی دے سکتا ہے اور میرے حساب کے مطابق ولی اکمل یا قطب الاقطاب کا وجود مخفی ہے۔ ایسا روحانی وجود موجود تو ہے مگر دور کہیں پہاڑوں اور ویرانوں میں ہے۔

تو پھر گدی نشین پیر، صاحبزادہ گان، متولیان، مخدومان، سجادہ نشین اور سجادگان کیا ہیں؟ میں نے پوچھا۔

یہ سب دیہاڑی دار مزدور اور روحانیت کا بہروپ ہیں۔ نینا نے کہا۔

ہم دور نکل گئے ہیں۔ تم نے بھٹو کی کشمیر پالیسی کا پوچھا تھا تو آخری بات یہ ہے کہ بھٹو کی کشمیر پالیسی آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں پر مشتمل ایک الگ صوبہ بنانا تھا جسکی کرنل مرزا حسن خان اور سردار عبدالقیوم نے مخالفت کی۔ سردار قیوم کی مخالفت مفاداتی، کاروباری اور اپنے خاندان کے

مستقبل کی آبیاری پرمبنی تھی جبکہ کرنل حسن کی مخالفت سچائی اور حقیقت پرمبنی تھی۔

بھٹو زندہ رہتے تو اگلے دور حکومت میں سردار عبدالقیوم سے ڈیل کر لیتے۔ سردار قیوم اور ان کے فرزند ارجمند سے بہتر سیاسی ڈیلر پاکستان اور آزاد کشمیر میں نہیں۔ اگر الطاف حسین، اسفندیار ولی، شیر پاؤ، فضل الرحمٰن اور جولی چیڑ گروپ میں سیاسی ڈیلر شپ کا مقابلہ ہو تو سرداروں سے بہتر کوئی ڈیلر مارکیٹ میں نہیں ملے گا۔ پیپلز پارٹی، میاں برادران، چوھدری صاحبان اور جماعت اسلامی والے کھٹے میٹھے بھائیوں کا تو تم نے ذکر ہی نہیں کیا۔

میں نے کہا۔

اور تم عمران خان کو بھول گئے۔ نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

دیکھو عمران خان اس میدان کا نیا کھلاڑی ہے اور ابھی تک اس پر مغربی جمہوریت، اخلاقیات، عدل و انصاف اور روایات کا بھوت سوار ہے۔ پیپلز پارٹی میاں برادران، چوھدری اور جماعتوں والے ہی وہ بڑے گروپ اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں جو ان چھوٹے ڈیلروں سے سیاسی سودے بازیاں کرتے ہیں اور انہیں وزارتیں، پرمٹ اور دیگر سہولیات فراہم کر کے پاکستان اور پاکستانی عوام پر حکمرانی کا لائسنس جاری کرتے ہیں۔

جولی چیڑ گروپ میں خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس مجاہد اوّل کا خود ساختہ ٹائٹل بھی ہے جس کی نہ تو کوئی بنیاد ہے اور نہ ہی حقیقت۔ مجاہد اوّل ایک ایسا افسانہ ہے جسے آزاد کشمیر کے عوام نے حقیقت سمجھ لیا ہے جبکہ اس افسانے کا کوئی سر ہے نہ پیر۔

یہ کہانی مولاجٹ فلم کے سکرپٹ کی طرح ہے۔ یہ ایسی ایکشن سے بھرپور سٹوری ہے جس کا ہیرو لانس نائیک سردار عبدالقیوم خان آف جولی چیڑ ہے۔ یہ نوجوان انڈین آرمی سروس کور میں سٹور مین بھرتی ہوتا ہے اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران مصر چلا جاتا ہے جہاں اس کی ڈیوٹی سکندریہ اور مصر کے دوسرے مقامات پر سپلائی ڈپوؤں میں ہوتی ہے۔ مصر میں رہتے ہوئے نوجوان سردار عربی زبان سیکھ لیتا ہے اور دیگر انڈین فوجیوں کی طرح اٹالین اور جرمن زبان کی سدھ بدھ بھی آجاتی ہے۔ سٹور مین کا تعلق براہ راست انگریز افسروں، جوانوں اور عہدیداروں سے تھا۔ اسلئے سردار کی انگریزی بھی پالش ہوجاتی ہے جو اس کی تقدیر بدلنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوتی ہے۔

جنگ عظیم دوئم کا خاتمہ ہوتا ہے اور انڈین آرمی پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہوجاتی ہے

جبکہ ہزاروں فوجیوں کونوکری سے فارغ کر کے پنشن پر گھر بھیج دیا جاتا ہے۔سردار قیوم بھی ان ہی فوجیوں میں شمار ہوتے ہیں جوفوج سے تو فارغ ہو گئے مگر تقدیر اور مرشد کی دعاؤں نے انہیں کشمیر کے پونے حصے کا بادشاہ بنا دیا۔سردار قیوم بھٹو کی طرح ذہین اور شاطر انسان ہیں۔دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ بھٹو سیاسی لیڈر تھے اور سردار صاحب ڈیلر ہیں۔لیڈر مارتا ہے اور مرتا ہے۔اسکا مقدر فتح اور شکست کے درمیان معلق رہتا ہے۔وہ فتح یاب ہو کر حکمرانی کرتا ہے یا پھر شکست کے بعد مار دیا جاتا ہے۔ڈیلر نہ فاتح ہوتا ہے اور نہ مفتوح۔وہ لڑتا نہیں سودا کرتا ہے۔ اب خود ہی سوچو کہ ایک ڈیلر اور مجاہد کا کیا رشتہ ہوسکتا ہے۔

مجاہد اور لیڈر کبھی امیر کبیر نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ فقیر اور درویش رہتے ہیں۔اسلامی دور سے شروع کرو تو پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد اصحابؓ رسول ﷺ آتے ہیں۔ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ مکہ کے امیروں میں شمار ہوتے تھے۔عثمان غنیؓ عرب کے رئیس اعظم تھے، ام المومنین حضرت خدیجہ ؓ بھی عرب کے امرأ میں شمار ہوتی تھیں۔مگر جب یہ امراء ورئیس رسول ﷺ کے غلاموں میں شمار ہو کر دائیرہ اسلام میں داخل ہوئے تو سب کے سب شیر خدا کی طرح فقیر ہو گئے جن کے گھر میں نہ کبھی چراغ جلا، نہ کسی نے شکم بھر کر کھایا اور نہ قیمتی کپڑا زیب تن کیا۔اب ان کی شان دیکھو۔۔۔۔۔گھر کا سربراہ حیدرر کرارؓ اور شیر خدا ہے۔گھر کی مالکن خاتون جنتؓ۔بچے جنت کے سردار اور پیغمبر اسلام ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔

اب روایات، سیاسیات، جمہوریت، اصولیت، اخلاقیات اور اصول وضوابط کی طرف دیکھو تو تمہیں نپولین، چرچل، ڈیگال، آئیزن ہاور، چو این لائی، ماؤزے تنگ، قائداعظم، نہرو، گاندھی، امان اللہ خان اور یہاں اسی پاکستان میں ایک حسین شہید سہروردی بھی دکھائی دینگے۔

مجاہدین کی فہرست بھی عظیم اور طویل ہے۔مصر میں ایک سید قطب شہید ہوئے جنکا پیغام آج بھی سنائی دیتا ہے۔لیبیا کا صحرائی شیر عمر مختار بھی تھا جسکا خوف آج تک ظالموں کے دلوں سے نہیں مٹا۔کتنے نام بتاؤں تاریخ بھری ہے۔ابھی چند برس پہلے ایران میں ایک امام خمینی بھی تھے اور اب ان کی امانت کا وارث احمدی نژاد ہے۔

لخ ویلیسا اپنی قوم کو آزادی دلاتا ہے اور جمہوریت کا پرچم بلند کرتا مگر حکومت پر قابض نہیں ہوتا۔الیکشن لڑکر آتا ہے تو بحیثیت حکمران ناکام ہوتا ہے اور اپنے اُوزار اٹھا کر واپس شپ یارڈ میں نوکری کی درخواست دیتا ہے۔نیلسن منڈیلا آزادی اور جمہوریت کی جنگ قید خانوں میں

بیٹھ کر لڑتا ہے مگر کسی صلے کا طلب گار نہیں۔ ماؤزے تنگ اور چو این لائی کی بیوؤں کو اتنی ہی پنشن ملی جس سے گزارہ ہو جائے۔ انہیں پلاٹ، بنگلے، گاڑیاں، مفت ڈرائیور، ٹیلیفون، کک اور دیگر شاہانہ سہولیات نہیں ملتیں جس طرح پاکستان میں ریٹائرڈ ججوں، جرنیلوں، سیکریٹریوں اور سیاستدانوں کو ملتی ہیں مگر پھر بھی شکوے شکایات ہیں کہ ہماری قومی خدمات کا صلہ نہیں ملا۔ اب ایک نظر ان کی خدمات پر ڈالیں تو چور، ڈاکو اور لٹیرے شرما جائیں۔

تم مجاہد اوّل کی بات کر رہی تھی۔ میں نے نینا کو روک کر کہا۔

وہی تو کر رہی ہوں۔

مجاہد اول کے اس ٹائیٹل کی وہ خود بھی نفی کر چکے ہیں۔ انہوں نے تین مختلف بور کی بندوقیں پاکستانی سیاستدانوں کو مختلف اوقات میں پیش کیں اور دعویٰ کیا کہ یہ وہ بندوق ہے جس سے انہوں نے پہلی گولی چلائی تھی۔ اب ایک مجاہد اوّل تن تنہا تین بندوقیں کیسے چلا سکتا ہے۔ فلموں کے ہیرو اکثر دونوں ہاتھوں سے دو دو پستول اور آٹو میٹک بندوقیں تو چلاتے ہیں مگر تین بندوقیں چلانے والا ہیرو صرف مجاہد اول ہی ہوسکتا ہے۔

اب جو شخص تین بندوقیں چلا سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ نینا نے کہا۔

جان ریمبو تو تین سے زیادہ بندوقیں چلاتا ہے۔ میں نے کہا۔

ہاں! مگر باقی بندوقیں اس کے ہاتھ میں نہیں گلے میں لٹکی یا پھر پیٹھ پر لادی ہوتی ہیں۔ ریمبو کی بندوقیں امریکن اور سپر آٹو میٹک ہوتی ہیں جبکہ سردار عبدالقیوم کی بندوقیں درہ میڈ ٹکڈم، سنگل شاٹ، بولٹ ایکشن یا پھر مزل لوڈڈ، چھرے دار ٹوپی والی ہونی چاہیے۔ اس دور میں عام لوگوں کے پاس ایسی ہی بندوقیں تھیں جبکہ تھری ناٹ تھری صرف فوج کے پاس تھی۔ سردار محمد ابراہیم خان نے اپنی کتاب دی کشمیر ساگا میں بھی ایسی ہی بندوقوں کا ذکر کیا ہے کہ بعض مقامات پر توڑے دار بندوقوں کیلئے بارود کی کمی تھی جو کہ مری سے یا پھر پنڈی سے منگوانا پڑتا تھا۔

نینا ہوسکتا ہے سردار صاحب نے تین چار بندوقیں بھر کر رکھی ہوں اور پھر باری باری ان سے فائیر کرتے رہے ہوں۔ اس طرح وہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اپنے پہلے کمانڈو ایکشن میں تین بندوقیں استعمال کیں۔ میں نے کہا۔

یہ ممکن نہیں۔ توڑے دار بندوق کی رینج پچھتر گز ہے جبکہ تھری ناٹ تھری تین سو سے پانچ سو گز تک مار کرتی ہے جو کہ ڈوگروں کے پاس تھیں۔ اگر سردار صاحب توڑے دار بندوق سے فائر

کرتے تو جوابی فائر کی صورت میں شہید ہو جاتے۔

پھر حقیقت کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

حقیقت کچھ بھی نہیں شاطرانہ ذہن کی من گھڑت کہانی ہے جسکا نہ کوئی گواہ ہے نہ ثبوت، نیلا بٹ کے مقام پر ایک پولیس چوکی تھی جو شورش کے وقت ڈوگرہ پولیس نے خالی کر دی جہاں سردار نے اپنا ایکشن دکھا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اور آزاد کشمیر کے عوام نے اسے سچ مان لیا۔ میں نے کہا۔

اسطرح کے ملٹری ایکشن عموماً فرضی کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں جنھیں پراپیگنڈے اور پبلسٹی کی مدد سے سچ بنا دیا جاتا ہے۔ سیاہ چن پر لڑی جانے والی طویل جنگ میں بھارتی اور پاکستانی فوجیوں کو ملنے والے اعزازات میں بہت سے فرضی ہیں بلکہ اس سلسلہ میں بھارت دنیا بھر میں مشہور ہے۔

کارگل کی لڑائی میں بھی ایسا ہوا۔ بہت سے افسر ایسے ہیں جو آخری دنوں میں محاذ جنگ پر گئے اور تمغے اور ستارے لیکر آ گئے۔ بھارتیوں نے اس میدان میں بھی دو قدم آگے رکھے اور من گھڑت کہانیوں پر مبنی فرضی معرکے لڑ کر بڑے بڑے اعزازات حاصل کر لیے۔

تم نے خود اپنی کتاب لنتھا میں آزاد کشمیر رجمنٹ کے کرنل منشا خان کا ذکر کیا ہے جو آپریشن جبرالٹر کے دوران راستہ بھول کر ادھر ادھر گھومتے رہے اور سیز فائر لائن کراس کئے بغیر ہی واپس آ گئے۔ اب تم پونچھ کے لوگوں سے پوچھو تو ہر گاؤں اور محلے میں کرنل منشا کی بہادری جرأت اور دلیری کے قصے مشہور ہیں۔ کرنل صاحب کو 1965ء کی جنگ کا ایک ہیرو تصور کیا جاتا ہے اور ان سے منسوب ایسے ایسے معرکے بیان کئے جاتے ہیں کہ ہر معرکے پر فلم بن سکتی ہے۔ کرنل منشا کو بھی ستارہ جرأت سے نوازا گیا اور ان کی بہادری اور دلیری کے قصوں نے انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کا ممبر اور سپیکر بنا دیا۔

سردار عبدالقیوم خان کا نیلا بٹ ایکشن بھی ایسا ھی معرکہ تھا جسے پبلسٹی نے حقیقت کا روپ دیا۔ بہت سے لوگ اس فرضی معرکے پر لکھ چکے ہیں مگر سردار صاحب، ان کا بیٹا اور سیاسی ٹولہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں۔

چانکیہ کوتیلہ نے صدیوں پہلے کہا تھا کہ اگر جھوٹ کو بار بار دھراؤ تو لوگ اسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

تم سیاسی ڈیلری کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

وہی کر رہی ہوں۔۔ نینا نے وقفہ کیا۔اور پھر بات جاری رکھی۔

بھٹو جانتا تھا کہ کس کی کیا قیمت اور مقام ہے۔اس نے بیوروکریسی کو کھینچا۔ جرنیلوں کو رسوا کیا۔صحافیوں کو جیلوں میں ڈالا۔ دوستوں کی تذلیل کی مگر قدرت اللہ شہاب اور اسی طرح کے بہت سے لوگوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ بھٹو کو پتہ تھا کہ سردار قیوم اور مقبول بٹ میں کیا فرق ہے۔ سردار سیاسی ڈیلر اور بٹ مجاہد لیڈر تھا۔سردار کی قیمت تھی مگر مجاھد کشمیر مقبول بٹ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ بٹ جہادی تھا اور سردار جہازی۔ بٹ کی تقدیر فتح اور شکست کے درمیان معلق تھی جسکا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ بٹ کا اثاثہ وہ لاکھوں شہید اور غازی ہیں جو ہر دن ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔سردار کا اثاثہ اسکا سپوت ہے جو سودے بازی میں باپ سے بھی دو قدم آگے ہے۔ بٹ کے پیروکار خون پیش کر رہے ہیں اور سردار کا لخت جگر خون بیچ رہا ہے۔ بٹ کے ماننے والے بھارتی بندوقوں سے نکلی گولیاں چھاتی پر سہہ کر ابدی نیند سو رہے ہیں اور سردار کا جانشین کرپشن کی سیاست سے کمائے ہوئے مال کے لٹ جانے کی پریشانی میں سو نہیں سکتا۔ بٹ کے پیروکاروں نے قبرستان سجا دیئے ہیں اور سردار کے سپوت نے اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کیلئے بھی کاروبار بنا دیے۔بٹ کے پیروکار بھوکے پیاسے جنگلوں اور ویرانوں میں پھر رہے ہیں اور سردار کی وارث محلوں، فایئو سٹار ہوٹلوں اور کلبوں میں مزے کر رہے ہیں۔

اور کیا سنو گے؟ نینا نے سوال کیا۔

یہ تو داستان ندامت ہے کہاں تک سناؤ گی۔ چلو بولتی جاؤ۔

تو سنو۔بھٹو کو پتہ تھا کہ بٹ بکے گا نہیں بلکہ آنے والے دور میں بھٹو کی آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں سے متعلق پالیسی کی راہ میں رکاوٹ بنے گا۔ بھٹو نے ٹانڈا ڈیم کوہاٹ میں ہونے والے مذاکرات کی ناکامی کے بعد بہتر سمجھا کہ کشمیر کے عاشق کو اس کی محبوب سرزمین پر بھیجنے کا چکمہ دیا جائے۔اس سے پہلے بھٹو گنگا طیارے کے اغواء کے بعد مجاہدین کے ہاتھوں اسے تباہ کروانے کا کامیاب کھیل کھیل چکا تھا اور جانتا تھا کہ آزادی کے یہ متوالے انتہائی جذباتی ہوتے ہیں۔ بھٹو نے گنگا طیارہ کشمیری مجاھدین سے تباہ کروا کر عملاً مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنوا دیا جس طرح بھٹو کے باپ نے جونا گڑھ کا پاکستان سے الحاق کروا کر کشمیر کو بھارت کی گود میں ڈال دیا تھا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

تقسیم ہند کا ایک فامولا طے ہوا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان اور ہندو اکثریتی علاقے بھارت کا حصہ ہونگے۔اس فارمولے کے تحت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے وہ علاقے جہاں پاکستان معروض وجود میں آیا تو ایک نئی مملکت کا حصہ بنتے تھے۔

اس فارمولے کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ آزاد اور خودمختار ریاستیں جنھیں پرنسلی اسٹیٹس کہا جاتا تھا ہندو یا پھر مسلم اکثریتی فارمولے کے تحت چاہیں تو بھارت یا پاکستان سے الحاق کرلیں یا پھر اپنی آزاد اور خودمختار حیثیت برقرار رکھیں۔

بھوپال ہندو اکثریتی ریاست تھی جس کا حکمران خاندان مسلمان تھا۔تقسیم کے فارمولے کو مد نظر رکھتے ہوئے بھوپال کے حکمرانوں نے ریاست کا الحاق بھارت سے کردیا۔سکم نے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی جس پر بعد میں بھارت نے ایک سازش کے تحت قبضہ کرلیا۔

حیدرآباد دکن کا حکمران مسلمان تھا مگر آبادی ہندو تھی جس کا الحاق بھارت کے ساتھ ہی ہونا چاہئے تھا یا دکن کا نواب اپنی آزاد حیثیت کا اعلان کرتا مگر جونا گڑھ کی طرح اس ریاست نے بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کر دیا۔ جونا گڑھ کے وزیراعظم سر شاہنواز بھٹو نے نواب کو پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے قائل کیا جو کہ ایک گہری سازش تھی جسکا خاطرخواہ فائدہ بھارت کو ہوا۔کشمیر مسلم اکثریتی ریاست تھی جس کا حکمران ڈوگرہ ہندو تھا۔کشمیر میں 1913 سے ہی آزادی کی تحریک چل رہی تھی جس کا مقصد مہاراجہ کشمیر کے ظالمانہ طرز حکمرانی سے نجات، جمہوریت کے قیام اور کشمیر کی صدیوں پرانی روایات کی بحالی تھا۔تحریک آزادی کشمیر کا شروع سے المیہ رہا ہے کہ کشمیر کے اندر سے ہی ایک ٹولہ اغیار کے ہاتھوں بکنے اور آزادی پسندوں کے خون کا سودا کرنے کو تیار رہتا ہے۔ڈوگرہ راج کے خلاف تحریک چلی تو کوئی بیرونی طاقت کشمیریوں کی مدد کیلئے تیار نہ تھی۔ ڈوگرہ حکمران انگریزی راج کے مددگار اور معاون تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی اور افغانستان پر انگریزوں کی دوبار یلغار سے لیکر پہلی اور دوسری جنگ عظیم تک ڈوگرہ حکمرانوں نے انگریز سرکار کی بھرپور مدد کی۔

ڈوگرہ حکمرانوں نے گریٹ گیم میں بھی اہم رول ادا کیا۔روسی مہم جوؤں کا راستہ روکنے کیلئے ڈوگروں نے چین سے ملحقہ سرحدی علاقوں بشمول زنسکار، گلگت اور بلتستان کو انگریزوں کی علمداری میں دے دیا۔ان علاقوں میں ڈوگرہ پولیس،فوج اور انتظامی اداروں کی معاونت کیلئے انگیز ریذیڈنٹ اور فوجی افسر تعینات کئے گئے جو وہاں کے اصل حکمران تھے۔

روس میں ایک کے بعد دوسرا انقلاب آیا تو چین کے صوبہ سنکیانگ کی حالت بھی گلگت و بلتستان کی طرح ہوگئی۔ روسیوں نے وسطی ایشیاء کی مسلمان ریاستوں پر قبضہ کیا تو چین کا صوبہ سنکیانگ بھی متاثر ہوا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔سنکیانگ میں شورش دبانے اور مسلمانوں کی سرکوبی کیلئے چین نے روسیوں کو کھلی چھٹی دی جس سے روسیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ان حالات میں روس اور نہ ہی چین اپنے پڑوس میں ایک ایسی تحریک کی حمائت کرنے کی پوزیشن میں تھا جس کی کوکھ سے ایک آزاد اور خودمختار مسلم اکثریتی ریاست وجود پذیر ہوکر روس اور چین کے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن جائے۔

شمالی علاقوں میں ایک چھوٹی سی ریاست گلمت کا راجہ کاشغر کے حکمران کا رشتہ دار تھا۔ انگریزوں نے ہنزہ اور ملحقہ گلمت پر قبضہ کیا تو گلمت کا راجہ جو عملاً ہنزہ کے میر کا باجگزار تھا انگریز کے سامنے ڈٹ گیا اور کچھ دیر کی مزاحمت کے بعد اپنے خاندان سمیت کاشغر بھاگ گیا۔ انگریز اور ڈوگرہ سرکار کو ہمیشہ سے قلق رہا کہ وہ گلمت کے راجہ کو گرفتار کرنے میں ناکام کیوں رہے۔اس واقع کے بعد انگریز اور ڈوگرہ حکومتوں نے ایسا بندوبست کیا کہ شمالی علاقوں کے عوام کا چینی مسلمانوں اور حکومت سے تعلق محدود کردیا گیا۔

روسیوں کی یلغار کے دوران ڈوگروں اور انگریزوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہزاروں ازبک، تاجک اور ترکمان باشندے اپنے خاندانوں سمیت شمالی علاقوں میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے اور آج تک واخان کی سرحدی پٹی سے لیکر بروغل تک آباد ہیں۔ کچھ قافلے کشمیر اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کی طرف بھی چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی جس کا اثر تحریک آزادی کشمیر پر بھی پڑا۔ آزادی کی کسی بھی تحریک کی کامیابی کیلئے دوست ممالک کی حکومتوں اور عوام کا اعتماد اور امداد ایک ضروری عنصر ہوتا ہے جو کشمیریوں کو کبھی بھی میسر نہیں ہوا۔

افغانستان کی مثال تمھارے سامنے ہے۔افغانوں کی تاریخ دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ یہ ملک دنیا کا قدیم ترین میدان جنگ ہے جہاں کبھی بھی امن نہیں ہوا اور کوئی نہ کوئی ملک، قوم یا پھر باہم افغان قبائل حالت جنگ میں رہے ہیں۔کسی دور میں یہ علاقہ ویران اور سنسان تھا۔ مغرب اور شمال سے چرواہوں اور حملہ آوروں کے ریوڑ ہند اور ایران کی طرف چلے تو افغانستان کے پہاڑ، جنگل اور صحرا تھکے ماندے چرواہوں، لٹے ہوئے قافلوں سے بچ جانے والوں، زخم خوردہ سپاہیوں اور لشکروں سے بھاگے ہوئے غلاموں کی پناہ گاہ بن گئے۔

مہمان نوازی افغانستان کی مٹی کا خاصہ ہے مگر یہاں کے موسم اور مٹی کسی کو نہ قابض ہونے دیتی ہے اور نہ ہی مستقل سکونت مہیا کرتی ہے۔

تمھارا مطلب ہے کہ سیاسی پناہ نہیں ملتی۔ میں نے کہا۔

بس ایسی ہی پناہ ملتی ہے جیسی تمہارے باپ کو ملی ہے۔ نینا نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔

افغانستان کے ہزارہ قبائل منگول النسل اور مسلکی لحاظ سے اہل تشعی ہیں مگر انہیں جو پذیرائی صوبہ بلوچستان کے ہزاروں کی طرف سے میسر ہے وہ شیعہ ایران میں نہیں۔

یہی حال بلوچوں کا ہے۔ ایرانی بلوچستان جسے شیستان کہا جاتا ہے اپنے ہم زبان، ہم نسل اور ہم مسلک پاکستانی بلوچوں کیلئے اجنبی ہے۔

افغانستان کے شمال، مغرب اور جنوب مغربی حصوں میں ازبک، تاجک، ترکمان اور دوسرے قبائل آباد ہیں جنکا اصل وطن وسطی ایشیائی ریاستیں ہیں مگر افغانستان میں کسی بھی ناگہانیت کی صورت میں انہیں اپنی آبائی ریاستیں اور ہم نسل قبائل قبول نہیں کرتے۔ افغانستان پر سابق سویت یونین نے قبضہ کیا تو سویت فوجیوں کی بڑی تعداد کیمونسٹ ازبکوں، تاجکوں، ترکمانوں اور دوسرے قبائل پر مشتمل تھی جو کبھی مسلمان اور اسلام کے علمبردار رہے تھے۔ سویت فوجیوں نے اپنے ہم نسلوں اور پختونوں میں کوئی فرق نہ رکھا اور سب پر برابر مظالم ڈھائے۔

پہلے پہل کچھ ترکمان ترکی کی طرف ہجرت کر گئے مگر جدید ترک معاشرے میں سما نہ سکے حالانکہ ترک حکومت اور عوام نے انہیں اپنائیت کا احساس اور بھرپور مدد کا یقین بھی دلایا مگر صدیوں سے آزاد اور قبائلی رسوم کے عادی افغانوں کیلئے حکومتی قوانین کے تابع زندگی گزارنا مشکل ہوگیا۔

ایسی ہی صورتحال ایران میں پیدا ہوئی۔ ایرانیوں نے ہم مسلک افغان مہاجرین کیلئے ایران آنے پر کوئی پابندی نہ لگائی بلکہ بارڈر پر ہی انہیں خوش آمدید کہا اور گاڑیوں میں بھر کر پہلے سے بنائے گئے مہاجرین کیمپوں میں ڈال دیا۔ ان کیمپوں میں زندگی گزارنے کی ضروریات تو تھیں مگر کوئی شخص اپنی مرضی سے کیمپ سے باہر نہ جا سکتا تھا۔

افغانوں کو جلد ہی اس ماحول نے قید کا احساس دلایا۔ صحراؤں اور پہاڑوں میں گھومنے والے آزاد منش انسانوں کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ مسلک اور زبان کی حیثیت ثانوی ہے۔ اصل

چیز آزادی اور مٹی سے لگاؤ ہے جو صرف اپنی سرزمین پر ہی میسر ہے۔ افغان پختونوں اور فارسی بانوں کو دنیا میں افغانستان کے علاوہ صرف پاکستان کی دھرتی ہی راس آتی ہے جہاں انہیں وطن جیسا احساس ہوتا ہے۔

مگر صد افسوس کہ۔۔۔۔ نینا نے آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ افسردہ ہوگئی اور بولی۔

اس دنیا میں افغانوں جیسا نڈر، بہادر، وطن پرست، آزادی پسند، مہمان نواز، روایات پسند، قبائلی قوانین اور رواج کا تابدار، معاملہ فہم، کاوباری ذھن کا حامل بیوپاری نہیں مگر ساتھ ہی یہ لوگ احسان فراموش، بے حس، دغاباز اور برادرکش بھی ہیں۔

وہ کیسے؟ میں نے کہا۔

سویت جارحیت کے خلاف صرف اہل مغرب اور امریکہ نے ہی نہیں بلکہ کیمونسٹ چین، کوریا اور ساری مسلم حکومتوں اور عوام نے افغانوں کی حمایت کی مگر کسی نے ان مخصوص کلچر و عادات کے حامل قبائل کو اپنی سرزمین پر بحثیت مہاجر بسنے کی اجازت نہ دی۔ ترک ماڈرن معاشرے اور ایرانی پابندیوں سے دلبرداشتہ ہو کر تیس لاکھ افغانوں نے پاکستان کا رخ کیا تو کسی نے ان کا مذھب، مسلک، نسل، ذات اور قبیلہ نہ پوچھا۔ گلگت و بلتستان، مظفر آباد اور چترال سے لیکر کراچی اور گوادر کے ساحلوں تک سارا پاکستان افغان مہاجرین کا کیمپ بن گیا۔

روس اور بھارت نواز عوامی نیشنل پارٹی اور سوشلست نظریات کے حامل بلوچ لیڈروں کے سوا کسی پاکستانی سیاستدان اور عوام نے افغانوں کی مخالفت نہ کی بلکہ انہیں اپنے گھروں، زمینوں اور علاقوں میں ہی نہیں بلکہ دلوں میں بھی بسایا۔

سندھی قوم پرستوں اور ایم کیو ایم نے بھی تو مخالفت کی تھی۔ میں نے کہا۔

سندھی قوم پرستوں اور ایم کیو ایم کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نینا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

سندھی قوم پرستوں کی سندھ میں اکثریت نہیں جبکہ ایم کیو ایم کی کشتی وقت کی لہروں پر چلتی ہے۔ ایم کیو ایم اگرچہ بھارت نوازی کا کھل کر مظاہرہ بھی نہیں کرتی تو بھارت مخالف بھی نہیں اور یہی حال فضل الرحمٰن گروپ کا ہے۔ فضل الطاف سیاست موجوں اور ہواؤں کی تبدیلی کے ساتھ چلتی اور رکتی ہے۔ ان کے اعلانات اور بیانات اور عمل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ دونوں

گروپوں کی سیاست مخصوص علاقوں، لوگوں اور طبقہ فکر تک محدود ہے۔ ان کے ووٹر، کارکن اور لیڈر ایک ضابطے کے پابند ہیں جس سے انحراف پارٹی قیادت سے بغاوت کے مترادف ہے۔

اس کی کوئی سزا بھی ہے؟ میں نے پوچھا۔

سزا وہی ہے جو ایک باغی کی ہوتی ہے۔ نینا نے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔

میں افغانوں کی بات کر رہی تھی۔

پاکستان کی سرزمین پر پناہ لینے اور موجیں کرنے کے باوجود یہ لوگ پاکستان کے دوست نہیں بلکہ ہر اُس کوشش، سازش اور فتنے کا حصہ بن جاتے ہیں جس سے پاکستان کو نقصان پہنچے۔ افغانی کبھی پاکستان کی مجبوریوں کا احساس نہیں کرتے بلکہ مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ رہتے کھاتے اور کاروبار پاکستان کی سرزمین پر بیٹھ کر کرتے ہیں اور پھر شکوے شکایات بھی اسی ملک سے کرتے ہیں۔ افغانوں نے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے کلچر اور روایات کو تباہ کیا اور اس علاقے کو سمگلنگ سمیت دیگر برائیوں کا گڑھ بنا دیا۔ پورے صوبہ سرحد میں پشاور سے ملحق حیات آباد واحد ماڈرن بستی ہے جس پر افغانوں کا مکمل کنٹرول ہے اور یہاں شیر پاؤ، فضل الرحمٰن اور اسفندیار ولی کی مشترکہ حمایت سے ان لوگوں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں۔

پہلے یہ وسیع وعریض حویلیاں افغان وار لارڈز، سمگلروں، منشیات فروشوں اور دیگر کاروباری اور جرائم پیشہ افراد نے مقامی قبائل اور پراپرٹی ڈیلروں کے نام پر تعمیر کیں اور انہیں اپنی آمدنی سے معقول حصہ دیتے رہے۔ پرویزی جمہوریت کا دور آیا تو سرحد میں فضل الرحمٰن گروپ نے حکومت قائم کر لی اور مرکز میں شیر پاؤ وزیر داخلہ بن گیا۔

شیر پاؤ نے افغانوں کیلئے ایک نیا راستہ کھولا اور افغانوں کو پاکستانی شہریت بیچنا شروع کی اور انھیں پاکستانی شناختی کارڈ جاری کر دیے۔ پاکستانی شہریت اور شناختی کارڈ خریدنے والوں میں ڈیورنڈ لائن کے قریب بسنے والے مہمند قبیلے کے علاوہ دستوخیل اور ہزار بز قبائل قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے نام پر کروڑوں ڈالر کی روزانہ کے حساب سے سمگلنگ کرتے ہیں جس کا باقائدہ ریکارڈ خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس ہوتا ہے۔

سمگلنگ کا ریکارڈ بھی ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

ڈیورنڈ لائن دنیا کا سب سے بڑا سمگلنگ ہب ہے۔

خنجراب سے بروغل تک واخان پٹی کے ساتھ چین سے ہر طرح کا سامان سمگل ہوتا ہے

جس کی اختتامی منزل پشاور کے قریب جمرود میں واقع کئی ایکڑ پر پھیلی کارخانو مارکیٹ ہے۔یہ سمگلر بھی افغانی ہیں جن کے ایجنٹ پیر علی اور اُرمچی میں اپنے باقاعدہ دفتر کھولے بیٹھے ہیں۔یہ سمگلنگ بھی افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے پردے میں ہوتی ہے۔کچھ سامان کراچی کے راستے یا پھر سوست میں واقع کسٹم چوکی سے بھی ہو کر آتا ہے مگر زیادہ تر بارڈر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔خیبر ایجنسی سب سے بڑا اڈہ ہے چونکہ یہ سب سے زیادہ محفوظ اور مختصر راستے پر موجود ہے۔کراچی سے آنے والا مال جو بظاہر تو افغانستان کیلئے آتا ہے اور کسٹم کے قوائد وضوابط بھی پورے کئے جاتے ہیں مگر پشاور سے چند کلومیٹر دور جمرود کے مقام پر غائب ہو جاتا ہے۔کسٹم حکام بھاری رقوم لیکر اسے کاغذوں میں افغانستان بھجوا دیتے ہیں مگر کروڑوں ڈالر کا یہ سامان باڑہ، جمرود اور شاہ کس میں واقع بڑے بڑے گوداموں میں منتقل ہوتا ہے اور پھر بغیر کسی کسٹم ڈیوٹی کے پاکستان اور بھارت تک جا پہنچتا ہے۔

بیس فیصد سامان جو طورخم بارڈر کراس کرتا ہے وہ بھی پاکستانی سرحد سے تین کلومیٹر دور افغان علاقے میں اَن لوڈ ہوتا ہے اور چند ہی گھنٹوں بعد خچروں، گدھوں، چھوٹی گاڑیوں کے علاوہ سینکڑں مزدوروں کے سروں پر یہی سامان واپس لنڈی کوتل کے گوداموں میں بھر دیا جاتا ہے جہاں سے یہ پشاور کے راستے کراچی اور بمبئی تک جا پہنچتا ہے۔کتنا مال کہاں سے آتا ہے، کہاں رکھا جاتا ہے اور پھر کہاں جاتا ہے سب پولیٹیکل ایجنٹ کے علم میں ہوتا ہے چونکہ یہ سمگلر کروڑوں روپے روزانہ کے حساب سے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے حکومتی افسروں اور سیاستدانوں کے گھروں اور بینکوں تک پہنچاتے ہیں۔پولیٹیکل ایجنٹ ایجنسی کا اصل حکمران اور بادشاہ ہوتا ہے جس کی مرضی ومنشاء کے بغیر قبائلی علاقوں میں کسی قسم کا کاروبار نہیں ہوسکتا۔

افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کی آڑ میں افغان تاجر اور سمگلر ہر سال پاکستان کو اربوں ڈالر کا نقصان پہنچاتے ہیں جس میں صوبہ سرحد کی اشرافیہ، سیاسی گھرانے اور حکومتی اہلکاروں کے علاوہ مرکزی حکومت میں بیٹھے کچھ اہم لوگ اور وزارتیں برابر کی شریک ہیں۔

پرویزی جمہوریت کے دور میں فضل الرحمٰن گروپ نے بھی اس گنگا میں ہاتھ دھوئے اور اربوں ڈالر کمائے۔خود مولانا فضل الرحمٰن پر گندم، گھی، مویشی اور ڈیزل افغانستان بھیجنے اور مال کمانے کا الزام لگا، مگر سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے الزامات الزامات ہی رہے۔

فضل الرحمٰن کی سرحد میں قائم اسلامی حکومت کے وزیر اعلیٰ پر زلزلہ زدگان کیلئے آنے والا

مال کارخانو مارکیٹ بھیج کر فروخت کرنے کا الزام بھی تھا مگر کسی عدالت، جرگے، مفتی، مولوی اور ملا نے اسطرف دھیاں نہ دیا۔ حیات آباد میں واقع زرغونی مسجد سے ملحقہ بیس کنال سے زیادہ رہائشی رقبہ سرحد کی اسلامی حکومت نے چند لاکھ میں ایک کمپنی کو فروخت کردیا اور درپردہ کروڑوں روپے بٹور لیے۔ حیات آباد کے رہائشیوں نے عدالت سے رجوع کیا اور کام رکوا دیا مگر نہ کوئی انکوائری ہوئی اور نہ ہی کسی پر مقدمہ چلا۔

باڑہ کی آمدنی سے گورنر اور وفاقی اداروں کو محروم کرنے کیلئے بھی اسلامی حکومت نے اہم کارنامہ سرانجام دیا اور لشکر اسلام کی تشکیل میں حاجی منگل باغ کی حمایت کی جس کا مسلک مولانا فضل الرحمٰن کا ہم مکتب تھا۔ مولانا حضرات کا یہ منصوبہ ناکام ہوا چونکہ اس کی کامیابی میں عسکری ادارے رکاوٹ بن گئے۔ لشکر اسلام نے فضل الرحمٰن کی مدد سے اہل سنت سے تعلق رکھنے والے لشکر انصار کو تو شکست دے دی مگر سرحد کی اسلامی حکومت کا آلہ کار بننے سے انکار کردیا جس سے مولانا گروپ باڑہ سے ہونے والی کروڑوں کی آمدنی سے اکیلے فیض یاب نہ ہوسکا۔ لشکر اسلام نے باڑہ اور تحصیل جمرود میں اسلامی نظام کا نفاذ کرکے بڑی تعداد میں اغوا کاروں، جسم فروشی اور منشیات کا کاروبار کرنے والوں کے علاوہ جادوٹونے کرنے والے عاملوں کا صفایا کردیا۔

حاجی منگل باغ سپاہ خیل آفریدی نے باڑہ میں اسلامی عدالت قائم کی اور پشاور تک لوگوں کو غروب آفتاب سے پہلے پہلے انصاف مہیا کرنا شروع کردیا تو پشاور میں عدالتیں وانتظامی نظم کی چولیں ہلنے لگیں۔ جمعیت علماء اسلام کی سرحدی حکومت جو خود اسلامی نظام کا پروپیگنڈہ کرتی تھکتی نہ تھی منگل باغ سے خائف ہوکر اینٹی منگل قوتوں کی اتحادی بن گئی۔

سرحد حکومت جو کبھی کبھی جمرود کے ملک تاج خاندان کے خلاف چھوٹی موٹی کاروائیاں کرتی تھی، کا بھانڈہ اس وقت پھوٹا جب لشکر اسلام نے ملک تاج خاندان کا گھیراؤ کیا چونکہ خود حکومت نے ان پر اغوا برائے تاوان، منشیات فروشی اور سمگلنگ کا الزام عائد کر رکھا تھا۔ یہی حکومت جو چند روز پہلے ملک تاج کے پوتوں اور خاندان کے دیگر مردوں کو ڈھونڈتی پھرتی تھی اور حیات آباد میں واقع ان کی بڑی بڑی حویلیوں پر پولیس ریڈ کرچکی تھی اچانک ان کی ہمدرد بن گئی اور لشکر اسلام کے خلاف جنگ میں ملک تاج خاندان کے بچاؤ کیلئے میدان میں کود پڑی۔

پولیس اور فرنٹیئر کور کے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور دیگر جدید اسلحے سے لیس ہزاروں جوان جمرود پہنچے اور حاجی منگل باغ کے لشکر سے ملک تاج خاندان کو نجات دلائی۔

تمہیں پتہ ہے کہ ملک تاج خاندان کے مرد اس آپریشن کے دوران کہاں تھے؟ نینا نے سوال کیا۔

پشاور میں یا قریب ہی افغانستان چلے گئے ہونگے۔ میں نے کہا۔

نہیں۔ نینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

منشیات فروشوں، بڑے سمگلروں، لینڈ مافیا کے سرغنوں، کمیشن مافیا کے سرپرستوں اور دیگر جرائم پیشہ اور عوام کش وطن دشمنوں کے تعلقات اعلیٰ عدلیہ کے ججوں، بڑے بڑے گدی نشین پیروں، سیاسی جماعتوں اور گروپوں کے سربراہوں اور سرپرستوں سے لیکر حکومت وقت کے سربراہوں اور اعلیٰ انتظامی افسروں سے یکساں ہوتے ہیں۔ افغان سمگلر ہوں یا پاکستانی سب کی رسائی اسلام آباد میں وزارت داخلہ تک ہوتی ہے جہاں سے پولیس، کسٹم، امیگریشن، نادرا، فرنٹیر کنسٹبلری، فرنٹیر کور، رینجر اور دوسرے اداروں کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔

کبھی وزارت داخلہ میں جاؤ تو تمہیں ہر دفتر کے باہر ایک افغان یا پھر قبائلی نظر آئے گا جبکہ کسی پاکستانی کو تھانے اور پٹوار خانے تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

ملک تاج اور ملک ظاہر شاہ کے بیٹوں اور پوتوں کے بھی ایسے ہی کاروبار ہیں۔ سرحد حکومت کو جب ان لوگوں سے حسب ضرورت مال نہیں ملتا تو قانون حرکت میں آتا ہے ورنہ قانون سوتا ہے۔

ملک تاج فیملی کا ایک سپوت مسلم لیگ نواز کا پشاور سے قومی اسمبلی کیلئے امیدوار ہوتا ہے جس کی الیکشن مہم میں نواز شریف بھی ملک تاج ہاؤس حیات آباد کا چکر لگاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب پشاور میں قانون جاگتا ہے تو یہ لوگ لاہور تشریف لے جاتے ہیں۔ اسی طرح دیگر پارٹیوں کے امیدواروں اور دوستوں یاروں کے کراچی سے اسلام آباد تک محفوظ اور پرآسائش ٹھکانے ہیں۔

حیات آباد میں افغانوں کی حویلیوں کی اونچی دیواروں کے پیچھے بین الاقوامی راز پوشیدہ ہیں جہاں نہ صرف سمگلروں کی آماجگائیں ہیں بلکہ افغانستان میں برسرپیکار نیٹو فوجیوں کے گیسٹ ہاؤس بھی موجود ہیں جس سے اہلیان پشاور خوب واقف ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پشاور

کے یونیورسٹی ٹاؤن اور حیات آباد میں سینکڑوں گھر بلیک واٹر کمپنی نے کرایہ پر لے رکھے ہیں جہاں نیٹو کے علاوہ بھارتی فوجی بھی ہوا پانی بدلنے آتے ہیں۔

بھارتی فوجی بھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا

کیوں۔ اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے؟ نینا نے کہا۔

اگر سکھ بریگیڈیئر کلین شیو ہو کر مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ٹریننگ کیمپ چلا سکتا ہے تو ہندو فوجی داڑھیاں رکھ کر یا سکھ بن کر پاکستان میں کیوں نہیں رہ سکتے۔

اب بھی نہیں سمجھا۔ میں نے کہا۔

بات سادہ اور آسان ہے۔ کارخانو مارکیٹ میں افغان سکھوں کی سینکڑوں دکانیں ہیں۔ اگر دس ہزار افغان سکھوں میں دو ہزار بھارتی فوجی آ کر بیٹھ جائیں تو کسی کو کیا پتہ۔ ہر روز سینکڑوں افغان بغیر کسی پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور اجازت نامے کے پشاور آتے ہیں۔ ان کی آڑ میں سو دو سو انڈین بھی آ جائیں تو کیا مزائقہ ہے۔ پشاور میں پولیس غریب اور مزدور افغانوں کو پوچھتی ہے۔ بڑی گاڑیوں اور کاروباری لوگوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ افغانوں کی حویلیوں کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ پرندے بھی اوپر سے نہیں اڑتے۔ دو اور چار کنال کے ان محلوں میں کیا ہوتا ہے اور کون رہتا ہے کسی کو خبر نہیں۔ ان گھروں کے تہہ خانوں میں سو سو لوگوں کے بستر بچھے ہیں۔ بعض کے تو کاروبار کا بھی کسی کو پتہ نہیں۔ یہ لوگ رہتے پشاور میں ہیں اور علاج کیلئے بھارت جاتے ہیں۔

افغان، ہندو اور بھارت کا رسیا ہے۔ افغانوں کی سرشت میں پاکستان دشمنی ہے۔ ہر افغان کی خو میں ہے کہ وہ پاکستان کو اور پاکستانی کو نقصان پہنچائے۔ افغانوں کیلئے پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی اور اردو سپیکنگ کی کوئی تفریق نہیں۔ ایک افغانی چاہے وہ مولوی ہو، وزیر ہو، کیمونسٹ یا سوشلسٹ ہو، عالم دین ہو، کسی بھی مسلک یا مکتب سے منسلک ہو، کسی بھی قبیلے یا ذات کا ہو اس کے لیے طورخم سے کراچی، خنجراب سے گوادر اور چمن سے کھوکھرا پار تک ہر شخص پنجابی اور پاکستانی ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان ایک دشمن ملک اور بھارت دوست ہے چاہے پاکستان انہیں آنکھوں پر بٹھائے اور بھارت ذلیل و خوار کرے۔ ایک پختون مشر نے مجھے بتایا کہ اگر ایک پاکستانی اپنے افغان بھائی کو اپنے بچے کا گوشت بھی کھلائے تو وہ چلتے وقت شکوہ ضرور کرے گا کہ تمھارے بچے کا گوشت تو ٹھیک تھا مگر نمک کم تھا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا مثال دوں۔ نینا نے دکھ سے کہا اور پھر بولی۔

نیٹو فوجیوں کے علاوہ چالیس ہزار بھارتی فوجی، پندرہ کونسل خانے اور چونتیس ٹریننگ سنٹر افغانستان میں موجود ہیں۔ ان فوجیوں کے علاوہ ہزاروں، انجینئر ٹیکنیشن اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار افغانستان میں موجود پاکستان کے خلاف گریٹ گیم میں مصروف ہیں جنھیں افغان حکومت اور عوام نے اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔

مگر نینا۔ افغانوں کا شکوہ ہے کہ پرویز مشرف نے امریکہ کا ساتھ کیوں دیا۔

کونسے افغانوں کا؟ نینا نے ترشی سے جواب دیا۔

پرویز مشرف نے امریکہ کا ساتھ طالبان کے خلاف دیا جس کی تائید وحمایت پرویز مشرف کے حامی ومخالفین سیاستدانوں نے کی۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام نے بھی خاموش حمایت کی اور حکومت اور اسمبلیوں میں بیٹھے رہے۔

وہ افغان یا طالبان جن کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جارحیت کی انہیں مشرف اور اس کے حمائتیوں سے تو شکوہ ہے مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ پاکستانی عوام بے قصور اور اپنے حکمرانوں کے سامنے بے بس ہیں۔ وہ افغان جو طالبان حکومت کے خلاف تھے وہ پاکستان کے بھی خلاف ہیں اور بھارت سمیت ہر اس ملک اور حکومت کے حمایتی ہیں جو پاکستان کو نقصان پہنچائے۔ مان لیا کہ پرویز مشرف لاابالی، کھلنڈرا اور بزدل حکمران تھا جسے ابن الوقت دوستوں، کرپٹ بیوروکریسی اور مفاد پرست سیاسی ٹولے کی بھرپور حمایت حاصل تھی مگر خود افغانوں نے بھی تو امریکیوں اور اس کے اتحادیوں سے بھرپور تعاون کیا۔ شمالی اتحاد امریکہ کا صف اول کا اتحادی ہے۔ سوائے گلبدین حکمت یار اور جلاالدین حقانی کے سارے پارٹی لیڈر اور کمانڈر کابل سمیت اپنے اپنے علاقوں میں موجود ہیں اور اتحادی فوج کی موجودگی کو اپنے لئے باعث عافیت سمجھتے ہیں۔

تو پھر امریکیوں اور اس کے اتحادیوں سے لڑ کون رہا ہے؟ میں نے سوال کیا۔

وہی جن کیخلاف امریکہ نے جارحیت کی، جنھیں طالبان کہا جاتا ہے، جن کی حکومت چھینی گئی، جنھوں نے امریکہ کی حکم عدولی کی۔ نینا نے کہا۔

اسکا حل کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

اس کا حل سادہ اور آسان ہے۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

افغان ٹرانزٹ ٹریڈ پر نظر ثانی کی جائے اور کراچی کے بجائے افغان ٹرانزٹ کیلئے گوادر پورٹ کو مختص کیا جائے۔

افغانستان اور بھارت کے درمیان خصوصی تجارت کی آڑ میں ہونے والے کھیل کو ختم کیا جائے چونکہ افغانستان میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں ہوتی جو بھارت کو صرف واہگہ کے راستے ہی درکار ہے۔ یہ خصوصی تجارت ایک بڑی سازش کا حصہ ہے جس کا خمیازہ پاکستان اور پاکستانی عوام کو جلد یا بدیر بھگتنا ہوگا۔ افغان حکومت نے کسی پاکستانی کو شہریت نہیں دی اور نہ ہی وہاں کوئی ایسا قانون موجود ہے لہٰذا شیر پاؤ کے شہریت یافتہ افغانوں کے شناختی کارڈ منسوخ کئے جائیں اور افغانوں کو عزت و احترام کے ساتھ واپس بھجوایا جائے۔ حکومت پاکستان کو اپنے وطن کی عزت اور وقار کا احساس ہونا چاہئے اور جس طرح کا سلوک افغان حکومت اور عوام پاکستانیوں کے ساتھ کرتے ہیں ویسا ہی سلوک افغانوں سے کیا جائے۔ وہ افغان جو کاروباری سلسلے میں پاکستان آئیں انہیں سفارتخانہ ورک پرمٹ جاری کرے۔ افغانستان کیلئے پشاور کے بجائے کوئٹہ سے مال بھجوایا جائے تاکہ سمگلنگ کی رفتار کم ہو سکے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

گوادر سے کوئٹہ تک اور پھر کوئٹہ سے چمن تک آبادی کم اور علاقہ دشوار گزار ہے۔ کوئٹہ تک بلوچ آبادی کا علاقہ ہے اور پھر چمن تک پختون پٹی ہے جہاں ریلوے کا نظام بھی موجود ہے اور آگے علاقہ ہموار ہونے کی وجہ سے قندھار تک ریلوے لائن بچھائی جا سکتی ہے۔ کوئٹہ زاہدان ریلوے لنک کو استعمال کرتے ہوئے ہلمند کا راستہ بھی کھولا جا سکتا ہے۔ براستہ پشاور جو سامان جاتا ہے وہ کراچی سے پشاور تک جگہ جگہ غائب کیا جاتا ہے۔ بھاولپور اور رحیم یار خان میں جو سامان ریل گاڑیوں اور کنٹینروں سے ادھر ادھر کیا جاتا ہے وہ بھارت سمگل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک پوائنٹ پتوکی ہے جہاں اترنے والا سامان بھی انڈین پنجاب کی طرف نکل جاتا ہے۔

پشاور پہنچنے والا سامان کسٹم، پولیس اور پولیٹکل انتظامیہ کی ملی بھگت سے تحصیل باڑہ اور جمرود میں غائب ہو جاتا ہے جہاں وسیع علاقوں میں آبادیوں کے بیچوں بیچ قلعہ نما گودام موجود ہیں جن میں سالم ٹرین غائب کی جا سکتی ہے۔ وہ سامان جو محض دکھلاوے کیلئے افغانستان کی سرحد عبور کرتا ہے وہ بھی واپس لنڈی کوتل آ جاتا ہے اور پھر یہ سامان بغیر کسی کسٹم اور ٹیکس کے پاکستان کی

منڈیوں اور مارکیٹوں میں بیچ کر ہر سال ملک کو اربوں ڈالر کا نقصان پہنچایا جاتا ہے۔اگر یہ سامان چمن کے راستے جائے گا تو پھر وہی مال لایا جائے گا جس کی افغانستان میں ضرورت ہے اور ایسا سامان بلکل محدود ہے۔افغانستان میں جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پاکستان ہی میں پیدا ہوتی ہیں۔اسلئے سمگلنگ کی لعنت کم ہی نہیں ختم ہوجائے گی جس سے ملک میں خوشحالی آئے گی۔

نینا کیا یہ بات پشاور کے بلور، مردان کے ہوتی، چارسدہ کے شیر پاؤ ور دوسرے پنجابی، سندھی، پختون اور ایم کیوایم والے بھی سوچتے ہونگے۔

نہیں۔نینا نے یکدم جواب دیا۔

میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ یہ سب اس مال کے حصہ دار ہوتے ہیں اور جن افغانوں کے سپرد ان لوگوں نے سارا ملک کیا ہوا ہے اس کی واحد وجہ ذاتی مفاد، خودغرضی، لالچ اور بھارت نوازی ہے جسکا ضامن امریکہ ہے۔

اس کہانی میں کشمیر، سردار عبدالقیوم اور دوسرے کہاں آتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

میں دوخطوں کے عوام کی تقدیر کی بات کر رہی تھی۔نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ جو قائدین کا روپ دھارے ہوئے ہیں حقیقت میں وہی ان خطوں کے عوام کے دشمن ہیں۔افغانستان کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ وہاں ہر کوئی اپنی قسمت آزمائی کرتا ہے مگر افغان عوام اور ان کے لیڈر مقدر سے زیادہ مفاد کے قائل ہیں۔وہ کسی مستقبل کی منصوبہ بندی پر شاید یقین نہیں رکھتے۔ امان اللہ خان نے مستقبل کی منصوبہ بندی کی تو مولویوں اور قبائلی سرداروں نے اسکا مستقبل تاریک کر دیا۔سردار داؤد نے عوام کی فلاح و بہبود کا سوچا اور پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ملاں عمر نے پاکستان پر بھروسہ کیا تو پرویز مشرف کی بزدلانہ حرکت سے اس کے اعتماد کو خاکستر کر دیا گیا۔

کابل کی روایت ہے کہ جو لیڈر پاکستان دشمنی اور بھارت دوستی کا چوغہ پہن لیتا ہے اس کا قتدار قائم رہتا ہے۔

ایسا ہی حال کشمیریوں کا ہے۔سرینگر اور مظفرآباد میں ایسے خاندانوں کے درمیان خاموش مفاہمت ہے جن کا دلی اور اسلام آباد کے حکمرانوں کی خوشنودی اور اطاعت گزاری پر گزارہ چلتا ہے۔کشمیر ایک ایسا المیہ ہے جس کے کرداروں کی افغان ڈرامے سے مماثلت ہے۔کشمیر الیے

کے سٹیج پر سب سے پرانے کرداروں میں سردار عبدالقیوم اور فاروق عبداللہ سرفہرست ہیں۔ فاروق عبداللہ بھارت نوازی اور کشمیر فروشی کے کاروبار میں اپنے باپ کا جانشین ہے اور اب اسکا بیٹا دکان سجائے بیٹھا ہے۔ سردار عبدالقیوم نے مجاہد اوّل کا تمغہ خود ہی اپنے سینے پر سجایا اور پاکستان میں پیدا ہونے والے سیاسی بحرانوں اور ملٹری ڈکٹیٹروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نام نہاد تحریک آزادی کے علمبردار کا روپ دھار لیا۔ اس علم کے سائے میں سردار نے اپنے گھرانے کی آبیاری کی اور اپنے جیسا ایک سپوت بھی پیدا کر لیا جو مکر و فریب کا ماہر اور چانکیہ کوتیلہ کا سچا پیروکار ہے۔ سردار کے سپوت نے سیاست گری کے ایسے ایسے گر سیکھ لئے ہیں جنکے استعمال سے شاید چانکیہ اور میکاولی بھی واقف نہیں تھے۔ اقتدار اور مال کے حصول کیلئے آزاد کشمیر کا یہ سیاستدان کسی کے بھی ہاتھ بک سکتا ہے۔ شوکت عزیز اور پرویز مشرف کی خوشنودی کا معاملہ ہو تو اسمبلی میں کھڑے ہو کر بھٹو کو گالیاں دیتا ہے اور زرداری کی چاپلوسی کا معاملہ ہو مسلم کانفرنس نامی جماعت کی غیرت وحمیت کا سودا کر لیتا ہے۔ نواز شریف سے کام پڑ جائے یا پرویز الٰہی کی خوشامد درکار ہو تو ماڈل ٹاؤن اور ظہور الٰہی روڈ پر ڈیرے ڈال لیتا ہے۔ اگر زرداری جیسا لیڈر کشمیر کے ایک ٹکڑے کو صوبہ بنا کر الگ کر سکتا ہے تو بھٹو کے مقابلے میں کون ٹھہرتا۔

نینا تمھارا کہنا ہے کہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے بجائے روز اوّل سے ہی مسئلہ بنانے میں جتنا کردار ماؤنٹ بیٹن کا ہے اتنا ہی سر شاہنواز بھٹو کا بھی ہے جنکے اعلان جونا گڑھ نے مہاراجہ کشمیر کو بھی ترغیب دی کہ وہ عوامی منشاء و مرضی کے خلاف کشمیر کا الحاق بھارت سے کر دے۔ تم یہ بھی کہتی ہو کہ بھٹو مرحوم نے شملہ معاہدے کی لفاظی میں مسئلہ کشمیر حل کر لیا تھا جو کہ ان کا دوسرا ادھر تم ادھر ہم تھا۔ مقبوضہ کشمیر و جموں بھارت کیلئے جس میں کارگل وزنسکار بھی شامل تھا اور ڈھائی اضلاع کی حکومت جسے آزاد کشمیر کہا جاتا ہے کے ساتھ گلگت و بلتستان پاکستان کیلئے۔ شملہ معاہدے ہی کی رو سے سیز فائر لائن کو لائن آف کنٹرول میں بدل دیا گیا اور مسئلہ کشمیر کو دو ملکوں کے درمیان تنازعہ قرار دیکر اسے باہمی مشاورت سے حل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اگر سر شاہنواز بھٹو نواب آف جونا گڑھ سے الحاق پاکستان کا بے سروپا ڈرامہ نہ کراتے تو مہاراجہ کشمیر بھی اصول تقسیم کا پابند رہتا اور الحاق بھارت کا ظلم نہ کرتا۔

اس میں کچھ ایسے پوائنٹ ہیں جنھیں سمجھنا ضروری ہے۔۔۔ نینا نے میری بات کاٹتے

ہوئے کہا۔

جونا گڑھ کے بعد مسلم لیگیوں نے بھی لالچ اور ہوس کی تاریخ لکھی۔ دولتانہ اور ممدوٹ نے بھی کشمیر کی غلامی میں اہم کردار ادا کیا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

تقسیم کے طریقہ کار میں مسلم یا ہندو اضلاع کی بات ہوئی۔ پھر تحصیلوں تک بات پہنچی اور آخر کار پٹوار خانوں اور تھانوں کے حساب سے ملک تقسیم ہوا۔ تقسیم کے فارمولے کئی بار بدلنے اور نت نئے گُر تلنے والے نہ ہندو اور سکھ تھے اور نہ ہی انگریز بلکہ پنجاب کے دولتانے اور ممدوٹ تھے۔ یہ لوگ اپنی جاگیریں اور جائیدادیں بچانے کے چکر میں تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ رقبہ پاکستان میں آئے اور ان کی زمینیں اور مزارعے محفوظ رہیں۔ تقسیم کے اصولوں کے ردوبدل سے ان لوگوں کو کم اور بھارت کو زیادہ فائدہ ہوا اور گورداسپور کا علاقہ بھارت میں شامل ہونے سے بھارت کو کشمیر میں مداخلت کا زمینی راستہ میسر آ گیا۔

اس کا ذکر میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا۔ میں نے پوچھا۔

اسکا ذکر کون کرے گا۔ نینا نے جواباً کہا۔

کسی کتاب میں واقعی سر شاہنواز بھٹو کے کارنامے کا ذکر نہیں چونکہ سچائی اور حقیقت بیان کرنے کیلئے جرأت اور سچائی کا علم ہونا ضروری ہے۔ سر شاہنواز بھٹو اور جواہر لعل نہرو گہرے دوست بھی تھے۔ نہرو تو نہیں لکھے گا کہ ان کے دوست نے انہیں کشمیر ہڑپ کرنے کا جواز فراہم کیا اور نہ ہی کوئی پاکستانی ایسا لکھنے کی جرأت کریگا۔ پاکستانی اہل قلم کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے کہ وہ مفت میں کچھ نہیں لکھتے۔ اگر تم نے اس المیے کے متعلق کچھ پڑھنا ہے تو جی ایم میر کی کتاب ''کشمیر تقسیم کا ادھورا ایجنڈا ہے'' پڑھو۔

سردار عبدالقیوم اور نواز شریف کے درمیان کشمیر کے متعلق کوئی انڈرسٹینڈنگ ہو رہی تھی اور پاکستان میں میڈیا تقسیم کشمیر اور تکمیل پاکستان کی باتیں کر کے کسی نئی سازش کی راہ ہموار کر رہا تھا جسے بھانپتے ہوئے جناب جی ایم میر نے اپنی تحریر کے ذریعے لوگوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں پتہ کہ جی ایم میر کے بیان کردہ تاریخی حقائق کا کچھ اثر ہوا یا پھر مفاد پرست ہواؤں اور موسموں کا رخ بدل گیا مگر یہ پراپیگنڈہ اچانک بند ہو گیا۔

ہوسکتا ہے نواز شریف نے اپنی کشمیر پالیسی میں کوئی تبدیلی کی ہو۔ میں نے پوچھا۔

نینا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا! نواز شریف کو صرف صنعتی پالیسی بدلنے اور بنانے کا علم ہے باقی پالیسیاں بیوروکریٹ اور سیاسی بروکر بیرونی ایجنڈے کے تحت بناتے ہیں۔

آزاد خارجہ پالیسی سمیت دیگر پالیسیاں اور منصوبے جس سے ملک میں خوشحالی آئے صرف بھٹو نے ترتیب دیں اور وہ بیرونی طاقتوں کے نشانے پر آ گیا۔ بھٹو چین، روس، کیوبا، لیبیا اور یوگوسلاویہ کی طرح ایک ایسا پاکستان چاہتا تھا جس کی ترقی و خوشحالی اس ہی کی مرہون منت ہو اور وہ بغیر کسی اپوزیشن اور تنقید کے حکمرانی کرے۔ بھٹو عوام سے داد چاہتا تھا، قربانی مانگتا تھا اور انہیں ایک ایسی ڈائریکشن دینا چاہتا تھا جس میں عوام اور بھٹو کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہ ہو۔

پھر معاملہ الٹ کیسے گیا؟ میں نے پوچھا۔

بنیاد کمزور تھی۔ نظریے اور حقیقت کے درمیان ہم آہنگی نہ تھی، ون مین شو تھا جو فلاپ ہو جائے تو صرف شو مین ہی زوال پذیر ہوتا ہے۔ جلد بازی اور بے لچک رجحان تھا۔ انقلابی، اصلاحی سوچ کی تکمیل کیلئے کارگر اور نظم وضبط سے آراستہ تنظیم نہ تھی۔

میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ بھٹو صاحب بھول گئے کہ یہ مملکت خداداد پاکستان ہے اس کے عوام اور خواص کا ایک مزاج ہے جو نہ چین سے ملتا ہے نہ ہی روس سے۔ لینن، سٹالن، کاسترو، قذافی اور ٹیٹو عام لوگ تھے۔ ٹیٹو کے متعلق تو کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ کون ہے۔ مرد ہے یا عورت، کوئی آدمی ہے یا تنظیم، کسی خفیہ ادارے کا نام ہے یا محض ایک فرضی نام۔ ٹیٹو کا اصل نام جوزف تھا۔ ایک دن وہ اکیلا بیٹھا پریشانی میں ٹی ٹو ٹی ٹو کہہ رہا تھا کہ اسکے گروپ والوں نے اسے اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

تمھیں کس نے بتایا؟ میں نے پوچھا۔

میں نے کرنل فٹز رائے میکلین کی خودنوشت میں پڑھا ہے۔

کرنل فٹز رائے انگریز ملٹری فیملی سے تھا اس کا باپ بھی فوج میں کرنل تھا۔ فٹز رائے ایک دلچسپ کریکٹر ہے جو مقابلے کا امتحان پاس کر کے برٹش فارن سروس میں پوسٹ ہوتا ہے۔ پیرس اور ماسکو میں تعیناتی کے دوران اس نے فرانس میں ہونے والی طوائف الملوکی اور روس میں کیمونسٹ جبر کا مشاہدہ کیا۔ ماسکو میں رہتے ہوئے اس نے کے جی بی او دیگر سرکاری خفیہ اداروں کی کاروائیاں بھی دیکھیں کہ لینن اور سٹالن نے کس طرح اپنے دوستوں، پارٹی

عہدیداروں اور ورکروں پر جرمنی اور برطانوی جاسوس ہونے کا الزام لگا کر انہیں ڈیتھ سکواڈ کے سامنے کھڑا کیا۔فٹز ررائے لکھتا ہے کہ لینن اور سٹالن محبت، عزت اور تعظیم کے نہیں بلکہ خوف اور دہشت کی علامات تھے۔ان دوناموں اوران کے قریب ترین لوگوں سے سارا روس خوفزدہ تھا۔کرنل رائے نے چھٹیوں کے دوران بھیس بدل کر روس کے ان علاقوں اور ریاستوں کا دورہ بھی کیا جہاں غیر ملکیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔وہ روس سے چین جانے کی کوشش میں پکڑا گیا اور واپس ماسکو آ گیا۔اگلے سال وہ پھر مہم پر نکلا اور بذریعہ ریل ثمرقند اور بخارا سے ہوتا ہوا آموں دریا پار کر کے مزار شریف اور پھر کابل میں چند روز قیام کے بعد پشاور جا پہنچا اور بذریعہ فرنٹیر میل دھلی تک گیا۔واپسی پر وہ براستہ ایران آزر بائیجان گیا اور مختلف علاقوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے ماسکو پہنچ گیا۔

ماسکو کے سفارتی مشن سے واپسی پر کرنل رائے نے فوج میں جانے کا فیصلہ کیا تو سارا فارن آفس حیران رہ گیا۔فارن سیکریٹری نے اس کا استعفیٰ نامنظور کرتے ہوئے اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کی اور وزارت خارجہ میں رہ کر ملک کی خدمت کرنے کو کہا۔

کرنل رائے کی کہانی اس وقت ایک دلچسپ موڑ لیتی ہے جب وہ اپنی درخواست میں لکھتا ہے۔ چونکہ وہ سیاست میں حصہ لینا چاہتا ہے اس لئے اسے نوکری سے برخواست کیا جائے۔ برٹش قانون کے تحت اگر کوئی شخص سیاست میں حصہ لینا چاہے تو اسے نوکری سے برخواست کیا جا سکتا ہے۔

کرنل رائے کی یہ چال کامیاب ہوتی ہے اور وہ فارن آفس سے سیدھا بھرتی دفتر جا پہنچتا ہے اور بحیثیت ریکروٹ فوج میں بھرتی ہوجاتا ہے۔ابتدائی تربیت کے بعد اسکی تعنیاتی ایک سپاہی کی حیثیت سے اسی یونٹ میں ہوتی ہے جسکا کمانڈنگ آفیسر اس کا باپ رہا تھا۔

رائے جلد ہی کارپورل بن جاتا ہے اور ساتھ ہی اسے خبر ملتی ہے کہ فارن آفس میں کسی نے شکایت کردی ہے کہ فٹز ررائے سیاست میں نہیں بلکہ فوج میں ہے۔فارن سیکریٹری جو پہلے ہی اس کے استعفےٰ کی وجہ سے ناراض تھا چاہتا تو اس کا کورٹ مارشل کروا کر جیل بھیج سکتا تھا یا پھر اسے واپس فارن آفس جانا پڑتا۔خبر ملتے ہی وہ دو ماہ کی رخصت پر چلا گیا اور لندن کے قرب و جوار یں دارالعوام کی ایک خالی نشست پر ہونے والے الیکشن کیلئے لیبر پارٹی کے امیدوار کیلئے درخواست دی۔انٹرویو ہوا اور لیبر پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ کر کامیاب ہوا ہی تھا کہ حلف

برداری سے پہلے ہی یونٹ میں فوری واپسی کا خط بھی آ گیا۔ کارپورل فٹز ررائے میکلین نے فوج سے چھٹی لیکر الیکشن لڑا اور پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے حلف برداری سے پہلے پلٹن میں طلب کر کے اسے ایمرجنسی کمیشن دیکر چند روز بعد ہی افریقہ کور کے ہیڈ کوارٹر قاہرہ بھجوا دیا گیا۔

کرنل فٹز ررائے میکلین نے بحیثیت کیپٹن اور میجر بن غازی اور دوسرے صحرائی معرکوں میں حصہ لیا جہاں کبھی کامیاب اور زیادہ ناکام مگر نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ واپس لوٹا۔ اسے خفیہ مشن پر ایران بھجوایا گیا جہاں اس نے ایران کے جرنل زیدی کو اغواء کر کے ایرانیوں اور روسیوں کے درمیان تعاون کے ایک رکن اور رابطے کو منقطع کر دیا۔

کرنل رائے نے برٹش سپیشل سروسز میں شمولیت اختیار کی اور وزیر اعظم چرچل کے ذاتی منصوبے کی تکمیل کیلئے یوگوسلاویہ میں جرمن فوج کی موجودگی میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مارشل ٹیٹو کے گوریلہ دستوں کیلئے راشن، ایمونیشن ،ہتھیار اور وائرلیس سیٹ لیکر رات کے اندھیرے میں جرمن فوج کے عقب میں پیراشوٹ کے ذریعے اترا۔

کرنل رائے برطانوی حکومت اور فوج کے نمائندے کی حیثیت سے مارشل ٹیٹو کے ساتھ رابطہ کرنے والا پہلا شخص تھا جس نے ٹیٹو کی قائدانہ صلاحیتوں، منصوبہ بندی کی حفاظت اور دشمن کے خلاف کارگر کاروائیوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ کرنل رائے اسوقت حیرت زدہ ہو گیا جب ٹیٹو چند روز کیلئے غائب ہو گیا اور پھر روسی فوج کے ہمراہ اچانک نمودار ہوا۔ فٹز ررائے ایک عرصہ تک ٹیٹو کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتا رہا مگر اسے ٹیٹو اور روسیوں کے درمیان رابطوں کا بلکل علم نہ ہوا۔

ٹیٹو اپنے ملک اور عوام کی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا اور اسے احساس تھا کہ جن لوگوں نے اسے اپنا لیڈر اور قائد چنا ہے ان کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اس نے اپنے برٹش رابطوں کو روسیوں سے اور روسیوں کے ساتھ رابطوں کو کمال ہوشیاری اور دانشمندی سے خفیہ رکھا۔ ٹیٹو اپنے ملک اور عوام سے جڑا ہوا تھا جنھوں نے جدوجہد کے ابتداً جرمن فوجوں سے اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان چھین کر کیا۔ ٹیٹو نے اپنے ساتھیوں پر سخت ڈسپلن لاگو کیا اور اپنے پرائے کی تمیز کیے بغیر سب کیلئے یکساں نظام رائج کر کے عوام کے دل جیت لئے۔ جب عوام کو یقین ہو جائے کہ ان کا قائد انہیں میں سے ہے۔ وہ انھیں کی طرح رہتا، کھاتا پیتا اور جیتا ہے۔ اسکی تکالیف وہی ہیں جو عام آدمی کی ہیں۔ وہ آسائشوں اور

عیاشیوں کا عادی نہیں ۔ وہ کسی بیرونی طاقت اور حکومت کا ایجنٹ نہیں۔ اس کی جائیدادیں اور بنک بیلنس کسی دوسرے ملک میں نہیں تو وہ اس کیلئے کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جو قومیں عزت کی زندگی جینا چاہتی ہیں اور آزادی کی اہمیت سمجھتی ہیں انھیں قدرت کی طرف سے قائد بھی مل جاتے ہیں۔

کرنل رائے لکھتا ہے کہ ایک بار اس نے ٹیٹو سے اسکے نام کے معنی پوچھے تو ٹیٹو نے ہنس کر بتایا کہ ٹیٹو کے کچھ معنی نہیں اور نہ ہی میرا نام ٹیٹو ہے۔ ایک دن بیٹھا ٹی ٹو ٹی ٹو گنگنا رہا تھا جو ویسے ہی میری زبان پر آ گیا کہ میرے ساتھیوں نے تجویز کیا کہ میرا خفیہ نام ٹیٹو ہوگا تا کہ جرمن خفیہ ایجنسیوں اور ان کے حمائتی اٹالین اور دیگر جاسوسوں کو دھوکہ دیا جاسکے کہ یوگوسلاویہ میں جدوجہد آزادی کا اصل قائد کون ہے۔

اسی دور میں سٹنک (cetnik) نامی تنظیم بھی میدان میں تھی جو اپنے مفاد کی خاطر پینترے بدلتی رہتی تھی۔ ایسی تنظیمیں دشمن ممالک اور مخالف قوتوں کی چال کا حصہ ہوتی ہیں تا کہ اصل قوت اور قیادت کو دیگر مسائل میں الجھا کر ان کے مشن اور مقصد کو ناکام کیا جائے۔ اگر قوم کی بدقسمتی سے پرویز مشرف جیسے کھلنڈرے کے ہاتھوں کسی قوم کی قیادت ہو تو پھر اس کا حال وہی ہوتا ہے جو آج کل پاکستان کا ہے۔ پرویز مشرف اور پاکستانی قیادت کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امریکہ، بھارت اور اتحادیوں نے پاکستانی اور پنجابی طالبان کہ کئی یونٹ تیار کر لیے جو آج پاکستانی فوج اور قوم کے خلاف کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ لڑ رہے ہیں۔

تم بھٹو کی بات کر رہی تھی۔ میں نے نینا کو لائن پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس کر بولی۔ تمھیں خطرہ ہے کہ میں ٹیٹو سے مشرف کی طرف چل نکلونگی۔

تمھارا کچھ پتہ نہیں۔ تمہارے دماغ میں سینکڑوں موضوع ابل رہے ہیں۔ اور تم خود مٹی کی محبت میں سرشار آتش فشاں بن رہی ہو۔ میں نے کہا۔

ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ بھٹو نے تیسری دنیا کا ایک ملک اپنی حکمرانی کیلئے چنا جسکا سائیز وہ پہلے ہی کم کر چکا تھا۔ بھٹو نے گنگا طیارے کی تباہی سے لیکر دیگر مراحل طے کئے اور پھر اسلامی کانفرنس کا شاندار انعقاد کر کے بنگلہ دیش کو بھی تسلیم کر لیا۔ بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ طے پایا اور مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ سے اٹھا کر پنچائیت میں لے آیا جسے بھٹو نے مستقبل قریب میں خود ہی حل کرنا تھا۔ مشکل معاملہ مقبول بٹ کا تھا جسے مکھن سے بال کی طرح نکال دیا گیا۔ سردار قیوم

سے سودے بازی کا معاملہ تھا۔ بھٹو کو پتہ تھا کہ کس کی کیا قیمت ہے اور کب معاملہ طے کرنا ہے۔
مگر سردار عبدالقیوم تو خود کو ایک روحانی شخصیت اور ولیّ اللہ کہتے ہیں۔ ولیّ یعنی اللہ کا سچا دوست تو معاملات طے نہیں کرتا اور نہ ہی اسے کوئی خرید سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔
ہاں اگر ولیّ اللہ ہو تو۔ سردار عبدالقیوم نے آزاد کشمیر اسمبلی میں علماء و مشائخ کی ایک نشت مخصوص کر کے روحانیت اور روحانی علوم کے نام پر نہ صرف عوام کو دھوکہ دیا بلکہ الٰہی احکامات کی خلاف ورزی بھی کی۔ جس طرح مجاہد اوّل بن کر سردار نے آزاد کشمیر کی سیاست اور کشمیر کی آزادی کیلئے چلنے والی کاغذی تحریک جیسے نفع بخش کاروبار میں اپنا مستقل حصہ ڈال لیا ویسے ہی مہاجرین کی سیٹوں میں حسب ضرورت اضافہ کر کے آزاد کشمیر کی نام نہاد جمہوریت اور حکومت پاکستانی حکمران طبقے کو سونپ دی۔
خود اپنی سیٹ قائم رکھنے کیلئے علماء و مشائخ کیلئے ایک نشت مخصوص کروالی تا کہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جائے۔ حیرت کی بات کہ ایک عالم دین اور شیخ کا چناؤ کرپٹ، شرابی اور مانے ہوئے زانی اور بدکار کرتے ہیں۔ ایسے کچھ کرداروں کا ذکر اخباروں ہی میں نہیں بلکہ کتابوں کی زینت بنا اور ہمیشہ کیلئے تاریخ کا حصہ بن گیا۔
جب سردار عبدالقیوم خود اس سیٹ پر براجمان نہیں ہوتے تو یہ سیٹ اپنی پارٹی کے کسی اور ولیّ کو دیکر سیاسی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ میں نے ایک ایسے ہی ولیّ کو جو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ حکومتی وزیر بھی رہا ہے ایک کرپٹ جج کی منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر تعریف کرتے سنا ہے۔ موصوف ہر جمعہ کو اس جج کی تعرف و توصیف میں لیکچر دیتے اور جج کے حمائیتوں اور برادری والوں سے داد وصول کرتے۔
سردار قیوم اور ان کے صاحبزادے کا یہ پسندیدہ جج جس نے کرپشن اور بے انصافی کے ریکارڈ توڑے اور اپنے فیصلوں سے اپنی برادری اور پارٹی کو اربوں کے فائدے پہنچائے کی تعریف کیلئے سرداروں نے علماء و مشائخ کی سیٹ پر بیٹھنے والے وزیر کو مقرر کر دیا تا کہ ہر جمعہ کو منبر پر بیٹھ کر ایک کرپٹ جج کا قصیدہ پڑے۔ میں تو کہتی ہوں کہ مسئلہ کشمیر نہ سیاسی مسئلہ ہے اور نہ ہی سماجی، اخلاقی، علاقائی یا جغرافیائی۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک ایسی قوم کو سزا ہے جو مسلمان تو ہیں مگر اللہ کے احکامات کو یکسر بھلا کر مادہ پرستی کا طوق گلے میں ڈالے آزادی کے طلب گار ہیں۔ مسئلہ کشمیر ایک روحانی مسئلہ ہے۔ کشمیر اولیاء کی سرزمین ہے جس پر ہندو تو حکمران ہو سکتا

ہے مگر منافق نہیں۔ جو کچھ آزاد کشمیر میں ہو رہا ہے اور جس طرح کے حکمران اس خطہ زمین کے بسنے والوں کو پسند ہیں وہ آزادی کے نہیں بلکہ عیاشی کے علمبردار ہیں۔

ولّی، شیخ یا عالم دین کبھی جاہ طلب نہیں ہوتا۔ میں نے بہت سے روایتی پیروں، گدی نشینوں اور دین کا پرچار کر کے مال کمانے والوں سے سنا ہے کہ اصحاب رسول ﷺ بھی تو حکمران تھے اور ان سے بڑھ کر کون صوفی اور ولّی تھا۔ مگر یہ لوگ اپنی عیاشیوں اور دنیاوی لالچ کو سچائی کا غلاف پہناتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ اصحاب رسول ﷺ کی زندگیاں کیا تھیں۔ میں نے تصوف کا جتنا مطالعہ کیا ہے اس میں حضرت نورالدین اویسی کشمیریؒ کی تصانیف نورالعرفان، حقیقت تصوف، منازل فقر اور راہ حقیقت کے علاوہ حضرت علی ہجویری کی مشہور زمانہ تصنیف کشف المحجوب کو سب سے زیادہ موزوں اور کسی بناوٹ سے پاک پایا۔ ولّی، شیخ اور عالم حق کی زبان اور قلم سے کبھی دنیاوی طلب اور ذاتی غرض کا اظہار نہیں ہوتا۔ ولّی کی زبان سے نکلا ہر لفظ اور قلم سے کشیدہ ہر نقطہ قرآن، حدیث نبوی ﷺ اور سنت رسول ﷺ سے مطابقت رکھتا ہے۔ علماء حق، اوّلیائے کاملین کے اقوال کی طرف دیکھیں تو علماء و مشائخ کی جو تشریح مجاہد اوّل اور ان کا سپوت کر رہے ہیں اسکا تصوف سے کوئی رشتہ نہیں جڑتا۔ حضرت جنید بغدادی کا فرمان ہے کہ تصوف کی اصل بندے کی صفات کا فنا چاہتی ہے۔

میں نے ایک دوسری جگہ پڑھا ہے کہ صوفی اپنی پہلی منزل میں فنافی الشیخ ہوتا ہے۔ بعض صوفیاء پہلی منزل فنافی الذات کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ اپنی ذات میں دنیا کی تمام لذتوں کو فنا کر کے صرف احکامات الٰہی میں مشغول ہوتا ہے۔ یہ منزل انتہائی نازک اور حساس ہوتی ہے۔ شیطانی قوتیں چاروں اطراف سے حملہ آور ہوتی ہیں اور ناسوتی کمالات کا اظہار پہاڑوں جیسی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

فقرائ، علماء اور صوفیا کے مطابق عالم ناسوت کی اکتالیس منازل ہیں جبکہ عالم ناسوت کی پہلی منزل تک رسائی پانے والا شخص صاحب کمال ہوسکتا ہے مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ ایسے کمالات کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کوئی بھی شخص، مرد و زن تزکیہ نفس اور مجاہدہ قلبی سے یہ مقام حاصل کرسکتا ہے۔ ہندو یوگی، بدھ بھکشو ہوں یا لا مذہب دھریے ہر شخص اپنی انسانی جبلت، عقلی و شعوری قوت اور جسمانی اجزاء وقوأ سے ناسوتی کمالات کا حامل ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں جو ان کے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ علمائے حق کے

مشاہدے کے مطابق ایسے عالم اکثر شیطانی قوتوں کے تابع دنیاوی نفع حاصل کرنے یا شہرت پانے کے شوق میں بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

راس پوٹین جیسی شخصیات کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایسے عامل جب تک تزکیہ نفس کا عمل جاری رکھیں، نیند کم کریں، غذا صرف اتنی کھائیں جس سے زندگی برقرار رہے، روزہ یا پھر فاقہ کشی اختیار کریں، عام مخلوق سے میل ملاپ کم رکھیں اور تنہائی میں مراقبہ کریں تو انہیں ایسی قوت حاصل ہو سکتی ہے جس سے وہ بیماروں کو شفایاب کر سکتے ہیں، ان کی دنیاوی جاہ وطلب کی براری کر سکتے ہیں اور دیگر حادثات وآفات کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں مگر کسی امر کو تبدیل کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہی مخلوق کی دعائیں سنتا ہے۔ بعض علماء ایسے بھی ہیں جو اپنے عمل کو شیطانی چالوں کیلئے استعمال کرتے ہیں اور انسانوں کی نفسیات وخواہشات پر حاوی ہو کر انھیں باطل عقیدوں کے تابع کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی عامل اپنے اعضاء کو مضبوط کر کے بدکاری کے عمل سے بھی گزر جاتے ہیں۔

انسان اپنے وجود میں کل بھی ہے اور جوز بھی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گی چونکہ ہر شخص اپنے ظاہری اور مادی علم سے ایسے عمل کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ میں نے اس موضوع کی تفصیل حضرت نورالدین اویسی کشمیریؒ کی تصانیف راہ حقیقت، منازل فقر اور حقیقت تصوف میں پڑھی ہے۔ ہر علم مشاہداتی ہے اور جب انسان تزکیہ نفس ومجاہدہ قلبی کی قوت سے کسی شیخ کامل کی رہنمائی میں علوم باطنیہ کی طرف راغب ہوتا ہے تو شیخ کامل کی رہنمائی میں ہی وہ ناسوتی کمالات، وسوسوں اور شیطانی چالوں کے شکنجے میں پھنسنے سے بچ جاتا ہے۔

فرمان الٰہی ہے ''ہدایت اسی کو ملتی ہے جسے اللہ ہدایت دینا چاہے اور جسے گمراہ کرے اس کو ولیّ ومرشد کی رہنمائی میسر نہیں ہوتی (الکھف)

قرآنی علم کی روشنی میں ولیّ ومرشد کا کام انسانوں کو راہ حق کی طرف رہنمائی کرنا ہے نہ کہ انہیں ویزے دلوانا، شادیاں کروانا، مرادیں پوری کرنا، الیکشن جتانا اور وزارتیں دلوانا ہے مگر کچھ ایسے عمل بھی ہیں جن کا تعلق تو عالم ناسوت سے ہے مگر اس میں انسانوں کے لیے خیر اور بہتری ہے۔ ایسا عمل جب ایک پیغمبر اور ولیّ سے سرزد ہو تو اس میں شیطان کا دخل نہیں ہوتا چونکہ نبی اور ولیّ کے ناسوتی کمالات اور عامل کے کمالات میں فرق ہوتا ہے۔ انبیاء اور اولیا اللہ کا عمل خالصتاً الٰہی قوانین کے تابع ہوتا ہے جبکہ بے دین عامل کا فعل دینی قوائد اور حکم الٰہی سے مبرا سفلی قوتوں

کے تابع ہوتا ہے۔اللہ کا ولیؔ دنیا سے دور بھاگتا ہے چہ جائیکہ وہ اپنے بچوں اور پوتوں کیلئے بھی اسمبلی کی سیٹ پکی کرنے کے چکر میں دین کی آڑ لے اور علماء و مشائخ کے نام پر عوام الناس کو دھوکہ دیکر ایک خاص نشت کا آئینی اور قانونی اہتمام کر لے۔

حضرت علی ہجویریؒ کی تصنیف کشف المحجوب اصحاب رسول ﷺ اور اولیاء کرام کے ایسے اقوال سے مزین ہے جو فقر، فقیر، صوفی اور تصوف کے علم و کردار کے قرآنی اور روحانی پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔فقیر اور صوفی کا عمل وہ نہیں ہوتا جس کی تشریح مجاھد اوّل اور اسمبلی میں مخصوص علماء و مشائخ کی گدی پر بیٹھنے والے سرکاری اولیاء اور علماء کرتے ہیں۔حالیہ دنوں میں آزاد کشمیر میں عدالتی بحران پیدا ہوا تو مجاہد اوّل اور انکا گدی نشین صاحبزادہ ایسے جج کی حمائت میں کلبلا اٹھے جس نے برادری کے چندے سے جنرل انور اور مجاہد اوّل کے جانشین سے ججی خریدی اور پھر مجاہد اوّل کے جانشین اور اپنی برادری کی خدمت گزاری میں ایسا مدہوش ہوا کہ انبیاء کرام کے کردار پر تنقید کرنے لگا۔جج پر مقدمہ بنا تو مجاہد اوّل اور کرپٹ مافیا کے پیر کامل نے اپنے مرید خاص جج کو بچانے کیلئے بستر علالت چھوڑ دیا اور ہر دروازے پر دستک کیلئے اپنے لخت جگر کو دوڑایا کہ کہیں سے جج کی بچت ہو جائے۔مجاہد اوّل اور انکا گدی نشین بھول گئے کہ جن کیلئے اللہ ذلت و رسوائی لکھ دے انہیں ایک برادری تو کیا دنیا بھر کی برادریاں بھی نہیں بچا سکتیں۔مجاہد اوّل اور ان کے سپوت کے کردار کو دیکھا جائے تو ڈوگرہ شاہی اور سکھ راج کچھ بہتر دکھائی دیتے ہیں۔ ڈوگرہ حکمران اولیّت ڈوگروں کو پھر ہندوؤں اور سکھوں کو دیتے تھے اور تیسرے درجے پر مسلمانوں کو رکھتے تھے۔مجاھد اوّل اور ان کا جانشین اولیّت اپنی برادرری کو پھر اپنے اردگرد منڈلانے والوں کو پھر ہر ظالم، غاصب، بدکار، بدمعاش کو، پھر امرأ کو اور آخر میں عوام کو رکھتے ہیں۔

تو پھر ایک ولیؔ کی تعریف کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

ولیؔ کی تعریف ہر دور کے فقراء نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے جس کی تفصیل کشف المحجوب کے اوراق پر نقش ہے۔حضرت علی ہجویریؒ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے لیکر حضرت ابو احمد مظفر بن احمد حمدانؒ تک اَسی سے زیادہ فقراء، علمائے حق اور مشائخ کرامؒ کے احوال، اقوال، مشاہدات، عمل و کردار قلمبند فرمائے ہیں۔ اگر ہم تصوف کی اس بنیادی کتاب کے مندرجات پر نظر ڈالیں تو مجاہد اوّل اور ان کے سپوت کا کردار و عمل اسکے منافی ہے۔فقر کا

مطلب دنیا سے کنارہ کشی ہے۔ فقر کی اعلیٰ ترین مثال حضرت علیؓ کی زندگی اور امارت کی عمدہ مثال حضرت عثمان غنیؓ ہیں۔ ایک کا گھر مال ومتاع سے پاک تھا تو دوسرے کی دولت کے انبار دین کی راہ میں وقف تھے۔ مجاہد اوّل کے روحانی کمالات اور ان کے سپوت کی دانش اور حکمت پر لکھنے والے لفافہ جرنلسٹ اگر کشف المحجوب کا مطالعہ کر لیں تو انہیں سردار ابن سردار کی روحانیت ،سیاست اور دانش وحکمت سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

جو شخص پرویز مشرف جیسے وطن فروش کا مرید ہوسکتا ہے وہ کسی سے بھی سودا بازی کر سکتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں تو شیر کشمیر اور مجاہد اوّل کا خاندان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ایک دلّی والوں کا چاکر اور دوسرا اسلام آباد والوں کا غلام ہے۔ فرق صرف غلامی اور چاکری میں ہے۔ نوکر اور مالک کا رشتہ پھر اصولوں پر طے ہوتا ہے۔ نوکروں چاکروں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جب کہ غلاموں کی آہ و پکار بھی خاموشی میں ہوتی ہے۔ پاکستان امریکہ کا غلام اور آزاد کشمیر میں خوش فہمی کے مریض 35 لاکھ اپنے نام کے ساتھ آزاد لکھنے والے پاکستان کے غلام۔ پاکستانی سیاست دانوں، جرنیلوں، ججوں اور کچھ بے ضمیر صحافیوں اور سول بیوروکریسی نے اپنے اپنے ذاتی مفادات ،مراعات اور ملک سے لوٹے ہوئے مال کی بیرون ملک حفاظت کے بدلے میں اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں کو امریکہ اور مغربی ممالک کی غلامی میں دے دیا ہے۔ اب ان ممالک کی مرضی پر ہے کہ وہ پاکستانیوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ تم نے سنا ہی ہوگا کہ کبھی ہالینڈ اور ڈنمارک جیسے بے اہمیت ملک پاکستان اور پاکستانیوں کی تذلیل کرتے ہیں اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کرتے ہیں مگر پاکستان جیسا ملک جسے رب تعالیٰ نے اپنی ہر نعمت سے نواز رکھا ہے صرف اس لیے مغلوب، مجبور اور بے بس ہے چونکہ اس ملک کے اٹھارہ کروڑ غلاموں نے اپنی تقدیر کا فیصلہ ایسے لوگوں کے اختیار میں دے رکھا ہے جن کی ذھنیت میں سوائے ظلم و جبر، لوٹ کھسوٹ، بے انصافی اور بے شرمی کے کوئی دوسرا خیال ہی نہیں۔ جج سیاستدانوں کے محتاج ہیں چونکہ وہی انہیں تعینات کرتے ہیں اور پھر ان کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ جج عدالتوں میں اسلیئے نہیں بیٹھے کہ وہ عام آدمی کو انصاف مہیا کریں بلکہ وہ ان آقاؤں کی خدمت اور مفادات کے تحفظ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں جنھوں نے انہیں عدالتوں میں بٹھایا ہوتا ہے۔

ملک قیوم، ڈوگر، ریاض اختر چوہدری اور منظور گیلانی کی مثالیں سامنے ہیں۔ ملک قیوم کی

کیسٹ سنکر اچھے کردار کے جج اور وکیل شرمسار ہوجاتے ہیں مگر خود ملک قیوم ہمیشہ سرشار ہی رہتے ہیں۔ڈوگر کی زمینوں، باغات اور دیگر جائیداد کے قصے انصار عباسی لکھتے اور سناتے تھک گیا مگر ڈوگر کی پشت پر کھڑا سیاسی مافیا ہمیشہ کی طرح قانون پر حاوی رہا۔آقاؤں کا رنگ غلاموں کے چہروں پر بھی آگیا اور سرداروں کے چہیتوں نے ڈوگرہ راج کو بھی شرما دیا۔ڈوگرہ راج میں اگر کوئی ہندو خاص کر ڈوگرہ جرم کرتا تو اسے معمولی جرمانہ کیا جاتا۔اگر ڈوگرہ مسلمان کے مقابلے پر ہوتا تو مسلمان کو بحیثیت غلام سزا دی جاتی اور ڈوگرے کو وارننگ دی جاتی۔ایسے ہی کارنامے ریاض اختر اور گیلانی کے بھی ہیں۔ایک نے برادری کا جھنڈا اٹھائے رکھا اور ظلم کو عدل لکھتا رہا اور دوسرا مفاد پرستی اور خودغرضی کے نام پر انصاف کرتا رہا۔جب دونوں کے مفادات یکساں تھے تو مل کر کھاتے اور انصاف کے نام پر استحصال کرتے تھے۔دونوں کا مرشد اور مربّی بھی ایک ہی تھا جس کے اشاروں پر ظلم و جبر کو عدل کا نام دیا جاتا تھا۔اگر ان دونوں کے کارناموں کا ذکر کروں تو ظلم کا سفرنامی کتاب مرتب ہوسکتی ہے مگر ڈر ہے کہ کرن سنگھ مجھے تعنہ نہ دے کہ میرے باپ دادا میں کیا برائی تھی کہ تمھارے سر پر آزادی کا بھوت سوار ہو گیا۔ریاض اختر اور گیلانی جیسا انصاف تو ہم بھی کرتے تھے اور اگر تم کچھ دیر صبر کر لیتے تو ہم ان سے بہتر بھی ہوسکتے تھے۔گیلانی جیسوں کو تو کوئی کشمیر میں عدلیہ کا کلرک بھی نہ رکھتا اور تم نے چیف جسٹس بنا دیا۔تمہاری اسی سوچ اور عقل نے تمہیں غلام پیدا کیا اور اگر یہ سوچ نہ بدلی تو پتہ نہیں کتنے ریاض اختر اور گیلانی تم پر مسلط ہوکر تمہیں ہماری یاد دلائیں گیں۔

منظور گیلانی کا تعلق وادی کرناہ سے ہے جس کا کچھ علاقہ جسے ہم وادی لیپا کہتے ہیں 1973ء کے ایک معرکے میں پاک فوج نے اپنے قبضے میں لے لیا۔اس معرکے کے ہیرو کرنل حق نواز کیانی شہید ستارہ جرأت تھے۔کرنل حق نواز کیانی شہید ایک درویش صفت کمانڈر تھے اور تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔کرنل کیانی کی داستان جرأت وشجاعت میں نے جناب سعید راشد مرحوم کی کتاب کردار ساز کے علاوہ بہت سے رسائل میں بھی پڑھی ہے۔وادی کرناہ کے راجگان کی بہادری اور جرأت بھی ضرب المثال ہے جنہوں نے ڈوگروں سے پہلے افغانوں،سکھوں اور مغلوں کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالے اور جدوجہد آزادی کا علم بلند رکھا۔

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کچھ لوگ اور قبیلے چک خاندان کے زوال کے بعد نسل درنسل اپنا خون پیش کرتے رہے اور عظمت رفتہ کی بحالی کیلئے کوشاں رہے۔

میرے اس سوال پر نینا نے کہا۔ہاں! اگر تاریخ کی سچائی کو تسلیم کیا جائے تو داغستان اور کشمیر کی جدوجہد آزادی میں بڑی مماثلت ہے۔

میں نے شیر داغستان نامی کتاب پڑھی ہے جو سیبرز آف پیرا ڈائیز کا اردو ترجمہ ہے اور بڑی ہی دلنشین کتاب ہے۔

میں نے دونوں کتابیں پڑھی ہیں بلکہ اس سلسلے کی کچھ اور کتابیں بھی نظر سے گزری ہیں۔میں نے کہا

تم واقعی ٹھیک کہتے ہو۔شیر داغستان ایک دلنشیں کتاب ہے اور مترجم کی علمی صلاحیتوں کا نچوڑ بھی ہے مگر لیوٹالسٹائی کی تحریر حاجی مراد پڑھنے کے بعد مجھے سخت مایوسی ہوئی۔نینا نے کہا۔

کیوں؟ حاجی مراد میں کیا لکھا تھا؟ میں نے پوچھا۔

حاجی مراداور امام شامل دوست تھے۔انکا مسلک اور منزل بھی ایک تھی مگر امام شامل نے اپنی امامت اور چوھدراہٹ جمانے کی خاطر قبائل کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا کرلیا جو پراپیگنڈے کا ماہر تھا۔یہ طبقہ مراعات اور مراتب کے لالچ میں عوام کے دلوں میں امام کا خوف بٹھانے کا کام کرتا اور امام شامل سے منسوب کئی جھوٹی کرامات، فرضی فتوحات اور قصے کہانیاں جوڑ کر عوام کو سناتا تاکہ وہ روسیوں کی جاسوسی نہ کریں اور نہ ہی امام کی حکم عدولی کی جرأت کریں۔

خوف اور دہشت پھیلانے کیلئے امام کا یہ خصوصی دستہ جسکے ایجنٹ ہر قبیلے، علاقے، گاؤں اور بستی میں موجود تھے اپنے مخالفین کو اسلام دشمن اور امام شامل کا باغی قرار دیکر قتل کر دیتے۔ان کے بچوں کو غلام بناتے جائیدادوں پر قبضہ کر لیتے اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیتے۔ایک طرف تو امام شامل ایک مجاھد، مصلح اور حریت پسند کا کردار ادا کررہا تھا اور دوسرے جانب اسلام اور آزادی کی آڑ میں ظلم و جبر کی علامت بھی تھا۔حاجی مراد روسیوں کیلئے امام شامل سے زیادہ خطرناک تھا۔روسی جانتے تھے کہ اگر حاجی مراد میدان جنگ میں کام آگیا تو قبائل اسکا بدلہ لینگے اور اگر امام شامل مارا گیا تو داغستان کی جدوجہد آزادی کی لگام حاجی مراد کے ہاتھ آجائے گی جس سے نمٹنا مشکل ہوگا۔روسی امام شامل کو زندہ پکڑنا چاہتے تھے اور حاجی مراد کو امام شامل سے مروانا چاہتے تھے۔حاجی مراد نے امام کی فرضی کہانیوں اور اسلام کی آڑ میں جبر کی مخالفت کی تو حاجی مراد کو باغی، اسلام دشمن، روسی ایجنٹ اور وطن دشمن قرار دیکر اسکے خلاف اعلان جہاد کر دیا گیا۔

امام شامل نے حاجی مراد کو واجب القتل قرار دیکر اس کی ماں، بیویوں اور بچوں کو قید کر دیا۔

امام کے فتوے کی آڑ میں حاجی مراد کے کئی دشمن اسے تلاش کرنے اور مارنے کیلئے میدان میں آ گئے۔ امام کے ڈر سے حاجی مراد کے دوست بھی خاموش ہو گئے اور خفیہ طریقوں سے اسے امام شامل کی حرکات اور ارادوں سے آگاہ کرتے رہے۔ حاجی مراد پر داغستان کی زمین تنگ ہوئی تو مجبوراً اسے روسیوں سے رابطہ کرنا پڑا مگر روسیوں نے اپنے دشمن امام شامل کے خلاف حاجی مراد کی مدد کرنے کے بجائے اسے قید کر لیا۔

حاجی مراد روسی قید میں بھی باہمت رہا اور اپنے کردار و عمل کا گہرا اثر چھوڑ گیا۔ حاجی مراد کی قید ایک طرف اس کے بلند حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کا بہترین نمونہ ہے تو دوسری جانب روسی فوج کے اندا اختلافات اور زار روس کی بیوقوفانہ اور احمقانہ حرکات اور فیصلوں کا تازیانہ بھی ہے۔ روسی فوج کے باہمی اختلافات، ماتحت کمانڈروں اور سینئر افسروں کی ایک دوسرے پر بد اعتمادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حاجی مراد روسی قید سے بھاگ نکلا مگر روسیوں اور امام شامل کے حامیوں نے اسے ایک دلدلی زمین پر گھیر لیا۔ اپنے چند ساتھیوں کی موت کے بعد حاجی مراد آخر دم تک لڑتا رہا اور کئی روسی فوجیوں اور امام شامل کے حامیوں کو ٹھکانے لگاتا رہا۔

چاروں اطراف سے گولیاں برسنے لگیں تو معمولی اوٹ کا سہارا لیکر دشمن پر وار کرنے والے حاجی مراد کا سارا جسم چھلنی ہو گیا۔ بہت دیر تک حاجی مراد کی طرف سے جواب نہ آنے پر روسیوں اور امام شامل کے مریدوں نے خوف کے سائے میں جھاڑیوں کے اس چھوٹے سے جھنڈ پر مشترکہ یلغار کی تو داغستان کا اصلی شیر خون میں لت پت آخری سانس لے رہا تھا۔ خوشی سے جھومتا ایک روسی افسر قریب ہوا تو حاجی مراد نے اپنے پستول کی آخری گولی روسی افسر کی پیشانی پر داغ کر کلمہ شہادت پڑا اور شہید ہو گیا۔

حاجی مراد کی کہانی میں سردار قیوم، ریاض اختر اور گیلانی کہاں آتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

بھٹو صاحب آتے ہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

میں کہہ رہی ہوں کہ روسی جانتے تھے کہ اگر امام شامل مارا گیا تو داغستان کی تحریک کبھی ختم نہیں ہو گی اس لیے شامل سے پہلے حاجی مراد کا سین سے ہٹنا ضروری ہے۔ اگر امام شامل کے بعد حاجی مراد نے قیادت سنبھال لی تو داغستان آزاد ہو جائے گا اور روسیوں کو بہت سے دیگر علاقوں سے بھی نکلنا ہو گا۔ اگر حاجی مراد کا خاتمہ امام شامل کے ہاتھوں ہو تو تحریک کمزور ہو جائے گی اور وقت گزرنے کے ساتھ امام پر قابو پانا آسان ہو گا۔

روسیوں کی طرح بھٹو بھی جانتا تھا کہ مقبول بٹ کی موجودگی میں آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا مشکل ہوگا۔ اگر مقبول بٹ بھارت کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو شور لائن آف کنٹرول کی دوسری جانب ہوگا۔ آزاد کشمیر والے وظیفہ خور اور خود ساختہ لیڈر صرف تقریروں، چھٹیوں، جلسے جلوسوں اور سیمیناروں سے دل پشوری کرینگے چونکہ انکی اس سے زیادہ اوقات ہی نہیں۔

بھٹو نے مقبول بٹ کو آزادی کی جنگ لڑنے سرینگر بھیجا اور مقبول بٹ واپس نہ آیا۔ کے ایچ خورشید اور سردار ابراہیم کو پارٹی میں شامل کیا اور سردار قیوم کو جیل میں ڈال کر آنے والے موسم کا انتظار کیا مگر موسم بدلنے سے پہلے ہی طوفان آیا اور بھٹو کی کشتی ڈوب گئی۔

ضیاء الحق سے سردار نے ڈیل کی اور ضیاء کے دور اقتدار میں مسئلہ کشمیر سرد خانے میں ڈالکر سردار نے خوب ترقی کی اور اپنے بیٹے کو آنے والے دور کیلئے تیار کیا۔ ضیاء الحق کے بعد نواز شریف کے دونوں ادوار میں مجاہد اوّل اور پسر اوّل ماڈل ٹاؤن کے مجاوروں میں شامل رہے اور مسئلہ کشمیر کے نام پر مزے کرتے رہے 1992ء کا سیلاب آیا تو سردار عتیق کے اندر چھپا لکڑ ہارا سامنے آ گیا۔ منگلا ڈیم میں اربوں روپے کی لکڑی بہہ کر آئی جس میں پاکستانی حکمرانوں کا حصہ نکال کر باقی خورد برد کر دی گئی۔ 1992ء کا سیلاب سرداروں کیلئے خوش قسمتی کا پیغام لایا اور پھر 2005ء کا زلزلہ اور 2010ء کا سیلاب جو لی چیئر سمیت وٹو، گیلانی، ذوالقرنین اور ان کے ماتحت اہلکاروں اور ان کے بھانجوں اور بھتیجوں پر بھی دھن کا کیچڑ پھینک گیا۔

منگلا ڈیم توسیع منصوبے اور سرینگر مظفر آباد بس سروس نے سمگلنگ کا ایک نیا راستہ کھولا جس میں کرپٹ سیاستدانوں اور انکے چمچوں کے ساتھ عدلیہ بھی شامل ہوگئی۔ ریاض اختر نے ہر ظالم، کرپٹ لیٹرے، غاصب اور قانون شکن برادری میٹ اور سردار عتیق کے مرید کے حق میں فیصلے دیکر عدلیہ کے نام پر بدنما داغ لگائے جسے مٹانے کیلئے آزاد کشمیر کی موجودہ عدلیہ کو برادری ازم اور حکومتی دباؤ سے مبّرا ایک ایسا مثالی نظام عدل وضع کرنے کی ضرورت ہوگی جو نہ صرف آزاد کشمیر کے عوام کا عدالتی نظام پر اعتماد بحال کرے بلکہ ان ججوں کا محاسبہ بھی کرے جو برادری، حکومت اور دولت کو ترجیح دیتے ہوئے اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی توہین کرتے ہیں۔

آزاد کشمیر کے عدالتی نظام میں کچھ ایسے جج بھی گزرے ہیں جن کی زندگیاں اور کارنامے سنہری حروف میں لکھنے کے لائق ہیں۔ وقت کی ضرورت ہے کہ موجودہ عدلیہ ان سنہرے لوگوں کی تقلید میں ماضی قریب کے سیاہ دور کو سنہری حال میں بدل دے۔ راجہ رستم نے اپنی یاداشتوں

میں لکھا ہے کہ جج روز جیتا اور روز مرتا ہے۔اس کا ہر درست فیصلہ اسے تاریخ میں ایک نئی زندگی دیتا ہے اور ہر غلط فیصلہ اسکے ضمیر کی موت ہوتا ہے۔

تم لکڑ چوری کی بات کر رہی تھی اسکا کوئی ثبوت بھی ہے؟

میں نے نینا کو روکا، ورنہ وہ ریاض اختر اور گیلانی کی کتاب کھولنے والی تھی۔

اس کے ثبوت موجود ہیں۔نینا نے جواباً کہا اور پھر بولی۔

باجوڑ ایجنسی سے تعلق رکھنے والے صوبہ سرحد کے ایک سابق چیف کنزرویٹو اخونزادہ سعد اللہ خان کے پاس ایک ویڈیو فلم موجود ہے جس میں سردار عتیق کے حکم پر لکڑی بغیر کسی سرکاری اجازت نامے کے لاہور جارہی ہے۔اس فلم میں ایسے ثبوت بھی ہیں کہ لکڑی کے درجنوں ٹرک پاکستان کی مختلف ٹمبر مارکیٹوں میں سمگل ہو رہے ہیں۔جس کا سودا سردار عتیق کے مقرر کردہ سرکاری افسروں نے کیا۔

سعد اللہ خان کو سیلاب کے ذریعے آنے والی لکڑی کی مانیٹرنگ کیلئے حکومت پاکستان نے ہی تعنیات کیا تھا جس کی رپورٹ اس ایماندار افسر نے بمعہ ویڈیو جمع کروادی مگر سپاہی چور بن جائے اور جج اسکا حصہ دار ہو تو سعد اللہ جیسے افسر کیا کر سکتے ہیں۔

اس سے پہلے کی میں کوئی اور بات کروں میں وادی کرناہ، لیپا، راجگان کرناہ کی بات مکمل کرنا چاہتی ہوں جس کا احوال میں نے منظور گیلانی کے حوالے سے شروع کیا تھا۔گیلانی کرناہ کا رہنے والا ہے جہاں ایک منصوبے کے مطابق احمدیت اور قادنیت کی تبلیغ ہوئی جسے کشمیر اور حکومت ہند کی بھر پور حمایت حاصل تھی ۔اس تبلیغ کا مقصد وادی کرناہ کے مسلمانوں خاص کر راجگان کرناہ کے دلوں سے جذبہ جہاد اور حب الوطنی کا وہ جوش ختم کرنا تھا جس نے کبھی اغیار کی غلامی قبول نہ کی تھی ۔حکومتی اور قادیانی مبلغین کی کوششوں سے وادی کرناہ کی نوے فیصد آبادی نے قادنیت قبول کر لی۔منظور گیلانی پاکستان آنے سے پہلے اپنے علاقہ میں کانگرس کا سرگرم رکن تھا۔بقول سردار عتیق کہ گیلانی کو کانگرس کا ٹکٹ بھی ملا مگر بوجہ اس نے اسمبلی کی سیٹ پر پاکستان وارد ہونے کو ترجیح دی چونکہ حکومت ہند کو 1971ء کی جنگ کے بعد پاکستان میں ایک قابل اعتماد ایجنٹ کی ضرورت تھی ۔منظور گیلانی 1973ء میں سوئس ایمبیسی کی مدد سے پاکستان منتقل ہوا اور پھر یہی کا ہو گیا۔منظور گیلانی کے ہزارہ میں مقیم رشتہ داروں کا تعلق بھی احمدی فرقہ سے تھا جن کی مدد سے میر پور میں مقیم شیخ بشارت ایڈووکیٹ نے گیلانی کا میر پور میں قیام ممکن بنا

یا۔شروع شروع میں گیلانی کے پاس قانون کی کوئی ڈگری نہ تھی مگر شیخ بشارت کی مدد سے گیلانی کو میر پور میں بطور وکیل کام کرنے کی اجازت ملی اور وہ بھی اس شرط پر کہ آزاد کشمیر میں عارضی قیام کے دوران وہ کسی قسم کی سرکاری نوکری کے لیے درخواست نہیں دے گا۔ یہ شرط نامہ گیلانی نے خود حکومت کو لکھ کر دیا جس سے میر پور کے پرانے وکیل اور جج خوب واقف ہیں۔گیلانی کا پاکستان آنا، ہزارہ کے احمدیوں اور شیخ بشارت کے ذریعہ سردار قیوم کے خاندان تک رسائی حاصل کرنا ایک ایسی داستان ہے جس کا مکمل احوال جنرل محمد عزیز خان اور سردار سکندر سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔سردار عتیق کئی بار نجی محفلوں میں کہہ چکا ہے کہ منظور گیلانی کے بھارتی وزیر اعظم اندرہ گاندھی سے روابط تھے اور ان کے الیکشن جیتنے پر پاکستان سے مبارک باد کا پہلا ٹیلی گرام گیلانی ہی کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔گیلانی کی حکومت ہند سے دوستی پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے علم میں بھی ہے۔ایک دور ایسا بھی آیا کہ آئی ایس آئی کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل عزیز نے اس وقت کے صدر آزاد کشمیر سردار سکندر کو گیلانی کی کاروائیوں کی ایک فہرست دی اور گیلانی کو عدالتی ریفرنس کے ذریعے عدلیہ سے نکالنے کا عندیہ دیا۔

پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

گیلانی کی مدد کے لیے اس کے ہزارہ کے رشتہ دار، جنرل انور، سردار عتیق، صوبہ سرحد کی عدلیہ کے کچھ جج اور سابق وزیر خارجہ خورشید قصوری کے خاندان کے کچھ افراد میدان میں اتر آئے اور جنرل مشرف کی حمایت سے گیلانی کا بچاؤ ہوگیا۔پاکستان کی بدقسمتی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس ملک میں گیلانی سے لے کر ریمنڈ ڈیوس تک سب کی اپروچ اعلیٰ ترین ایوانوں تک ہے جبکہ اسی ملک کا عام آدمی حیوانوں سے بدتر زندگی جی رہا ہے۔

گیلانی کی زندگی کے کئی پہلو ہیں جس میں بھارت سے قانون کی ڈگریاں منگوا کر عدلیہ میں شمولیت اختیار کرنا، اپنے ہی دیے ہوئے حلف نامے کی خلاف ورزی کرنا، حکومت کا گیلانی کے معاملات ہر آنکھیں بند کرنا اور بحیثیت جج مقبوضہ کشمیر سے آنے والوں کو عدالتی اور قانونی تحفظ دینا شامل ہیں۔اس میں شک نہیں کہ مقبوضہ علاقے سے آنے والے نوے فیصد لوگ آزادی و حریت کا چوغہ پہنے بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے لیے کام کرتے ہیں چونکہ آزاد کشمیر میں سیر کا ویزہ لے کر آنے والے کچھ عرصہ بعد یہاں کی اسمبلی کے ممبر بن جاتے ہیں یا پھر کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں مگر بھارت کبھی اپنے ان شہریوں کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا اور آزاد کشمیر میں

بیٹھے گیلانی کے ہمنوا انہیں قانونی تحفظ دلوا کر اپنے آقاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔

گیلانی اور ریاض اختر میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کا مرشد مجاہد اوّل ہے اور دونوں کی تعیناتی اس ولّی کامل کی وساطت سے ہمیشہ ہی پاکستان کے قائم مقام وزرائے اعظموں نے کیں جو پاکستان میں کسی نائب قاصد کی تبدیلی کے بھی مجاز نہیں تھے۔ پرویز مشرف کا دور آیا تو گیلانی نے قصوریوں اور عطیہ عنایت اللہ کی وساطت سے پرویز مشرف اور جنرل انور تک قربت حاصل کر لی اور جولی چیڑ والوں کو سرخ جھنڈی دکھا دی۔ **2004**ء میں گیلانی نے برطانیہ میں طویل چھٹیاں گزاریں اور ایک ایسے شخص کا مہمان بنا جو برطانیہ اور آزاد کشمیر میں منی لانڈرنگ کی شہرت رکھتا ہے۔ گیلانی اپنے ساتھ لائے ہوئے پانچ سوٹ کیسوں میں کیا لایا تھا اس کا بہتر احوال پاکستان کے لندن ہائی کمیشن میں تعینات ڈی آئی جی راجہ شفیق اور جنرل انور سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ اسی دوران جنرل انور اپنے اہل وعیال کے ساتھ امریکہ یاترا پر بھی گیا اور برطانیہ کے دورے بھی کیے۔ ان دوروں کے دوران انور نے لاکھوں پاؤنڈ اور ڈالر بیرون ملک کشمیریوں سے دعوتوں کے دوران بٹورے اور گیلانی کے میزبان منی لانڈرر کی مدد سے اپنے مستقبل کے لیے محفوظ کر لئے۔

تم حاجی مراد کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

ہاں! نینا نے جواب دیا۔

میں کہہ رہی تھی کہ حاجی مراد پڑھنے کے بعد میرے دل ودماغ میں شیر داغستان کا چہرہ بدل گیا۔ امام شامل کی جگہ حاجی مراد آ گیا اور کئی روز تک میں حاجی مراد کے سوگ میں اداس رہی۔

یہ تو پرانی بات ہے۔ تم ٹالسٹائی کا ناول پڑھ کر کیوں سوگ منانے لگی؟ میں نے کہا۔

ایک اچھے قلمکار کی یہی تو خوبی ہے کہ جب وہ پرانی بات کرے تو نئی لگے۔ وہ قاری کو اپنے ساتھ لیکر چلے اور اسے اپنے بیان کردہ کرداروں کے حوالے کر دے۔ ایسے ہی ٹالسٹائی نے مجھے حاجی مراد کے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ میں دریاؤں، جنگلوں اور بیابانوں میں اس کے ساتھ رہی۔ وہ جب روسیوں کا مہمان بنا تو میں وہی تھی۔ پھر وہ مہمان سے قیدی بن گیا اور آخر کار وہاں سے بھاگ نکلا تو میں اس کے گھوڑے پر بیٹھی اس دلدلی زمین پر آ گئی جہاں حاجی مراد دشمنوں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

تم خود ہی سوچو۔ اتنی رفاقت کے بعد جب کوئی بچھڑ جائے تو اس کا سوگ نہیں مناتے۔

شائد تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ تمھارے تخیل کی گہرائی اور تمھاری حساسیت کی معراج ہے۔ٹالسٹائی واقعی عظیم لکھاڑی تھا۔۔

تم تحریک آزادی کشمیراور داغستان میں مماثلت کی بات کررہی تھی۔میں نے پوچھا۔

ہاں! نینا نے کہا۔

شروع شروع میں تو برطانیہ، جرمنی، فرانس اور ترکی کوہ قاف کے ان حریت پسندوں کے حامی تھے مگر داغستانی جنگجوؤں کے باہمی اختلافات اور دیو مالائی قصے کہانیوں پرمبنی بہادری کے قصوں نے اس تحریک کو افسانوی رنگ دے دیا۔روسی فوج اور قیادت کیے بعد دیگرے انقلابوں او بحرانوں کا شکار ہوئی تو اہل کوہ قاف نے اس شورش سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔جرمنوں نے روسیوں پر یلغار کی تو بھی یہ خاموش تماشائی رہے اور باہمی الجھاؤ کا شکار حالات سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

روس کبھی شکست خوردہ اور کبھی حالات خوردہ رہا مگر پہاڑوں کے یہ شیر نہ گرجے اور نہ ہی عقابوں نے نشیمن سے نکل کر باہر کی دنیا پر نظر ڈالی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کشمیری، فلسطینی اوراہل داغستان صرف لڑنے اور مرنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں فتح یا امن ان کے مقدر میں نہیں اور یہی حال افغانوں کا بھی ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ اہل قفقار میں کبھی کبھی کوئی سلیم خان اور جعفر داؤد جیسا پیدا ہوجاتا ہے اورحریت اورحرمت آزادی کا ایک نیا باب لکھ کر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔اہل کشمیر بادشاہوں کے زوال کے بعد کبھی متحد نہ ہوئے اور کبھی افغانوں، کبھی مغلوں، کبھی سکھوں اور کبھی انگریزوں کے در پر دستک دیکر آزادی کی بھیک مانگتے رہے۔ وہ بھول گئے کہ آزادی مانگنے کی نہیں چھیننے کی چیز ہے۔

آزادی سیاست سے نہیں جرأت اور طاقت سے حاصل ہوتی ہے۔ آزاد کشمیر کے سیاستدانوں میں ڈاکو، چور، ٹمبر فروش، انسانی سمگلر، منشیات فروش اورضمیر فروش نو دولتیے تو بہت ہیں مگر حریت پسند اور جری مجاہد کوئی بھی نہیں۔

میں کہہ رہی تھی کہ مجاہد اوّل اور شیر کشمیر کا سیاسی سفرنامہ ایک سا ہے۔ایک دلّی کا غلام اور دوسرا اسلام آباد کا۔ دونوں کا مقصد مال کمانا اور اپنی اولادوں کو کشمیریوں کے خون کی سودا بازی کرنے کا گر سکھانا ہے جس میں وہ کامیاب ہیں۔اگر کشمیریوں نے ان سیاسی بیوپاریوں سے

جان نہ چھڑائی تو وہ ہمیشہ کیلئے غلام ہی رہینگے اور جو فیصلہ **1974**ء میں ہو گیا وہی اہل کشمیر کا مقدر رہے گیا۔

آگے کچھ نہیں ہونے والا۔ میں کہا۔

اہل نظر کی ریڈنگ تو یہی ہے کہ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ آزاد کشمیر کے عوام برادریوں کی جنگ اور مقبوضہ کشمیر والے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ آزاد کشمیر کے خود ساختہ نام نہاد لیڈر پاکستان میں امریکی پرمٹ پر حکمرانی کرنے والے امریکی ایجنٹوں کی جوتیاں سیدھی کر کے آزاد کشمیر پر حکمرانی کا پرمٹ لیتے ہیں اور امریکی ملازمین کا حصہ نکال کر باقی اپنے خاندان اور قبیلے کی ویلفیئر پر خرچ کر دیتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے سیاسی گھرانے درحقیقت پاکستان پر مسلط امریکی غلاموں کے فرنٹ مین ہیں جیسے علی ذوالقرنین یوسف رضا گیلانی کا فرنٹ مین اور سردار عتیق وٹو، گیلانی اور کائرہ سمیت ہرایرے غیرے نتھو خیرے کا فرنٹ مین اور یہی حال بیرسٹر سلطان اور ہم نواؤں کا بھی ہے۔

نینا آزاد کشمیر میں اور لوگ بھی تو ہیں جو بڑے سیاستدان ہونے کے دعویدار ہیں۔ میں نے کہا۔

کٹے وچھے چوری کر کے بیچنے والے بہت سے ارب پتی ہیں۔ جنہوں نے انسانی سمگلنگ سے پیسہ بنا کر آزاد کشمیر اسمبلی میں مقام بنا لیا۔ وزارتیں خریدیں اور پھر کاغذی ترقیاتی منصوبوں سے کروڑوں ہضم کر کے بیرون ملک ہوٹل اور دیگر کاروبار خرید لئے۔ پیسے کی لت لگی تو بچوں کو بھی منشیات کے دھندے پر لگا دیا۔ شراب نوشی کر کے ہلڑ بازی کرتے پکڑے گئے تو خاکروبوں سے ڈنڈے کھائے ڈھیٹ پن ایسا کہ اسے سیاسی انتقام اور مخالفین کی سازش کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی۔ اب میں ایسے ڈاکوؤں کے نام لیکر اپنی زبان گندی کروں یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

نینا نے برہمی سے کہا اور پھر بولی۔

میں نے جن جن کے نام لیے ان کا کچھ نہ کچھ بیک گراؤنڈ ہے۔ بیرسٹر سلطان اور عتیق پڑھے لکھے ہیں۔ البتہ عتیق شعبدہ باز اور سیاسی جادوگر ہے جبکہ بیرسٹر سلطان سیدھا سادہ روایتی جٹ ہے۔ عتیق باپردہ عیاش اور کرپٹ ہے جبکہ بیرسٹر اپنے پیسوں سے کھاتا کھلاتا اور پیتا پلاتا ہے۔ بیرسٹر کھلے دل، کھلی زبان اور دماغ کا آدمی ہے جبکہ سردار عتیق چانکیے اور میکاولی کا ہم

مکتب ہے۔

ایک جٹ دانشور کا قول ہے کہ ایک سچا اور خالص جٹ نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان، وہ صرف جٹ ہوتا ہے۔

یہ جٹ دانشور کہاں سے لائی ہو۔ جہانگیر بدر کی بات تو نہیں کر رہی۔ میں نے پوچھا۔

نینا نے ہنس کر کہا۔ نہیں۔

جہانگیر بدر نہ جٹ ہے اور نہ ہی دانشور وہ صرف جیالہ ہے اور جیالہ دانشور ہو کر جیالہ نہیں رہتا۔

ایسا بھی نہیں۔ میں نے کہا۔

اعتزاز احسن جٹ بھی ہے جیالہ بھی اور دانشور بھی۔ شاعری گزارے لائق ہے مگر سندھ ساگر ایک اچھی اور تحقیقی کاوش ہے۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ اعتزاز احسن جٹ اور دانشور تو ہے مگر جیالہ نہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

تو پھر جیالہ یا جیالی کیسا اور کیسی ہوتی ہے؟ میں نے پوچھا۔

جیسے حال ہی میں فردوس عاشق اعوان روشن خیال پارٹی سے الگ ہو کر جیالی بنی ہے اور مختصر وقت میں جیالا پن کی چالیس منازل طے کر کے فیصل رضا عابدی، راجہ ریاض، سسی پلیجو، شرمیلا فاروقی، فوزیہ وہاب، بابر اعوان اور دیگر مستند جیالوں اور جیالیوں کی صف میں آ گئی ہیں۔

جہانگیر بدر تو ایسا نہیں۔ نہ اس کی زبان میں کاٹ ہے اور نہ ہی لہجے میں کھڑاک۔ میں نے کہا۔

ہاں! یہ تو ہے۔ نینا نے کہا۔

یہ جیالوں کی ابتدائی نسل ہے جنہیں حقیقی جیالہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ کوشش کے باوجود فیصل رضا عابدی، فوزیہ وہاب، عاصمہ عالمگیر، رحمان ملک اور فاروق نائیک وغیرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

دیکھو بھٹو ازم اور زرداری ازم میں بڑا فرق ہے۔ کھڑا کی اور کاٹ دار جیالے اور جیالیاں زرداری کے بھرتی شدہ ہیں جبکہ بھٹو ازم والے جیالے اور جیالیاں دانشورانہ روش رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں خان عبدالحمید خان، کوثر نیازی، معراج خالد، مخدوم طالب المولیٰ، حنیف رامے، کرنل منیر، حیات شیر پاؤ، غلام مصطفےٰ جتوئی وغیرہ شامل تھے۔ اسی طرح جہانگیر بدر، اعتزاز

احسن، فرحت اللہ بابر، ڈاکٹر اسرار شاہ، ناہید خان، صفدر عباسی، یاسمین عباسی اور دیگر کے نام ہیں جو زرداری ازم پر یقین نہیں رکھتے مگر بھٹو کے نام سے جڑے ہوئے ہیں۔

جیالے پن کو چھوڑو۔ جٹ دانشور کا بتاؤ۔ میں نے کہا۔

یہ قول چوہدری مستنصر حسین تارڑ آف جوکالیاں کا ہے۔

جیسے عبداللہ حسین (محمد خان گجراتی) کا شاہکار اداس نسلیں ہے۔ ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس، قدرت اللہ شہاب کا شہاب نامہ، بینظیر بھٹو کا دختر مشرق اور تہمینہ درانی کا مائی فیوڈل لاڈ ہے ایسے ہی مستنصر حسین تارڑ کا شاہکار خس وخاشاک زمانے ہے۔

تارڑ کی یہ تحریر مصنف کی ادبیانہ صلاحیتوں کا نچوڑ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ حالات کا تجزیہ کار ہے واقعات کا نہیں مگر کہانی کو سفری داستان میں بدل کر سفرنامہ بنانے کا ماہر بھی ہے۔ نینا نے کہا۔

حالات کو واقعات سے جدا کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو لازم وملزوم ہیں۔ واقعات درحقیقت حالات کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔ جیسے وقت کے ایک حصے میں ایک جگہ پر ایک واقعہ بپا ہوتا ہے۔ وقت، جگہ اور واقعہ حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور تخلیقی بھی۔ تم مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کو کریڈٹ دیتی ہو جن کا آغاز لاہور سے ہوتا ہے اور پھر اچانک لاہور پر ہی اختتام ہوجاتا ہے۔ وہ چین جائے یا شمشال وہ جوکالیاں چناب، جٹ برادری اور راوی کے اردگرد ہی رہتا ہے۔

انسان واقعات سے ہی جڑا ہے، شاعر یا ادیب ہو یا عام آدمی واقعات سے لاتعلق کیسے رہ سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں رہ سکتا۔ انسانی زندگی خود ایک واقع ہے۔ نینا نے جواب دیا۔

مگر واقعات کا رونما ہونا ایک بات ہے اور واقعات کا بیان دوسری۔۔۔

حالات کا تجزیہ ایک ہنر ہے اور واقعات کا بیان ایک فن۔ حالات کو مرچ مسالہ لگا کر انہیں منڈی میں فروخت کرنا واقعات کی بے حرمتی ہے۔ میں نے اکثر ادیبوں کو اس گناہ کا مرتکب پایا ہے مگر کالم نگار اور تجزیہ نگار تو اسے گناہ تصور ہی نہیں کرتے اور جھوٹ اور ریاکاری کو پروفیشنل ازم کہتے ہیں۔ یہی حال آجکل ٹیلیویژن پر آنے والے تجزیہ نگاروں اور اینکرز کا ہے۔ مجھے ہنسی تب آتی ہے جب کوئی اینکر کہتا یا کہتی ہے کہ آیئے پشاور چلتے ہیں اور ملتے ہیں افغان امور کے ماہر جناب رحیم اللہ یوسفزئی، بریگیڈیر محمود شاہ، رستم شاہ مہمند، خالد عزیز اور بریگیڈیر اسد وغیرہ

ہے۔

اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ میں نے پوچھا۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔

نینا نے طنزاً جواب دیا۔

یہ ہنسنے یا رونے کی نہیں بلکہ سر پیٹنے کی بات ہے۔

ان جیسی تجزیہ نگار تو میں بھی ہوں۔ پشتو بولنے سے، کسی ایجنسی میں پولیٹیکل ایجنٹ رہنے سے، صوبہ سرحد کا شہری ہونے سے، ملٹری انٹیلیجنس میں دو چار سال نوکری کرنے سے، کسی ہوٹل یا کلب میں افغان سمگلروں اور جنگی جرائم کے مرتکب افراد کے ساتھ بیٹھ کر چسکی لگانے سے، اخبار کی نوکری سے، کچھ دن کابل کے پاکستانی سفارتخانے میں دیہاڑیاں لگانے سے کوئی شخص افغان امور کا ماہر نہیں ہوسکتا۔

جس طرح کا تبصرہ یہ ماہرین کرتے ہیں اس سے بہتر تبصرہ تو وہ ٹرک ڈرائیور کرتے ہیں جو کابل اور جلال آباد میں ٹرکوں کے اڈے پر ایک ہفتہ گزار کر زندہ وسلامت واپس پشاور پہنچ جاتے ہیں۔

تو پھر افغان امور کا ماہر کون ہے۔ میں نے پوچھا۔

اس دنیا میں افغان امور کا ماہر ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ نینا نے جواب دیا۔

میں افغانستان کے متعلق پہلے بھی بات کر چکی ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے برسوں پہلے افغانستان کے حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے دکھ کے ساتھ کہا تھا۔ او غافل افغان۔ اقبالؒ کی یہ نظم افغان اور افغانستان کا بہترین تجزیہ ہے۔

اس سے بھی بہتر تجزیہ صدیوں پہلے سعدیؒ نے ان الفاظ میں کیا تھا:

سعدی روز ازل حسن بہ ترکان دادی — زلف پُر چین کمر نرم بہ ایران دادی

علم و ہنر بہ مردان ہند — پستی وکم عقلی بہ افغان دادی

پشاور میں مقیم ایک افغان سفارتکار کیپٹن موسیٰ خان نے ایک بار اپنے ہی ملک کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ افغان کرائے پر تو مل سکتا ہے خریدا نہیں جاسکتا۔ سابق چیف جسٹس آف افغانستان مولوی ارسلا خان رحمانی ایک بڑے عالم دین اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کی گفتگو عالمانہ، حکیمانہ اور پُر مزاح ہوتی ہے۔ ایک محفل میں کسی مغربی قلمکار نے

پوچھا کہ حضور یہ تو بتایئے افغانستان میں کون سا نظام حکومت بہتر رہے گا۔

مولوی صاحب نے فرمایا۔دیکھو بھائی۔ہمارے ملک میں بادشاہت آئی تو ہم نے بادشاہوں کا برا حال کیا۔ پھر انگریز آئے اور ذلیل وخوار ہو کر نکلے۔روس سے سوشلسٹ اور کیمونسٹ اپنا نظام ہم پر مسلط کرنے آئے تو ہم نے سوشلزم کا ایسا حشر کیا کہ دنیا میں اسکا کوئی نام لیوا ہی نہ رہا۔روسی گئے تو ہم نے ایک دوسرے کا خون بہایا جسے روکنے کیلئے طالبان اسلامی نظام لائے مگر ہم اسلام پر بھی متفق نہ ہوئے۔اب ہماری بے اتفاقی سے فائدہ اٹھانے امریکہ اوراس کے اتحادی آئے ہیں اور پچھتاوے کا شکار ہیں۔ پہلے ان کا حشر دیکھ لو پھر کسی اور نظام کا انتظام کرنا شاید کچھ دیر کے لیے چل جائے۔

ایک اور تجزیہ نگار نے پوچھا حضرت افغان مسئلے کا حل کیا ہے۔ تجربہ کار مولانا نے کہا۔ افغانستان چھوڑ دو۔افغانوں کو چھوڑ دو۔وہ ایک دوسرے سے کیسے معاملات کرتے ہیں اس میں مددگار اور معاون بن کر نہ آؤ۔وارلارڈز کو اپنی ایجنسیوں کے ذریعے اسلحہ فراہم نہ کرو اور اپنے سفارتخانوں کی مدد سے جاسوسیاں نہ کرو۔اگر کوئی افغان گروپ یا تنظیم تمہیں افغانستان کے معاملات پر مدد فراہم کرنے کا کہے تو اسکی بات نہ مانو چونکہ وہ تمہیں مدد کی نہیں موت کی دعوت دے رہا ہوتا ہے۔وہ تمہیں اپنے دشمن کیخلاف تو استعمال کریگا مگر دشمن سے دوستی کرتے وقت تمہیں بھول جائے گا۔افغان تمہاری قوت دیکھ کر نہیں بلکہ تمھاری جیب دیکھ کر دعوت دیتا ہے۔ جب تمھاری جیب خالی ہوگی وہ تمہاری قوت کی پرواہ نہیں کرے گا۔

افغانوں میں یکسوئی نہیں۔وہ نہ ایک جگہ ٹھہرتے ہیں اور نہ کسی پر اعتماد کرتے ہیں۔افغان جگہ، دوست، دشمن اور کاروبار بدلنے میں دیر نہیں لگاتا۔اسکی دوستی، دشمنی اور بزنس اسکے مزاج کا حصہ ہے۔تاریخ میں درج ہے کہ جن لوگوں نے حجر اسود خانہ کعبہ سے چوری کرنے کی کوشش کی ان میں ایک افغان بھی شامل تھا جس نے حجر اسود کا سودا کسی یہودی سے کر رکھا تھا۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے کہا۔

ممکن نہیں مگر کوشش تو ہے چونکہ یہ بزنس کا معاملہ تھا۔

جان چلی گئی مگر ہمت تو کر دکھائی۔نینا نے جواب دیا۔

افغان تو انتہائی دیندار لوگ ہیں۔میں نے پھر کہا۔

بلکل ہیں مگر دین ان کی ثقافت اور روایات کا حصہ ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ سودی کاروبار افغان کرتے ہیں۔دنیا کے سب سے بڑے سمگلر افغانستان میں پائے جاتے ہیں۔دنیامیں سب سے زیادہ ہم جنس پرست افغان ہیں۔دنیا میں سب سے بڑا منشیات کا اڈہ بھارت کے بعد افغانستان ہے اوراب دنیا کا سب سے بڑا اور قدیم ترین میدان جنگ بھی افغانستان ہے۔

تمہیں پتہ ہے کہ تحریک طالبان کا آغاز کیوں ہوا تھا؟نینا نے سوال کیا۔

نہیں ویسے لوگ کہتے ہیں کہ شاید سعودی عرب اور پاکستان کی شہہ پر یہ تحریک وجود میں آئی۔میں نے جواب دیا۔

نہیں۔نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

یہ تحریک ہم جنس پرستی، بدفعلی، سمگلنگ، منشیات فروشی، بدعہدی،سودخوری اور جوأبازی کے خلاف چلی جس کا آغاز مدرسوں کے ان طالب علموں نے کیا جنہیں بدکار استادوں اور علماء نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔شروع میں اس تحریک کا کوئی بانی اور لیڈر نہ تھا۔ پھر ملاں عمراوراسکے چند ساتھیوں نے اس تحریک کی رہنمائی کی اور ملک سے منشیات، سمگلنگ، سود خوری، جوأ بازی سمیت ہر برائی کا خاتمہ کردیا۔

اس سے دنیا کو کیا تکلیف تھی؟میں نے پوچھا۔

وہی جو پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے ہے۔عربوں کی تیل کی دولت سے ہے۔چین کی ترقی سے ہے۔ایرانی انقلاب سے ہے۔مسئلہ فلسطین اور کشمیر سے ہے اور ان تکالیف سے جن ممالک کو پریشانی لاحق ہے ان میں امریکہ اوراس کے حامی شامل ہیں جو تکبر کی حدود کو چھو رہے ہیں۔قدرت کا قانون ہے کہ تکبر اور جبر زیادہ دیر نہیں چلتے اور کسی بڑی تباہی کا شکار ہو کر نشان عبرت بن جاتے ہیں۔نینا نے جواب دیا۔

تم مستنصر حسین تارڑ کی بات کر رہی تھی۔میں نے کہا۔

ہاں!وہی کر رہی ہوں۔

تارڑ بھی تھوڑا سا افغانی ہے۔چونکہ افغانستان تارڑ کا پسندیدہ ملک ہے۔نینا نے کہا اور بات جاری رکھی۔

اسے کابل کی شامیں، قندہار کی راتیں، افغانستان کے صحراؤں اور ویرانوں کی دوپہریں، سراؤں اور چھپر ہوٹلوں کے لنچ اور ناشتے، تپتی دھوپ میں آسمان کو چھوتے بگولے، ہرات کی

صنوبر
صحیں اور چیڑ کے درختوں سے گزر کر آنے والی ٹھنڈی یخ ہوائیں بڑی ہی پسند ہیں۔

میں یہ کہہ رہی تھی کہ تارڑ حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور واقعات کو جان بوجھ کر مسخ کر دیتا ہے۔ وہ تاریخی واقعات کے بیان کیلئے مغربی تاریخ دانوں کی تحقیق پر مکمل بھروسہ کرتا ہے اور مسلمان محققین کو سرے سے نظر انداز کر دیتا ہے۔ شاید وہ ادریسی، ابن بطوطہ، علی ہجویری اور دیگر مسلمان سیاحوں کو بھول جاتا ہے یا پھر وہ انہیں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ بلتی پوٹروں کا تجزیہ تو کرتا ہے مگر بلتستان کی تاریخ و تمدن کا ذکر ہی نہیں کرتا۔

علی ہجویریؒ سیاح تو نہیں تھے؟ میں نے پوچھا۔

کیوں نہیں تھے۔ نینا نے کہا۔

آخری حج کے موقع پر پیغمبر اسلام ﷺ نے جو خطبہ پڑھا اسے سننے والوں میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ موجود تھے۔ اس عظیم خطبے میں اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو حکم دیا کہ زمین پر پھیل جاؤ اور ان تک دین پہنچاؤ جن کے دلوں اور گھروں میں کفر کا اندھیرا ہے۔ آپ ﷺ کے اس حکم کے بعد دو سلسلے چل نکلے۔ ایک فتوحات کا اور دوسرا تبلیغ کا۔ کچھ عرصہ بعد فتوحات کا سلسلہ تو تھم گیا مگر تبلیغ جاری رہی۔ وہ تمام اصحاب کرامؓ، تابعین اور طبع تا بعین اور پھر ان کے سلسلوں سے چلنے والے علماء و فقراءٗ کبھی مقیم نہ تھے۔ ان لوگوں نے علوم ظاھریہ اور باطنیہ کے حصول کیلئے اپنے گھر، وطن اور دیگر امور ترک کئے اور حجاز سے ہند، چین، ایران، بلخ، بخارہ اور نیشاپور تک پہنچے۔ یہ لوگ نہ صرف دین سیکھتے اور سیکھاتے تھے بلکہ رزق حلال کمانے کیلئے ہنرمندی بھی کرتے تھے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی زندگی بھی سفر سے عبارت ہے۔ آپ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ میرا کتب خانہ غزنی میں ہے اور میں ہند میں پڑا ہوں اور ایسے لوگوں کی صحبت میں ہوں جو بلکل ناخواندہ ہیں۔ آپ کا لاہور میں قیام مرشد کے حکم کے تابع ایک روحانی امر تھا جس کی ادائیگی میں آپ نے بقیہ زندگی اسی دھرتی کی نذر کر دی۔

کشف المحجوب ایک روحانی رسالہ، انبیاء، اولیاء اور اصحاب رسول ﷺ کی زندگیوں کا خلاصہ اور ایک ولی اکمل کی سفری سوانح ہے۔ ایسا ہی سفر ابن بطوطہ کا تھا جو بیک وقت ایک تاجر، مبلغ، مصلح، سیاستدان، استاد اور محقق تھا۔ حضرت امام مالکؒ کے سوا باقی امامین کی زندگیاں بھی سفری صعوبتوں سے مزین ہیں۔ آپ کے شاگرد امام شافعیؒ ان کے شاگرد امام احمد بن حنبلؒ سے

لیکر امام ابوحنیفہؒ تک سبھی ارفعٰ زندگیاں مسافتوں، مصیبتوں اور مشاہدات سے لبریز تھیں۔

یہی حال صوفیاء اور سالکین کا ہے۔ تارڑ شمالی علاقوں کا عاشق ہے۔ وہ شاہ گوری، دوسائی، نانگا پربت اور جھیل کرومبر کی بات کرتا ہے اور کبھی افسانوی جھیلیں بھی تخلیق کرتا ہے مگر شاہ ہمدانؒ، سید نور بخش نقشبندیؒ اور دوسرے علماء و مشائخ کا کہیں ذکر نہیں کرتا جن کی آمد سے دنیا اس خطے سے روشناس ہوئی۔

سفر نامہ صرف تتلیوں، اونچے برف پوش پہاڑوں، شور آور دریاؤں، خشک جھیلوں، لذیز کھانوں، معمولی سفری تکلیفوں، سرکاری افسروں سے ملاقاتوں، سرکاری سہولتوں اور دوستوں یاروں کی قلقاریوں کا نام نہیں۔ سیاح تاریخ دہراتا اور تاریخ لکھتا ہے جیسے تارڑ نے مہنہ ول کعبہ شریف اور ''غار حرا میں ایک رات'' لکھ کر تاریخ دھرائی اور نئی تاریخ لکھی۔

پھر تو تمہارا شکوہ دور ہوگیا۔ میں نے کہا۔

کسی حد تک؟ نینا نے جواب دیا۔

ویسے میں تم سے مکمل متفق نہیں ہوں۔ تارڑ کے سفر ناموں میں حالات کے ساتھ ساتھ مشاہدات بھی ہیں جنکا تعلق لامحالہ واقعات ہی سے ہوتا ہے مگر کچھ کمی ضرور ہے۔ ایک با مشاہدہ ولی اور عام آدمی کی قلبی کیفیت میں فرق ہوتا ہے۔

اصحاب رسول ﷺ، اولیائے کاملین اور علمائے حق کی قلبی وارداتیں زد قلم نہیں ہوسکتیں چاہئے وہ خود ہی کیوں نہ لکھیں۔ اصحاب رسول ﷺ اولیاء بھی تھے اور علماء بھی۔ اسی طرح ایک ولّی عالم بھی ہوتا ہے مگر عالم اگر مشاہدات سے عاری ہو اور علم محض دنیاوی امور تک محدود ہو تو وہ کسی علم کا حامل عالم تو ہوسکتا ہے مگر علمائے حق کی صف میں نہیں آتا۔ آج دنیا گدی نشین پیروں سے بھری پڑی ہے اور دنیا کے ہر کونے میں ایک بازار سجا ہے۔ ہر فرقے اور مسلک کا ایک ٹیلیویژن چینل اور مخصوص لباس ہے۔ خوش الحان قاری، نعت خوان اور قوال کرائے پر دستیاب ہیں۔ وعظ و نصیحت کرنے والے بے عمل عالموں سے بھی مارکیٹ بھری پڑی ہے۔ ہر مسلک اور طبقے کے مدرسے، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں جہاں لنگر خانے اور جدید دسترخوان بھی جاری ہیں مگر سب کچھ بے اثر اور بیکار ہے۔

وجہ۔ نینا نے پوچھا۔

حُب، اخلاص اور علم کا فقدان۔ میں نے جواب دیا۔

تم نے ٹھیک کہا۔ جب لنگر، دستر خوان، مدرسے اور مزار ڈرگ مافیا، لینڈ مافیا او دیگر مافیاجات کی دولت سے چلیں گے۔ دینی جماعتوں کے قائدین حکومتوں سے ساز باز اور سیاسی بلیک میلنگ کے ذریعے دولت کمائینگے۔ علماء ومشائخ اور مزاروں کے متولی سیاسی پارٹیوں اور حکمران جماعتوں سے اسمبلی الیکشن اور سینٹ کی سیٹوں کے ٹکٹوں کیلئے ساز باز کرینگے تو حُب اور اخلاص کہاں ٹھہرے گا۔ فقیر کا قول ہے کہ انسان جنگل بیابان، سحرا، سمندر اور پہاڑ عبور کرتا مکہ پہنچ جاتا ہے چونکہ وہاں انبیاء کے آثار ہیں مگر حیرت ہے کہ وہ نفس کے جنگلوں، صحراؤں اور سمندروں سے گزر کر اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں جاتا جہاں اللہ کے آثار کا محل ہے۔

موسیٰؑ نے پکارا اے میرے ربّ میں تجھے کہاں تلاش کروں۔ آواز آئی میں شکستہ دلوں میں رہتا ہوں۔ موسیٰؑ نے کہا اے میرے ربّ اس دنیا کا شکستہ ترین دل میرے سینے میں پیوست ہے۔ ربّ نے کہا تو پھر تو جہاں ہے میں بھی وہی ہوں۔

فقیر نے کہا۔ دل اگر گوشت کا لوتھڑا ہے تو یہ بچوں، دیوانوں اور حیوانوں کے جسم میں بھی ہے۔ دل ایک ایسی حقیقت ہے جس کی پہچان اور بیان کیلئے ایک مکتب درکار ہے اور یہ مکتب انسانی دسترس سے باہر ہے۔

واصف علی واصف نے دل دریا سمندر لکھ کر صرف ایک موج کی جانب اشارہ کیا اور بیان دوسروں کیلئے چھوڑ دیا۔

میاں محمد بخشؒ نے کہا۔ ''اک بندیاں دا دل نہ ڈھاویں میرا ربّ دلاں وچ رہندا''

پھر دل کی صفائی کا طریقہ بیان کیا کہ ہنجو لاگت پانی دیوں تے ریت مٹی رُڑ جاوے۔

سلطان باھوؒ نے کہا مکے گیاں گل مکدی نائیں جدوں دلوں نہ گل مکایئے ھُو۔

داتا گنج بخش لکھتے ہیں کہ خراساں کے اولیاء کا ذکر مشکل ہے۔ میں نے خود تین سو سے زائد ایسے بزرگ دیکھے ہیں اور ان سے فیض حاصل کیا ہے جن میں ہر ایک کا مرتبہ ایسا تھا کہ ان میں سے صرف ایک ساری دنیا کیلئے کافی تھا۔ ماورأ اُلنہر کے مشائخ کے بیان میں کہتے ہیں کہ میں نے ہر ایک کے متعلق جانا تو معلوم ہوا کہ سب کے سب محقق تھے۔

اپنے وطن غزنی کا احوال لکھتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ حسب سابق اس شہر میں ایسے لوگ پیدا ہونگے جن سے ہماری عقیدت قائم رہے گی اور ایسے نامعقول اور فضول لوگوں سے شہر کو نجات مل جائے گی جنہوں نے یہاں گھس کر معرفت وحقیقت کو بدنام کر دیا ہے۔ حضرت علی

ہجویری توقع رکھتے ہیں کہ غزنی دوبارہ اولیاء کرام اور بزرگان دین کا شہر بن جائے گا۔
حضرت علی ہجویریؒ جو خود کو علی بن عثمان الجلابی لکھتے ہیں دور رسالت ﷺ سے صرف ساڑھے تین سو سال بعد پیدا ہوئے جس کا احوال مختلف کتابوں میں درج تاریخوں سے تقریباً یہی اخذ ہوتا ہے۔ آپؒ نے بہت سی کتابیں زد قلم کیئں جسکا ذکر کشف المحجوب میں کیا گیا ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں کہ میں نے بہت سے کتابیں لکھیں جواب موجود نہیں۔ کچھ مسودے لوگوں نے پڑھنے کیلئے لئے اور اپنے نام سے کتابی شکل میں شائع کروادیے۔ کچھ مسودے ابتدائی دور کے تھے جن میں بہت کچھ جوانی اور طالب علمی کے جوش میں لکھا گیا جس کی درستگی کو ضروری سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا۔ؤ
حضرت علی ہجویریؒ کی ان تصانیف کا حوالہ اس لئے دے رہی ہوں کہ اس سے دو چیزوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اوّل عمر، علم اور تجربے کے ساتھ عالم کا ذھن پختہ اور خیالات میں جذبات کی کمی آتی ہے۔ جوں جوں ایک طالب پر حقائق کی دنیا روشن ہوتی ہے جذبات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور مشاہدات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔
دوئم ہر دور میں علماء اور فقراء کے لبادے میں بہروپیوں، ٹھگوں اور نامعقول لوگوں کی ایک جماعت بھی میدان میں رہتی ہے جنکا کام علمائے حق کی تصانیف چوری کر کے اپنے نام سے شائع کرنا، عوم الناس کو صوفی، فقیر اور ولّی بنکر لوٹنا، قرآن و حدیث سے حوالے دیکر دولت کی خاطر حکومت وقت کی چاپلوسی کرنا اور دولت اور شہرت کے ذریعے عوام کے دلوں پر دھاک بٹھانا ہے۔ نینا نے کہا۔
تم خود سوچو کہ مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام کے صرف چار سو سال بعد دنیا کی یہ حالت تھی تو آج کے جدید دور میں قرآن و حدیث کے راستے پر چلنے والوں کو کس قدر دشواریاں ہیں۔
جدید مواصلاتی نظام اور دیگر سہولیات نے نہ صرف منکرین اسلام بلکہ فرقہ واریت کا بوجھ اٹھانے والے علماء اور مسلکی جنونی مبلغین کیلئے کتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ کبھی اولیاء کے وجود سے خالی نہیں رہتا مگر ایسے لوگوں کی نگاہ ہی باطل قوتوں کی سرکوبی کیلئے کافی ہوتی ہے۔ انہیں کسی ٹیلیفویژن چینل، کمپیوٹر اور سٹیلائٹ سسٹم کی ضرورت نہیں ہوتی۔
ولّی اللہ مخلوق کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی حکمرانوں سے مراعات کا طالب ہوتا ہے۔ شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ بادشاہ قلعے کی فصیل پر چہل قدمی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ میں بڑا ہی خوش

بخت ہوں۔ میرے خزانے بھرے ہیں۔ میرے حرم میں خوش شکل عورتیں ہیں، میرے بیٹے جری جوان ہیں اور میری فوجوں کی دھاک اردگرد کے مما لک پر ہے۔

فصیل کے نیچے سے آواز آئی الحمداللہ میں بھی خوش نصیب ہوں۔ اس شہر میں مجھ جیسا کوئی نہیں۔ میرے ربّ کا مجھ پر خصوصی کرم ہے۔ میں اسکی ہر نعمت کا شکر گزار ہوں۔ کون ہے جو مجھ سے موازنہ کرے۔ کون ہے جو ربّ العالمین کی نعمتیں گنوائے۔

بادشاہ حیران ہوا اور پھر آواز لگائی۔ مجھے خوشی ہے کہ میری رعایا بھی اتنی ہی خوشحال ہے۔

اے پکارنے والے اپنا دامن پھیلا میں تجھے اشرفیاں پھینکوں۔ یہ تیرا انعام ہے۔

فقیر بولا: اے بادشاہ ستر پوشی کیلئے ایک لنگوٹ کے سوا میرے جسم پر کوئی کپڑا ہی نہیں دامن کہاں سے پھیلاؤں۔

ولیؔ کی ولایت میں شاہ وفقیر سبھی رہتے ہیں مگر وہ نہ بادشاہ کے در پر دستک دیتا ہے نہ فقیروں اور مسکینوں کی طرح سوالی ہوتا ہے۔

محمد بلبن بادشاہ بنا تو تاج دھلویؒ کو کئی پیغام بھجوائے مگر درویش نے شاہ سے ملنے کی خواہش نہ کی۔ ایک رات بلبن اپنے وزیر کے ہمراہ تاج دھلویؒ کی کٹیا پر حاضر ہوا تو آپؒ تہجد کیلئے کھڑے ہو گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ بارش شروع ہوگئی اور بادشاہ بھیگ گیا۔ سردی بڑھ گئی تو وزیر نے کہا حضور آپ بادشاہ ہیں اور فقیر جھونپڑے کے باہر بھیگ رہے ہیں۔ بلبن نے کہا نہیں۔ بادشاہ وہ ہے جو نماز کیلئے کھڑا ہے اور میرے جیسے فقیر کی پرواہ نہیں کر رہا۔ اگر میں بادشاہ ہوتا تو وہ میرے در پر آتا۔

تصوف کی بات کرو گے تو یہ محفل کبھی ختم نہ ہوگی۔ ہمارے عقائد میں کمزوری اور سوچ میں نقائص ہیں اور ہمارا علم ادھورا ہے۔ نینا نے کہا۔

بے شک۔ میں نے جواب دیا۔

نینا بات یہ ہے کہ جب مادیت کا غلبہ ہو، معاشرے میں انصاف نہ ہو، حکمران طبقہ بدمعاشوں، لٹیروں، چوراچکوں پر مشتمل ہو، نیچ اور گھٹیا ذھنیت کے حامل لوگ اشرافیہ کا روپ دھار لیں، علماء اور فقراء کہلانے والے اس اشرافیہ اور حکمرانوں کے قصیدے پڑھنے لگیں اور مادی فوائد کے حصول کیلئے اغیار کے ہاتھوں بکنے پر تیار ہوں تو ایسے معاشرے اور ریاست کے عوام کا عقیدہ کیسے مضبوط ہو۔

عقیدے کی بنیاد علم اور یقین پر ہوتی ہے۔ جب عالم اور محقق اپنے علم اور تحقیق کو فرقہ ورایت اور مادیت کے تابع اپنے مطلب کے رنگ دینگے تو علم کی اصل روح سے فیض پانے والوں کی تعداد کم ہو گی۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ نینا نے کہا۔

تمہیں پتہ ہے لاہور کے قریب ایک صوفی یونیورسٹی بن رہی ہے؟

نہیں۔۔۔مگر یونیورسٹی سے صوفی کیسے پیدا ہونگے۔ ہوسکتا ہے وہاں کم عمر بچوں کو قرآن و حدیث اور دیگر ظاہری و مادی علوم کے ساتھ تزکیہ نفس، مجاہدہ قلبی اور فقر کے اصولوں کے تحت تربیت دی جائے اور انہیں تہجد گزاری کا عادی بنایا جائے۔

میں نے کہا۔

مگر یہ ممکن نہیں۔ نینا نے کہا۔

ایسے تو بہت سے مدرسے پہلے سے موجود ہیں۔ جامع بنوریہ کے علاوہ منہاج القرآن کے درجنوں مراکز پاکستان اور دنیا بھر میں چل رہے ہیں جہاں اس طرح کی تربیت دی جاتی ہے مگر وہاں کے فارغ التحصیل طلباء نہ صوفی ہوتے ہیں اور نہ ہی ولیؒ۔ ہر مسلک کے اپنے اپنے ادارے ہیں جہاں حفظ و قرأت کے علاوہ مخصوص عقائد کی تربیت بھی ہوتی ہے مگر جوں جوں انسانی ذہن پختہ کار اور تجربہ کار ہوتا ہے سوچ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ انسانی شعوری قوتیں عقل پر حاوی ہو کر تربیت کا ایک نیا دروازہ کھول دیتی ہیں تو انسان اپنے علم و عقل سے آگاہی پانے کے بوجود نئی راہوں اور نئی منازل کا متلاشی ہو جاتا ہے۔

تاریخ میں مولانا رومؒ، بایزید بسطامی اور دیگر فقراء کی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے درویش بادشاہ بھی ہوئے اور آج کل کے دور میں تصوف، فقر و ولائت اور درویشی کے دعویداروں کے چہرے بھی ہمارے سامنے ہیں۔

مخدوم یوسف رضا گیلانی نے اپنی کتاب ''چاہ یوسف سے صدا'' میں اپنی بہن کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں انہیں ولیوں کا ولی یعنی قطب الاقطاب کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ اپنے گھر، خاندان اور مریدوں میں ولیوں کے ولی ہی مشہور ہوں گے۔ اب اس ولی کی ظاہری زندگی پر نظر ڈالو تو کرپشن، بدعہدی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے دھویں سے بینائی زائل ہونے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک ٹیلیویژن اینکر ڈاکٹر

دانش کو چیخ چیخ کر کہتے سنا ہے کہ جاؤ اور پی سی میں دیکھو وہاں گیلانی کی بیوی اور بیٹے نے کرپشن اور لوٹ مار کی دکان سجا رکھی ہے۔ایک دوسرے ٹیلیویژن چینل پر بیرسٹر اکرم شیخ کو یہ کہتے بھی سنا ہے کہ فوزیہ گیلانی نے ایک گھنٹے میں پچیس ہزار پاؤنڈ جوئے میں ہار دیے ہیں۔اس پر پیپلز پارٹی کے انور بیگ نے مسکرا کر کہا حضور اس میں پارٹی کا کیا قصور ہے؟ جاؤ اور اس کے خاوند سے پوچھو۔

گندے اور استعمال شدہ تیل کا فراڈ ہو یا رینٹل پاور کے بہانے قومی خزانہ لوٹنے کا حربہ، بوڑھوں اور پنشنروں کے فنڈ سے لوٹ مار ہو یا مال مویشی، گندم، ڈیزل، کھادیں، پھل فروٹ، انڈہ مرغی، گھی، تیل اور سیمنٹ افغانستان کے ذریعے دوسرے ملکوں کو سمگل کرنے کا دھندہ یا حاجیوں کو لوٹنے کا کاروبار۔ چوری، ڈاکے، فراڈ کا ہر کھرا کسی نہ کسی گدی نشین، عالم دین، مخدوم، پیر یا پھر امیر کبیر رئیس کے گھر سے جا نکلتا ہے۔

جس یونیورسٹی کا چانسلر گورنر پنجاب ہوگا، سرپرست اعلیٰ چوہدری شجاعت اور مشاہد حسین ہونگے تو وائس چانسلر بھی کوئی ان جیسا ہی ہوگا۔ ایسے ادارے سے صوفی نہیں بلکہ ڈاکو، چور، سمگلر، فراڈیے، شرابی کبابی، ناچے، بھانڈ، میراثی اور دیگر اعلیٰ قماش کے بل بتوڑے ہی نکلیں گے اللہ والے نہیں۔

مشاہد حسین، چوہدری شجاعت اور وسیم سجاد کی کرامات کے نتیجے میں دس سال تک مشرف نے دھمال ڈالی اور جاتے جاتے خودکش بمباروں کا تحفہ قوم کو دے گیا۔اس ٹولے نے اکبر بگٹی سے مذاکرات کئے تو بلوچستان آگ لگ گئی۔اب صوفی یونیورسٹی سے کیا نکلے گا تم خود ہی اندازہ کرلو۔

ویسے تم تصور میں لاؤ کہ اس یونیورسٹی کے لیکچرر، پروفیسر، ڈین، ریکٹر اور شعبہ جات کے سربراہ کون ہوسکتے ہیں۔ نینا نے طنزاً پوچھا۔

چانسلر تو گورنر پنجاب ہوگا اور پنجاب کے سبھی گورنر تقریباً ایک سے ہوتے ہیں۔وائس چانسلر جہانگیر بدر جبکہ دیگر عہدوں کیلئے چوہدری شجاعت اور مشاہد حسین پہلے سے چنے جا چکے ہیں،صرف وسیم سجاد، پرویز الٰہی، راجہ ریاض، منو بھائی، اطہر عباس، امتیاز عالم،نعیم بخاری اور نظیر ناجی کو فٹ کرنے کی ضرورت ہے۔

سیاسی ناچ نچانے کیلئے بابر اعوان اور اداکارہ نرگس سے بہتر کوئی پروفیسر نہیں مل سکتا۔ تیل،

گندم اور دیگر اشیاء کی تجارت کے طریقے مولانا فضل الرحمٰن سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔عرق انگور کے جملہ علوم پر ستر فیصد اسمبلی ممبروں کو دسترس حاصل ہے اوران کی غیر حاضری میں بیرسٹر سلطان محمود چوہدری اوران کی سابق کابینہ کے سبھی وزیراس مضمون میں پی ایچ ڈی ہیں۔

چینی پیدا کرنے اور بیچنے میں ہمایوں اختر، ہارون اختر، چوھدری برادران، شریف برادران، ڈاکٹر فہمیدہ مرزا اور خود امیرالأ مرأ جناب زرداری صاحب سمیت درجنوں پارلیمنٹیرین کوالیفائیڈ ہیں۔ ریلوے کو سکریپ بنانے میں بلور برادران کے علاوہ جنرل سعید ظفر، جاوید اشرف قاضی جیسے ماہرین دنیا میں نہیں ملتے۔ایئر لائن کو تباہ کرنے کا ماہر کپٹن ہارون اوراس کا ٹولہ عالمی شہرت کا حامل ہے۔ قانون کے ساتھ کھلواڑ کرنے میں بابر اعوان، ریاض اختر چوہدری، منظور گیلانی، حمید ڈوگر اوران کا ٹولہ ہمہ وقت دستیاب ہے۔لوہے، تانبے، سونے اور سٹیل کے امور میں زرداری صاحب کا ثانی نہیں۔ کک بیک وصولنے کے جملہ اسرار آپ کی باطنی تربیت کا حصہ ہیں۔آپ کے روحانی اثاثے کے مالکان میں بابر اعوان، فاروق نائیک، فوزیہ وہاب، فیصل رضا عابدی، رحمان ملک، عاصمہ عالمگیر، فردوس عاشق اعوان سمیت درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں عاشقان و طالبان زرو جواہر موجود ہیں۔ سیاسی واسوخت، اشوب شہر اور ہجو گوئی کی تعلیم فیصل رضا عابدی سے بہتر کوئی نہیں دے سکتا۔ بوجہ موصوف کی عدم دستیابی کی صورت میں بابر اعوان اور فردوس عاشق اعوان ہر مضمون میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ سلسلہ زرداریاں، گیلانیاں، چوہدریان، شریفان، بلوران اور فضلان کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مریدین دن رات اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں کو تزکیہ ومجاہدہ کروانے کی سعی کرر ہے ہیں۔

جب لوگوں کو بجلی، پانی، گیس، روٹی اور کپڑا میسر نہ ہوگا، مریض کو دوا نہ ملے گی، عدالتوں سے انصاف نہیں ملے گا، بیوروکریسی سیاستدانوں کی کرپشن اور لوٹ مار کو قانونی اور آئینی شکل دیکر ملکی دولت لوٹنے میں مددگار بن جائے گی تو عام آدمی کیا کریگا۔

کیا کرے گا؟ تم ہی بتاؤ۔ میں نے کہا۔

پاکستان جیسے ملک میں اس کے چار ادوار ہونگے۔ نینا نے سنجیدگی سے کہا۔

موجودہ دور اس سلسلے کا پہلا دور ہے جس میں لوگ مہنگائی، بے انصافی، بدعہدی، کرپشن، لوٹ مار، سمگلنگ اور دیگر معاشرتی برائیوں کے خلاف بات تو کرتے ہیں مگر ان میں حوصلہ، ہمت، جرأت اور غیرت نہیں کہ بدعنوان، کرپٹ اور بدمعاش سیاسی ٹولے، برادری ازم اور

سیاسی کرشمہ سازی کے تابع ججوں، دولت کے انبار لگانے والے کرپٹ جرنیلوں، صحافیوں، پٹواریوں اور تھانیداروں سے لیکر سیکرٹریوں تک کا گھیراؤ کریں انہیں دفتروں، گھروں اور گاڑیوں سے نکال کر چوکوں اور چوراہوں میں کھڑا کر کے صرف اتنا پوچھیں کہ اپنے کرتوتوں کا حساب دو۔

انہیں مارنے اور تشدد کرنے کے بجائے ان کی دولت، فیکٹریاں، محلات، گاڑیاں اور گدیاں چھین کر انہیں چھوڑ دیں اور جہاں جہاں سے پیسہ لوٹ گیا ہے وہاں واپس کر دیں تو یہ لوگ اپنی موت آپ مرجائینگے اور ملک خوشحال ہو جائے گا۔

مگر پاکستان جیسے ملک میں یہ ممکن نہیں۔ نینا نے کہا اور پھر بولی۔

آجکل لوگ رونے کرلانے میں مصروف ہیں اور سب کچھ مقدر سمجھ کر سہہ رہے ہیں۔ بچے بیچ رہے ہیں، این جی اوز کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہیں، بہوؤں، بیٹیوں اور بیویوں سے دھندہ کروا کر پیٹ پالتے ہیں۔ کرپٹ سیاستدانوں کے ہاتھوں بک رہے ہیں، مسلکی ملاؤں سے چمٹ کر کسی چمک کے منتظر ہیں اور تھوڑے بہت خودکش بمبار بنکر اپنے گھر والوں کے لئے چند لاکھ چھوڑ کر جنت کا ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ غیر مسلم این جی اوز کی مدد سے توہین رسالت کا ڈرامہ رچا کر یورپ اور امریکہ جانے کی کوشش میں ہیں، کچھ سیاسی جماعتوں کیلئے ٹارگٹ کلنگ، چوریاں، ڈاکے، دھماکے، بلوے اور بدماشیاں کرتے ہیں۔ ان میں جیالے متوالے، نرالے، پختالے اور کھڑیالے سبھی شامل ہیں۔ کچھ پولیس افسروں کے تعاون سے بھی ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں جن میں تھوڑی بہت غیرت ہے وہ خودکشیاں کر کے ٹیلیویژن اینکروں کیلئے دو چار دن کا مواد چھوڑ جاتے ہیں۔

تم نے عمران خان اور جماعت اسلامی کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہا۔

اس طرح تو اور بھی بہت ہیں، جتنے نام لونگی بلڈ پریشر بڑھے گا۔ نینا نے جواب دیا۔

عمران سیاستدان نہیں وہ ایک ریٹائرڈ اور جذباتی کھلاڑی ہے۔ جس شخص میں دوست اور دشمن کی پہچان نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ عمران کی باتیں اچھی ہیں مگر منصوبے ناقابل عمل ہیں۔ عمران نہ دور اندیش ہے اور نہ ہی مستقل مزاج۔ ایسا شخص نہ ریفامر ہوسکتا ہے اور نہ ہی سیاستدان۔ عمران منتشر الخیال اور خوش فہم شخص ہے جو سیاست کو کرکٹ اور کرکٹ کو سیاست سمجھتا ہے جب تک وہ خوش فہمی کے چکر سے

نہیں نکلتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی قوت اسے اقتدار کی کرسی پر بٹھائے ،استعمال کرئے اور پھر چلتا کر دے۔

جماعت اسلامی کی ایک اپنی تاریخ ، مزاج اور حلقہ ہے۔جماعت کے ووٹر پیدائشی ہیں۔جماعت والے اپنے ووٹروں کی صحت،تعلیم ،تربیت اور دیگر امور کا خیال رکھتے ہیں اور انہیں اپنے حلقہ اثر سے باہر نہیں جانے دیتے۔

میں پہلے دور کی بات کر رہی تھی کہ عوام موروثی سیاست دانوں کے کھوکھلے نعروں، جذباتی تقریروں کے سحر میں مبتلا ہیں اور انہیں اس بات کا شعور ہی نہیں کہ جنہیں وہ نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں وہی ان کے قاتل ہیں۔جن سے وہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں وہی ان کی آنے والی نسلوں کو غلام بنا کر ان کا سب کچھ چھیننے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

چوہدری اور ان کے ہمنوا کہتے ہیں کہ ہم نے پرویزی حکومت چھوڑی تو اربوں ڈالر خزانے میں موجود تھے مگر کوئی عقلمند ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ تمہیں نے ایک عبوری حکومت بنائی تھی جو سب کچھ لوٹ کر لے گئی اور تمہارا حصہ تمہیں مل گیا۔

لوگ چینی، گندم اور دیگر اشیاء کا رونا روتے ہیں مگر کوئی مل مالک سیاستدانوں کے گریبان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔لوگ مہنگی بجلی اور گیس پر ماتم کناں ہیں مگر حکومت میں بیٹھے ان لٹیروں سے نہیں پوچھتے کہ یہ ظلم کیوں کرتے ہو اور صرف رینٹل پاور پروجیکٹ لگا کر پیسہ کمانے کے چکر میں کالا باغ ڈیم سمیت دیگر منصوبے شروع کیوں نہیں کرتے۔ڈاکٹر اجمل نیازی نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ سندھی قوم پرست ، اے این پی کے قائدین اور بہت سے بیوروکریٹ بشمول کچھ پنجابی سیاست دان اور انڈس واٹر کمیشن کے عہدداران بھارت سے پیسہ لے کر نہ صرف کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ بھارت کو مزید ڈیم بنانے اور پانی چوری کرنے میں مدد بھی فراہم کرتے ہیں۔

دوسرا دور کیا ہوگا؟ میں نے پوچھا۔

کوئی پھل ماچھی، محمد خان ڈھرنالیا، کوئی مانک بسال، کوئی جگا گجر، کوئی سجاول، کوئی خوشحال خان خٹک، کوئی میر چاکر، کوئی دلا بھٹی، کوئی ملا عمر، کوئی بیت اللہ مسعود اور کوئی منگل باغ ایک نئی کروٹ لیکر بیدار ہوگا اور ساری گندگی صاف کر دے گا۔

ناممکن۔

تم نے دانشوروں، مجاہدوں اور غیرت مندوں کو ڈاکوؤں اور دھشت گردوں میں گڈ مڈھ کر دیا ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں تم سمجھ نہیں سکے۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

بلوچوں کو سیدھا کرنے کیلئے میر چاکر جیسا دلیر اور غیرت مند بلوچ چاہیے جو کابل، دبئی، لندن، نیویارک اور دہلی جا کر آزادی کا ڈرامہ نہ رچائے، جو ڈالروں اور پونڈوں کے عوض بلوچ غیرت کا سودا نہ کرے، جو پاکستان اور بلوچستان کی حقیقی روح کو سمجھتا ہو، جو صرف بلوچوں کا نہیں بلکہ اٹھارہ کروڑ بے حس وحرکت اور بے شعور پاکستانیوں کی غیرت کو جھنجوڑنے والا ہو۔

میر چاکر اگر روس میں ہوتا تو اس کا رتبہ لینن، سٹالن اور خروشیف سے کم نہ ہوتا، وہ یوگوسلاویہ میں ہوتا تو مارشل ٹیٹو سے بڑا لیڈر ہوتا، وہ چین میں ہوتا تو ماؤزے تنگ اور چو این لائی اسکے شاگرد ہوتے، وہ عرب میں ہوتا تو شاہ فیصل جیسا ہوتا، وہ ترکی میں ہوتا تو کمال اتا ترک سے بہتر ہوتا، وہ امریکہ میں ہوتا تو جارج واشنگٹن سے قد آور ہوتا، وہ یورپ میں ہوتا تو چرچل، ڈیگال اور جوزف مزینی اسکے تابع فرمان ہوتے۔

سندھ سے وڈیرا شاہی، بھتہ خوری، جاگیرداری کے خاتمے کیلئے پھل ماچھی اور سجاول جیسے کرداروں کی اشد ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ چور پکڑنے کیلئے چور سدھانہ ضروری ہے۔ سندھ کے حالات سندھ کارڈ اور بلیک میلنگ سے نہیں دُرے سے ٹھیک ہونگے۔ ایسا لٹھ بردار جو باغیرت جری جوان ہو، جو پاکستان اور پاکستانیوں کے دکھ درد سمجھتا ہو اور سب لٹیروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک کر شیر دریا میں ڈالنے کا ہنر جانتا ہو۔ ایک بے مثل اور باوقار سجاول یا پھل ماچھی برائے سندھ درکار ہے۔

پنجاب کے چوہدریوں، شریفوں، گیلانیوں، جیلانیوں، مخدوموں اور مجذوبوں کی صحت تب تک درست نہ ہوگی جب تک ایک دلا بھٹی، ایک محمد خان، ایک مانک بسال، ایک جگا یا پھر چراغ بالی میدان میں نہیں آتا۔ پنجاب کی مٹی میں جوش نہیں رہا۔ جب مٹی میں جوش نہ ہو تو پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ پنجاب کی زمین کو ایک انتھک ہالی، غیرت اور جوش کی کھاد اور باضمیر بیج کی ضرورت ہے جبکہ ایک ماڈرن دلا بھٹی یا محمد خان جیسا ہالی بھی درکار ہے جو بکنے والا نہ ہو، جس کے دل میں مٹی کی حرمت اور غیرت کا احساس ہو۔ ورنہ بابر اعوان جیسے عطائی ڈاکٹر پنجابیوں کی رگوں سے بچا کھچا خون بھی نچوڑ لینگے۔

نینا! میں نے سنا ہے کہ بابر اعوان اصلی جیالہ نہیں۔

ہاں تم نے سچ سنا ہے۔ نینا نے جواب دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ بابر اعوان پہلے نوائے وقت میں ملازم تھا، پھر رپورٹر بنا اور بھٹو کے خلاف من گھڑت کہانیاں اور رپورٹیں شائع کرواتا رہا۔ پھر جماعت اسلامی میں گیا اور بھٹو کی پھانسی کا مطالبہ کرنے والے جماعتوں کے جلوسوں کا سرخیل بن گیا۔

بابر اعوان کا پنڈی کے جلوسوں میں ایک نعرہ مشہور تھا کہ ہمیں بھٹو کا سر چاہیئے۔ سنا ہے یہ جلوس ضیاء الحق کی ایماء پر نکالے جاتے تھے اور بابر اعوان کو اس کا خرچہ اور تنخواہ بھی ملتی تھی۔ ضیاء الحق دنیا کو یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ بھٹو ناپسندیدہ شخصیت ہے اور عوام پھانسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

پھر۔ میں نے پوچھا۔

بابر اعوان کی خواہش پر ضیاء الحق نے اسے بھٹو کا سر پیش کر دیا۔ نینا نے رنجیدگی سے جواب دیا۔

کیا زرداری اینڈ کمپنی کو اس بات کا پتہ نہیں۔ میں نے کہا۔

پتہ کیوں نہیں۔ بینظیر مرحومہ کو بھی پتہ تھا۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

ایک بابر اعوان ہی نہیں اور بھی بہت ہیں۔ زرداری کے دست راست اور بینظیر مرحومہ کے معتمد خاص رحمان ملک بھی بھٹو مخالف کیمپ سے گھومتے پھرتے پیپلز پارٹی میں آئے اور عملاً اس کے مالک و مختار بن گئے۔ رحمان ملک کی پیپلز پارٹی میں وہی حیثیت ہے جو کبھی خود بھٹو مرحوم کی تھی۔ رحمان ملک نے دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیوں سے روابط پیدا کئے اور بھٹو خاندان کا حصہ بن کر ان کی حیثیت محدود کر دی۔ ایڈمرل شریف اپنی کتاب ''ڈائری آف ایڈمرل'' میں لکھتے ہیں کہ جب وہ پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین تھے تو جنرل ضیاء الحق نے سفارش کی کہ رحمان ملک کو انیسویں گریڈ میں ایف آئی اے میں ایڈجسٹ کیا جائے۔ ہیرو آف چٹا گانگ نے کہا نہیں ایسا ممکن نہیں اور نہ ہی رحمان ملک میں ایسی قابلیت ہے۔ ضیاء الحق جن لوگوں سے الجھنا مناسب نہ سمجھتا تھا ان میں جنرل فضل حق، ایڈمرل شریف جنرل شاہ رفیع عالم اور جنرل ڈاکٹر ایوب خان شامل تھے۔

کچھ دنوں کی خاموشی کے بعد ضیاء الحق کے سٹاف میں شامل بریگیڈیئر حفیظ نے منت

سماجت شروع کردی کہ سر کچھ نہ کچھ کریں جس بنا پر رحمان ملک کو ایف آئی اے میں ایڈجسٹ کیا گیا۔ضیاء الحق دنیا سے گئے تو رحمان ملک پی پی پی کے کیمپ میں آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے زرداری اور بینظیر کے خاص الخاص لوگوں میں شامل ہوگیا۔رحمان ملک پیپلز پاٹی کی سیڑھی اور پیر ہارون بادشاہ گیلانی کی چادر استعمال کر کے ارب پتی بن گیا اور پھر بینظیر کو موت کے منہ میں دھکیل کر زرداری ہاؤس پہنچ گیا۔مشرف دور میں رحمان ملک گرفتاری کے خوف سے اپنے اہل و عیال سمیت پشاور چلا گیا جہاں پیر ہارون گیلانی کے آستانہ عالیہ کے سوا اُسے کوئی محفوظ ٹھکانہ میسر نہ ہوا۔پیر صاحب اپنے اس مجبور اور خوفزدہ مرید کو اپنی چادر میں لپیٹ کر پہلے جلال آباد لے گے اور پھر بذریعہ کابل اور دوبئی لندن روانہ کردیا۔

کیا زرداری کو سمجھ نہیں کہ جو شخص ہر کسی کا ہے مگر حقیقت میں کسی کا بھی نہیں، وہ کل کلاں زرداری کو بھی لیاقت باغ میں چھوڑ کر واپس آرمی ہاؤس چلا جائیگا۔میں نے کہا۔

سمجھ سب کو ہے مگر دولت اور اقتدار کا نشہ جن لوگوں کے زوال کا باعث بنتا ہے ایسے لوگوں کے رہنما بابر اعوان،فوزیہ وہاب اور رحمان ملک جیسے ہی ہوتے ہیں۔نینا نے جواب دیا۔

سنا ہے بھٹو کا بھی ایک مشیر تھا جو اصل میں سی آئی اے کا بندہ تھا۔میں نے پوچھا۔

ہاں اس کا نام رفیع رضا تھا اور بھٹو مرحوم کا مشیر خاص تھا جیسے جنرل درانی،ضیاء الحق سے لیکر یوسف رضا گیلانی تک ہر حکمران کا سفیر،مشیر اور مقرب رہا ہے۔بقول اعجاز الحق کے!ضیاء الحق کے پروگرام میں بہاولپور کا دورہ شامل نہ تھا۔جنرل درانی نے کوشش کر کے ضیاء الحق کو بہاولپور بلایا اور ہمیشہ کیلئے رخصت کردیا۔بھٹو مرحوم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔رفیع رضا نامی پاکستانی نما امریکی وزیر اعظم پاکستان کا سیاسی مشیر بنا اور جونہی بھٹو کے اقتدار کی کشتی ڈگمگائی،رفیع رضا نے بستر باندھا اور اپنے اصل وطن لوٹ گیا۔یہ وہ لوگ ہیں جو حکمرانوں کے زوال کا باعث بنے۔ حقیقت میں یہ لوگ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہیں جنہیں سیاستدان اور حکمران اپنے اقتدار اور شہرت کے نشے میں دھت پہچان نہیں پاتے یا پھر مجبوراً ان کے ہاتھوں بلیک میل ہوجاتے ہیں۔

معین قریشی نامی امریکی پاکستان کا ایسا ہی وزیر اعظم تھا جس کے پاس نہ پاکستانی پاسپورٹ تھا اور نہ ہی شناختی کارڈ۔یہی حال شوکت عزیز کا تھا۔معین قریشی نے آتے ہی پاکستانی خزانے پر ڈاکہ ڈالا اور حکومت کے ذمے وہ قرضے جو دس بیس سال بعد چکانے تھے ایک ہی دن میں واپس کر کے خزانہ خالی کر گیا۔

شوکت عزیز نے ٹیکنیکل طریقے سے ملک لوٹا اور جرنیلوں سمیت کئی لوگوں کے خزانے بھر گیا۔شوکت عزیز نے لوٹ مار اور کرپشن کے نئے گر آزمائے اور ملک پر اربوں ڈالر کے قرضے چڑھا گیا۔بینکوں اور سٹاک مارکیٹ کے ذریعے ڈکیتی کے اس ماہر نے جاتے جاتے گندم، چینی اور سیمنٹ سمیت دیگر اشیاءِ خورد ونوش کا ایسا بحران پیدا کیا کہ ساری قوم کی چیخیں نکل گئیں۔

تم دُلا بھٹی کی بات پر تھی۔میں نے نینا سے کہا۔

ہاں!

دُلا بھٹی جیسے باجرأت کی بات کرتے کرتے شوکت عزیز جیسے ٹیکنیکل ڈاکو تک پہنچ گئی ہوں۔نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر کہنے لگی۔

صوبہ سرحد اس وقت چار حصوں میں تقسیم ہے۔ایک شہری حصہ ہے، دوسرا دیہاتی، تیسرا فاٹا اور چوتھا پاٹا۔ان چاروں حصوں پر کئی حکمران اپنی اپنی پسند کی حکمرانی کر رہے ہیں۔شہروں پر سیاسی پارٹیوں اور بیوروکریسی کی حکمرانی ہے۔دیہاتوں پر بڑے زمینداروں کی جو سیاستدان بھی ہیں۔فاٹا اور پاٹا پر سمگلروں، ملاؤں، طالبان اور دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیوں کی۔

فاٹا اور پاٹا گریٹ گیم کا فوکل پوائنٹ اور تیسری عالمی جنگ کا پہلا وار تھیٹر ہیں۔اسفندیار ولی، شیر پاؤ، ہوتی اور فضل الرحمٰن مفاد پرستی کی سیاست کے تو ماہر ہیں مگر کسی میں ایسی قابلیت نہیں کہ وہ اپنے عوام کی حفاظت اور فلاح کیلئے کچھ کر سکے۔صوبہ سرحد میں قیادت کا خلاء طالبان کمانڈروں اور لیڈروں نے پُر کیا ہے۔اگر یہ لوگ کٹرپن چھوڑ کر عام لوگوں کیلئے نرم رویہ اختیار کریں اور حالات کو جدید تقاضوں کے مطابق سمجھ کر انکا حل نکالیں تو صوبہ سرحد سے نہ صرف موروثی، کرپٹ اور مفاد پرستی کی سیاست کا خاتمہ ہو جائے بلکہ فاٹا اور پاٹا صوبے کا حصہ بنکر ایک نئے پاکستان کی تعمیر کی پہلی اینٹ اور مضبوط بنیاد ثابت ہوں۔

صوبہ سرحد کے عوام کو آج کسی فضل الرحمٰن، اسفندیار اور شیر پاؤ کی ضرورت نہیں بلکہ ایک خوشحال خان خٹک کی ضرورت ہے جو جدید تقاضوں کے تحت ایک نئے پختونخواہ کی بنیاد رکھے اور اپنے کردار، اخلاص، جرأت اور درویشی سے کرپشن اور مفاد پرستی کو جڑ سے اکھاڑ دے۔مجھے یقین ہے کہ پٹھان ماؤں کی کوکھ ابھی بانجھ نہیں ہوئی۔حکیم اللہ محسود اور منگل باغ حالات اور اغیار کی پیداوار ہیں جن میں جوش اور جرأت تو ہے مگر فہم و فراست، انسانی ہمدردی اور وطن سے محبت نہیں۔

ان لوگوں نے دین کی تشریح اپنی کم علمی اور کم عقلی کی بناء پر کر رکھی ہے اور اپنے مسلک کے تابع ان دیکھی بے دین، ملک اور قوم دشمن قوتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔خوشحال خان خٹک ایک لبرل انقلابی تھا۔آج سرحدی قبائل اور دیگر اقوام کو ایک ایسا ہی انقلابی چاہیے جو گاندھی کا پیروکار نہ ہو بلکہ قائداعظمؒ کی سوچ کا حامل سچا پاکستانی اور جوشیلا مگر مدبّر اور مخلص پختون ہو۔

جوش تو ہر پٹھان کے خون کا خاصہ ہے۔میں نے کہا۔

ہاں! مگر جوش جنوں اور جوش غیرت وحمیت میں فرق ہے۔جوش کی بنیاد بیوقوفی، ناسمجھی اور من گھڑت تاویلات پر رکھی ہو تو تباہی کا باعث بنتی ہے۔اگر جوش میں جذبہ ایمانی،قومی غیرت اور انسان دوستی کا عنصر شامل ہو تو اجڑی ہوئی دنیا پھر سے آباد ہو جاتی ہے۔نینا نے کہا اور پھر بولی۔

قائداعظمؒ سے بڑھ کر کون جوشیلا ہو سکتا ہے۔قائد کی تقریریں سنو تو حیرت ہوتی ہے کہ ان جیسا کوئی ایک بھی ہمیں نصیب نہیں ہوا۔ذوالفقار علی بھٹو بھی جوشیلے تھے مگر جوش کی بنیاد جذبات پر تھی۔جذباتی جوش وقتی ابال ہوتا ہے اور ایسا جوش صرف محفل گرمانے اور لوگوں کو ہپناٹائیز کرنے کے کام آتا ہے۔

شورش کاشمیری، ہٹلر اور چرچل بھی جوشیلے تھے مگر تینوں کے جوش وجذبے کی بنیاد الگ تھی۔

خوشحال خان تھا تو خٹک مگر آفریدیوں، اورکزائیوں، بنگشوں اور وزیریوں میں بھی یکساں مقبول تھا۔وہ شاعر، مفکر، مدبر، سیاستدان اور جنگجو لیڈر تھا۔اس کا جوش اور جذبہ غیرت ایمانی، وطن پرستی اور تعمیراتی فکر کے تابع تھا۔جس مٹی میں ایک خوشحال خان خٹک پیدا کرنے کی صلاحیت ہے وہ دوسرا اور تیسرا بھی پیدا کر سکتی ہے۔

تمہارا کہنا ہے کہ پہلا دور اکھاڑ پچھاڑ، کھوکھلے نعروں سیاسی دیوالیہ پن، کرپشن،، مہنگائی، بے حسی، بے مروتی، بے غیرتی، دہشت گردی، لاقانونیت، ضمیر فروشی، جاہلیت، جرائم اور جعلسازی سمیت ان گنت امراض قلبی وجسمانی کا دور ہے جس کا پاکستان اور پاکستانی شکار ہیں۔میں نے پوچھا۔

ایسا ہی ہے اور یہ دور بڑی تیزی سے اپنے انجام کی طرف بھاگم بھاگ ہے مگر نہ سیاست دانوں کو احساس ہے اور نہ ہی جرنیلوں، ججوں، مولویوں، پیروں فقیروں، گدی نشینوں سمیت کسی

بھی طبقہ فکر وفن کے کان پر جوں رینگنے کا خدشہ ہے۔المیہ تو یہ ہے کہ عوام بھی بے حسی کا شکار کسی معجزے کے منتظر ہیں۔

مذہب اور دین کا لبادہ اوڑھنے والے فرقہ پرستی کی وبا میں مبتلا ہیں۔ سیاست کی لگام نواز شریف، زرداری، فضل الرحمٰن، الطاف حسین، شجاعت حسین سمیت ایسے لوگوں کے ہاتھ ہے جن کے نہ ہاتھ صاف ہیں اور نہ ہی دامن پاک ہے۔ نینا نے جواباً کہا۔

اور فوج کہاں ہے؟ میں نے پوچھا۔

فوج دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مبتلا ہے، کچھ بیرکوں میں ہے اور تھوڑی سی بھارت کی طرف سے کسی ممکنہ کاروائی کیلئے کشمیر کے بارڈر پر ہے۔

جرنیل پیسہ کما رہے ہیں، ہاؤسنگ سکیمیں بن رہی ہیں اور بک رہی ہیں۔ جو جرنیل زیادہ خدمتگار ہوتا ہے اسے اتنا ہی بڑا پروجیکٹ ملتا ہے۔ مشرف ہی دیکھو کسطرح اپنے خادموں کو نوازگیا ہے۔ جن جن نے مشرف شاہ کے آستانے پر سجدے کئے انہیں جرنیلیاں تو ملیں مگر بعد میں سفیر اور امیر کبیر بھی بنا دیئے گئے۔

فوجی لوگ خود کہتے ہیں کہ فلاں پراپرٹی ڈیلر کا فلاں جرنیل سے تعلق تھا اور فلاں فلاں بنگلہ پراپرٹی ڈیلروں، انسانی سمگلروں اور دیگر جرائم پیشہ نے انہیں تحفے میں دی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے بھی اشارتاً کسی کور کمانڈر کا ذکر کیا ہے جسے پراپرٹی ڈیلر نے اربوں روپے کے فلیٹ دیکر کور کمانڈر ہاؤس کے سامنے کئی منزلہ عمارات تعمیر کرلیں۔ میں نے پوچھا۔

تارڑ نے اشارتاً ذکر اس لئے کیا چونکہ اسکے بیٹے کا سسر بھی جرنیل ہے۔ نینا نے جواب دیا۔

تارڑ نے تو لکھا ہے کہ اس کا سمدھی جرنیل بڑا ہی پرہیز گار، حاجی، نمازی اور غازی مجاہد ہے۔

ہاں! یہ تارڑ کا ادبی بلنڈر ہے اسے صرف حمید گل پسند نہیں۔ وہ سارے کرنل اور جنرل جو اُسے فوجی میس میں بٹھا کر کھلائیں پلائیں اور مفت جیپوں اور ہیلی کاپٹروں کی سہولیات فراہم کریں تارڑ کے ادبی آداب کے مطابق وہ سب نیک اور پرہیز گار ہیں۔

میں کہہ چکی ہوں کہ تارڑ میرا پسندیدہ رائیٹر ہے۔ تارڑ کو پتہ ہے کہ تیز مسالحہ کہاں لگانا ہے اور نرم اور ہلکی آنچ پر کیا پکانا ہے۔ تارڑ حالات کے بیان کا ماہر ہے اس کی تحریروں میں بوریت نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تتلیاں تلاشنے کا کام کیسے ہوتا ہے۔ تارڑ کمرشل رائٹر ہے اور وقت گزاری

کے لیے اچھا مواد تیار کرتا ہے۔ حرم پاک میں بھی تارڑ کو گندی جرابیں دکھائی دیں اور جبل نور پر بھی افغان بکریاں مل گئیں۔ جپسی اور مرسڈیز کی تو بات ہی الگ ہے۔ تارڑ اشکولے میں ہو یا چترال، خنجراب، رٹو، پسو یا پھر کسی ہوٹل، موٹل، کھنڈر، مسجد، محل اور مقبرے ہیں۔ تتلیاں تلاشنے میں دیر نہیں لگاتا۔

تم نے تو کہا تھا کہ تارڑ نے تمہیں رلایا بھی ہے۔ میں نے نینا کو یاد دلایا۔

ہاں! نینا نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

میں واقعی رو پڑی تھی جب وہ ایران کی ایک سڑک پر کسی بینک کی اوٹ میں اپنی بہنوں کیلئے خریدے ہوئے سویٹر، مفلر، فراک اور موزے بیچ رہا تھا۔ بہنوں کو بھائیوں پر بڑا مان ہوتا ہے۔ بھائی بہنوں کی آس امید کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ بڑی چاہتیں ہوتی ہیں بہنوں کے دل میں۔ میں بھی ایک بھائی کی بہن اور باپ کی بیٹی ہوں۔ تمہاری کوئی بہن نہیں اسلئے تم ایک بہن اور بھائی کے پیار کو محسوس نہیں کر سکتے۔

جب میں ان صفحات پر تھی جہاں وہ ترک کسٹم والوں کی بے حسی کا ذکر کر رہا تھا اور کئی دنوں سے بھوکا بھی تھا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا ویر کسی اجنبی دیس میں میرے لئے خریدے ہوئے تحفوں کی خاطر خستہ حال ہو رہا ہے۔ تارڑ بوڑھا ہو گیا ہے۔ بہنیں بھی اب بوڑھی ہی ہوں گی۔ شاید نانیاں دادیاں ہوں گی مگر جب بھی میرے دل میں تارڑ کی تحریر کا خیال آتا ہے مجھے ایک سانولا نوجوان اور اس کی چھوٹی چھوٹی بہنیں یاد آتی ہیں جو اپنے بھائی کے انتظار میں ایک دوسرے سے پوچھتی ہیں کہ لالہ مستنصر کب آئے گا۔

تارڑ اپنے سمدھی کو تو حاجی نمازی اور غازی جرنیل سمجھتا ہے مگر جنرل حمید گل کے سخت خلاف ہے۔ قلعہ جنگی پڑھ کر لگتا ہی نہیں کہ یہ تارڑ کی تحریر ہے۔ لگتا ہے یہ ناول رشید دوستم نے لکھ کر تارڑ کے نام سے شائع کروایا ہے۔ ایسا ناول تو حامد کرزئی بھی لکھ سکتا ہے جس میں حمید گل کے خلاف بغض کے سوا کچھ نہ ہو۔

تارڑ نے اس ناول میں لکھا ہے کہ حمید گل کے دفتر کے تہہ خانے میں ڈالروں کی بوریاں رکھی ہوتی تھیں جہاں سے اس کا ڈرائیور گرے پڑے ڈالر چن لیا کرتا تھا۔ تارڑ کی تحریر سے لگتا ہے کہ آئی ایس آئی ہیڈ کوارٹر کہیں پیرودھائی کے قریب سبزی منڈی میں ہے جہاں دفتروں کے باہر باسی سبزیوں کے ڈنٹھل اور پھلوں کے چھلکوں کی طرح ڈالر اور پاؤنڈ بکھرے پڑے ہوتے

تھے اور صبح صبح خاکروب، ڈرائیو اور چپراسی وغیرہ سوکھے سڑے ڈالر اٹھا کر لے جاتے اور آدھی قیمت پر بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔

ایسے ہی رشید دوستم کو قلعہ جنگی کے تہہ خانوں کی چھتوں پر پریڈ کرتے پیش کیا گیا ہے۔ تارڑ شائد بھول گیا کہ ظالم اور سفاک لوگ انتہائی بزدل ہوتے ہیں۔ وہ راتوں کو ویران قلعوں کی چھتوں پر مٹر گشت نہیں کرتے بلکہ آہنی حصار میں چوہے کی طرح چھپ کر رہتے ہیں۔

تارڑ نے اپنے شمالی علاقوں کے سفر کو دلچسپ اور رنگین تو بنایا ہے مگر تاریخی واقعات کی طرح بہت کچھ گول کر گیا ہے۔ تارڑ کے سارے سفر میں رسوں، پی ٹانوں اور ڈی رنگوں کا ذکر نہیں جن کے بغیر ایک کوہ نورد کا سفر ممکن ہی نہیں ہوتا۔ تارڑ کی ٹیم میں کھانا پکانے والوں اور فوٹو گرافروں کا ذکر تو ہے مگر پہاڑوں اور برفوں کا مزاج جاننے والے کھوجی کا ذکر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ تارڑ کے سفر ناموں کو خیالی اور افسانوی سفری داستانیں سمجھتے ہیں۔

تارڑ کی تحریر پیاس اور عتزاز احسن کو سندھ ساگر ایک ہی موضوع پر لکھی گئی ہیں مگر لذت اور ذائقہ الگ الگ ہے۔ دونوں کا موضوع وادی سندھ کی قدیم تہذیب ہے۔ سندھ ساگر میں تاریخی حوالے ہیں جن کی بنیاد پر ایک وکیل یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ سندھ کی تہذیب ہند کی تہذیب سے الگ ہے۔ سندھ کے لوگ پرامن، پرکشش، محنتی، محبّ وطن، مخلص اور باجرأت تھے۔ سندھ ساگر ایک ریسرچ ورک ہے جس میں اعتزاز احسن نے دلائل اور حوالے دیکر ثابت کیا ہے کہ موجودہ پاکستان قدیم سندھو تہذیب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔

سندھ ساگر کی بنیاد کتابی حوالہ جات اور آرکیالوجیکل ریسرچ پر مبنی ہے جس میں بوریت کا عنصر بھی شامل ہے۔ سندھ ساگر ایسی کتاب نہیں جسے سردیوں میں ہیٹر کے پاس بیٹھ کر یا رضائی میں لیٹ کر مزے سے پڑھا جائے۔ ایسی کتابیں بوقت ضرورت حوالوں کیلئے دیکھی جاتی ہیں۔

فرق کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

تارڑ کے ساگر کنارے ایک پاروشنی رہتی ہے۔ ایک مامن ماسا، سمروچیوا او بہت سے لوگ، پرندے، جانور اور دیگر مخلوق آباد ہے۔ زندگی بظاہر سادہ اور بے تکلف ہے مگر حسن وعشق کے معاملات بھی عروج پر ہیں۔ پاروشنی کا گاؤں ساگر کنارے ہے جہاں پرندے خودکشی کرتے ہیں۔

وہ کیوں؟ میں نے پوچھا۔

یہ جھیل صدیوں سے تھی جہاں دوسرے دیشوں سے آئے پرندے کبھی اترتے تھے جب ان پانیوں میں ٹھہراؤ تھا اور مچھلیاں تھیں۔ جہاں پرندے ڈاروڈار اترتے، ناچتے، گاتے اور مچھیاں کھاتے موسم کی تبدیلی کا انتظار کرتے اور پھر رت بدلتے ہی اپنے اپنے ڈاروں میں اڑتے واپس اپنے دیشوں کو لوٹ جاتے تھے۔

موسم بدلے تو پہلے جھیل خشک ہوئی۔ پرندے آئے تو جھیل خشک ڈھار بن چکی تھی۔ پرندوں نے عادت کے مطابق سر نیچے کیے اور جھیل میں غوطہ لگا دیا جہاں پانی کے بجائے پتھریلا میدان تھا۔ پرندے آتے رہے، غوطے لگاتے رہے اور مرتے رہے۔ پاروشنی کو ان کی موت کا دکھ تو تھا مگر کیا کرسکتی تھی سوائے اس منظر کو دیکھنے کے۔

مستنصر حسین تارڑ کی ہر تحریر میں ایک جھیل، کچھ مرغابیاں، تتلیاں اور ایک حسینہ ضرور ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا۔

یہ زندگی کے لوازمات ہیں۔ پانی، حیات، قدرت اور حسن۔ میں یہی کہہ رہی ہوں کہ اگر یہ لوازمات نہ ہوں تو پھر سندھ ساگر محض تمثیل بن جاتا ہے۔ ایک حوالہ، ایک واقعہ اور ایک دلیل رہ جاتا ہے۔

اعتزاز احسن نے تاریخ کی ترجمانی کی ہے اور مستنصر حسین تارڑ نے تاریخ لکھی ہے۔ وہ اینٹ، گھوڑے، کشتی، اوزار، ہل اور بیل کی اہمیت اور ضرورت کا احوال لکھتا ہے۔ تارڑ پاروشنی کے جسمانی خدوخال کا بیان یوں کرتا ہے جیسے ملکہ حسن کے مقابلے کیلئے کوئی حسینہ تیار ہو رہی ہو۔ وہ موہنجوڈارو کی تعمیر کے اس دور کی آگاہی دیتا ہے جب ایک نئی تہذیب کا آغاز ہو رہا تھا۔ آرین قدم جما رہے تھے اور ڈراویڈین مغلوب ہو کر بکھر رہے تھے۔ ان کے دشمن صرف آرین ہی نہیں بلکہ موسم بھی تھے۔ جھیلیں سوکھ رہی تھیں، دریا راستے بدل رہے تھے، جنگل صحرا بن رہے تھے اور کھیت کھلیان اجڑ کر ویران ہو رہے تھے۔

ڈراویڈوں کی پریشانی کے کئی معاملے تھے۔ وہ بیل جوان کا دیوتا تھا۔ وہ اسے کھلاتے پلاتے اور بھگوان سمجھتے تھے اور نئے آنے والے بیل کا گوشت کھاتے، اسکی پیٹھ پر بوجھ لادتے، ہل چلاتے، گہرے کنوؤں سے پانی نکالنے کیلئے چرخی گھماتے، گڈوں اور گاڑیوں کے آگے جوتتے تھے۔ بیل کی اس عجیب وغریب مصروفیت سے لوگ دنگ رہ گئے اور دیوتاؤں سے بیل کی مصیبتوں اور مشقتوں سے رہائی کیلئے دعائیں مانگتے تھے۔

ڈاروڈوں کے ہتھیار بھی برتنوں کی طرح آوے میں پک کر تیار ہوتے یا پھر لکڑی اور پتھر کے بنے ہوتے تھے۔ دور دیشوں سے آئے اجنبی لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر آتے اور بستیاں پائمال کر دیتے۔ جس طرح ٹینک اور مشین گن کی ایجاد سے جنگی میدانوں کا نقشہ بدل گیا ویسے ہی گھوڑے اور تلوار نے فتوحات کے نئے سلسلے کھول دیے۔ آرین تہذیب کی بنیاد گھوڑے، اینٹ، بیل اور تلوار نے رکھی جس کا احوال مستنصر حسین تارڑ نے پاروشنی کے لچک دار جسم پر کاڑھے بیل بوٹوں اور نقش ونگار پڑھ کر بیان کیا۔

تارڑ کی خاص بات لچکدار جسموں پر لکھے احوال کی تشریح ہے جیسے پاروشنی کے جسم پر سندھ کی تاریخ اور آرین کی آمد سے پہلے کی تہذیب کا مکمل احوال نقش تھا۔ گھوڑے والوں نے بستیاں اجاڑ دیں اور شہر بسائے، کنویں کھودے اور بیلوں کو پانی کی نکاسی پر لگا دیا۔ ہل چلائے اور نئے اور وسیع کھیت آباد کئے۔ دریاؤں نے رخ بدلے اور بارشوں کے سلسلے بھی تھم گئے۔ بستی والے کوچ کر گئے اور پوجا کے بیل جنھیں کوئی کام نہ آتا تھا بھوک سے مر گئے۔ پاروشنی کا سڈول جسم سوکھ کر ڈھانچہ بن گیا اور اسکے لچکدار جسم پر لکھی تاریخ کے نقش بھی مٹنے لگے تو چیوا اور سمرو جو کبھی اسکی جسمانی رفاقت کے متلاشی تھے بھی اپنی اپنی راہوں کو چل دیئے۔

پاروشنی کہاں گئی؟ میں نے پوچھا۔

پاروشنیاں کہیں نہیں جاتیں۔ جب ان کے جسم لچکدار اور سڈول ہوتے ہیں، ان کی چھاتیوں پر ابھار اور کولہوں پر ماس کی تہیں چڑھتی ہیں اور ٹانگیں بقول خوشحال خان خٹک کے ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہو جاتی ہیں تو کئی چیوے اور سمرو ان کی خوشبو پا کر قربت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ مٹی سے کھیلتی ہیں اور مٹی ان کے جسموں پر نقش ونگار بنا کر تہذیب کی تاریخ کاڑھ دیتی ہے۔ جب تک تہذیب میں دم رہتا ہے یہ تاریخ ایک سے دوسری پاروشنی کے جسم پر نقش ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر تہذیب کے زوال کی آخری نشانی بھی ایک پاروشنی ہی ہوتی ہے جو کہیں نہیں جاتی۔ وہ جائے بھی کیسے۔ اسے تو اپنی زمین میں ہی دفن ہونا ہوتا ہے چونکہ اس کے جسم پر تاریخ نقش ہوتی ہے۔ اگر وہ چلی جائے تو تاریخ اور تہذیب کے آثار مٹ جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو نئی تہذیب کی بنیاد کون رکھے۔

تارڑ کی تحریر میں پاروشنی ہے جس کے جسم پر تاریخ کا احوال اور تہذیب کے آثار نقش تھے۔ اعتزاز احسن اور دوسرے لکھاڑیوں نے ماہ وسال کے حساب لگا کر اس تہذیب کو تاریخ کے

سانچے میں ڈھال دیا جس کی بنیاد قیاس پر ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تارڑ کی تحریر زندگی ہے اور اعتزاز کی تحریر ایک کتاب ہے۔ تارڑ کی تحریر دین، مذہب، مندر، درگاہ اور خانقاہ سے مبرا ایک حقیقت ہے۔ اعتزاز کے ماہ وسال مفروضوں پر مبنی احوال ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

تم چار ادوار کی بات کر رہی تھی۔ میں نے نینا کو یاد دلایا۔

ہاں! نینا نے کچھ سوچا اور پھر بولی۔

پہلا دور گزر رہا ہے جس کا انجام بھیانک ہوگا۔ اس دور کی تاریخ میں سکندر مرزا، ایوب، یحیٰی، بھٹو اور ضیاء الحق کے کردار ثانوی حیثیت اختیار کر جائینگے۔ یہ تاریخ پرویز مشرف، زرداری، افتخار چوھدری اور جنرل کیانی کے کرداروں سے نقش ہوگی۔

پرویز مشرف اور اسکے سیاستدان جرنیل ساتھی اپنی نااہلی، بزدلی اور بے حسی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ زرداری اور گیلانی ٹولے کو نواز شریف اور جنرل کیانی کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کی مکمل حمائت حاصل ہے۔ زرداری کو کرپشن اور لوٹ مار کا لائسنس جنرل کیانی نے دے رکھا ہے جس پر عدلیہ نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

سوموٹو ایکشن تو لئے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔

تشہیر کی حد تک۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

دیکھو جج سوموٹو ایکشن لیکر فیصلہ کیوں نہیں کر پاتے۔ وہ بات کو لٹکاتے اور زرداری اور گیلانی کو موقع دیتے ہیں کہ وہ مزید کرپشن کریں، کسی نئے محکمے اور ادارے کو لوٹیں اور پھر عدلیہ کے خلاف جلوس اور ہڑتالیں کر کے ججوں کو دباؤ میں رکھیں۔ اگر عدلیہ دوٹوک فیصلے نہیں کرے گی اور معاملات کو لٹکا کر رکھے گی تو کوئی بھی مسلہ سلجھ نہیں پائے گا۔ اگر عدلیہ واقعی آزاد ہوتی تو گیلانی حکومت کے بہت سے وزیر مشیر ہی نہیں بلکہ گیلانی اپنے خاندان کے بیشمار افراد کے ہمراہ واپس جیل میں ہوتا۔

عدلیہ کو پتہ ہے کہ کرپشن کا مرکز صدارتی محل اور وزیراعظم ہاؤس ہیں۔ ہر کوئی اپنا ڈنگ ٹپا رہا ہے چونکہ اب ان لوگوں کو فوج کی طرف سے بھی خطرہ نہیں۔ بظاہر تو جنرل کیانی اور ان کے رفقاء تاریخ میں ایک مقام بنا رہے ہیں، نواز شریف فوج مخالف رویہ اپنا کر ایک بڑا جمہوریت پسند اور عوامی امنگوں کا ترجمان ہونے کی خود فہمی میں مبتلا ہیں مگر ان کو احساس نہیں کہ وہ ان لوگوں میں شمار ہو چکے ہیں جنھوں نے اس ملک کی تباہی اور قوم کی تذلیل میں اہم کردار ادا

کیا ہے۔

نواز شریف اور جنرل کیانی کی جمہوریت پسندی درحقیقت عوام دشمنی اور امریکہ نوازی ہے۔اس ملک کے عوام نے جرنیلوں سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے ماضی میں کیا کیا مگر آنے والے دور میں یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ جب معاملات بہتر تھے اور بڑے بلنڈر بھی نہ تھے تو تم نے اپنی چوہدراہٹ کی خاطر دس دس سال حکمرانیاں کیں اور جب زرداری اور گیلانی ٹولہ دونوں ہاتھوں سے ملک لوٹ رہا تھا تو تم جمہوریت نواز کیوں بن گئے۔

کسی دانشو کا قول ہے کہ ظلم پر خاموشی ظالم کی ہمنوائی کے مترادف ہے۔موازنہ کیا جائے تو ذوالفقار علی بھٹو، بینظیر اور نواز شریف کے ادوار میں حالات اتنے سنگین نہ تھے کہ مارشل لا لگائے جاتے۔ جی ایچ کیو، عدالتوں، اور اقتدار کے ایوانوں میں کیا ہوتا تھا کسی کو خبر نہ تھی۔ اخبارات کی سرکولیشن شہروں تک محدود تھی، ٹیلیویژن اور ریڈیو حکومتی کنٹرول میں تھا اور بی بی سی پر لوگ اعتماد نہ کرتے تھے۔ایک مخصوص طبقے کے علاوہ عام پاکستانیوں کو کامل یقین تھا کہ بی بی سی بھارت نواز پاکستان مخالف پراپیگنڈہ مشین ہے اور یہ کسی حد تک درست بھی تھا۔

آج پاکستان کی جو حالت ہے اس کا ذمہ دار جنرل پرویز مشرف اور اس کا ہمنوا جرنیلی اور سیاسی ٹولہ ہے۔فوج ہی کو لیں تو حیرت ہوتی ہے کہ جنرل کیانی کے بعد فوج میں ایسا جرنیل ہی نہیں جو فوج کی قیادت سنبھال سکے۔سوال یہ ہے کہ آخر ایسے لوگوں کو جرنیل کیوں بنایا گیا جو قیادت کے اہل نہ تھے۔ دینا کی ہر فوج کا اصول ہے کہ صرف اسی بریگیڈیئر کو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی جاتی ہے جو مستقبل میں فوج کا سپہ سالار بننے کا اہل ہو۔جنرل مشرف جو کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہ تھا اپنے دور اقتدار میں پروموشن مارکیٹ لگائی اور جرنیلوں کی ایک ایسی کھیپ پیدا کر دی جو اس عہدے اور مرتبے کے اہل نہ تھے۔اگر ایسا ہوتا تو جنرل کیانی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے باعزت ریٹائرمنٹ کو ترجیح دیتے۔ جنرل کیانی کو ایک پوری ٹرم کیلئے آرمی چیف کے عہدے پر برقرار رکھنا ایک ایسی پہیلی ہے جس کا بجھانا کسی کے بس میں نہیں۔ پاکستانی میڈیا امیچور بھی ہے اور امورل بھی۔بعض اوقات بولنے اور دیکھے جانے کے شوق میں میڈیا پرسن ایسے ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جو پوچھنے والے نہیں ہوتے یا پھر پوچھے جانے سے پوچھنے والے کا دیوالیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔

مثلاً۔۔۔۔۔۔۔۔میں نے پوچھا۔

میں ایک ٹیلیویژن چینل پر ایڈمرل شریف کا انٹرویو سن رہی تھی۔ ایڈمرل شریف نے کہا کہ 71-1970ء میں مشرقی پاکستان میں بہت سے ریٹائرڈ افسروں کو بھجوایا گیا۔

چونکہ ٹی وی اینکر کا ملٹری نالج محدود تھا اور جو تیاری وہ کر کے آیا تھا اس میں یہ بات شامل نہ تھی۔ ریٹائرڈ افسروں کا سنکر اینکر نے اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر دیا اور بار بار اس کے متعلق پوچھنے لگا جیسے فوج نے کوئی بڑا جرم کیا تھا اور مشرقی پاکستان کی شکست ان ریٹائرڈ افسروں کی وجہ سے ہوئی۔ اس اینکر کو پتہ نہ تھا کہ فوج کی پالیسی میں شامل ہے کہ ہنگامی حالات میں صرف افسر ہی نہیں ہر فوجی چاہے وہ کسی بھی رینک کا ہو اسے دفاع وطن کیلئے طلب کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو ضعیف، بیمار اور کسی ڈیوٹی کے قابل نہ ہوں انہیں چھوڑ کر باقی سبھی لوگ اپنی اپنی یونٹوں میں رپورٹ کرتے ہیں۔

اس انٹرویو کے دوران اینکر صاحب نے جذباتی انداز میں بار بار پوچھا کہ آپ کرپٹ اور نااہل جرنیلوں کو کیا مشورے دیتے تھے جو انھوں نے نہ مانے اور سانحہ مشرقی پاکستان بپا ہو گیا۔

اس اینکر کو علم ہی نہ تھا کہ وہ جس شخص سے انٹرویو کر رہا ہے وہ نیوی کا افسر ہے اور تب رئیر ایڈمرل تھا جس کا کام سمندری حدود کی حفاظت تھا نہ کے جرنیلوں کو مشورے دینا اور زمینی اور فضائی فوج کو لڑانا تھا۔

اس شوق اور جذبے کے تحت جنرل کیانی کی مدت ملازمت میں تین سالہ توسیع پر ہر طرح کی بحثیں اور سوالات ہوئے جن کا جواب دینے والے بھی ویسے ہی تھے۔ مثل مشہور ہے کہ جیسے مارنے والے ویسے ہی کھانے والے اور جیسے گانے والے ویسے ہی ناچنے والے۔

اس ناچ گانے نے تین باتوں کی وضاحت کر دی۔

اوّل جنرل کیانی کی مدت ملازمت میں تین سالہ توسیع زرداری حکومت کو پانچ سال تک برقرار رکھنے میں مدد کرنا اور امریکی مفادات کو تحفظ دینا ہے۔

دوئم عدلیہ کو بولڈ فیصلے کرنے اور سیاستدانوں کی کرپشن اور لوٹ مار پر سزائیں دینے سے باز رکھنا ہے۔

سوئم امریکہ کو افغانستان سے نکلنے میں مدد دینا اور زرداری کی اگلے الیکشن میں ناکامی کی صورت میں اسے جنرل مشرف اور شوکت عزیز کی طرح گارڈ آف آنر دے کر بحفاظت دبئی، لندن یا پھر فرانس بھجوانا ہے۔ اس وضاحت سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ فوج جمہوریت کو نہیں بلکہ

ایک کرپٹ نظام اور امریکی مفادات کی محافظ بن گئی ہے۔فوجی قیادت ایسے جرنیلوں پر مشتمل ہے جنھیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ جو کچھ وہ اچھا سمجھ کر کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اچھا نہیں بلکہ انتہائی مضر ہے۔

فوج، نواز شریف اور عدلیہ کا موجودہ رویہ زرداری اور گیلانی ٹولے سمیت کرپٹ مافیا کیلئے انتہائی سودمند ہے۔حکومت کو پتہ ہے کہ عدلیہ کے فیصلوں پر عمل درآمد نہ کرنے اور عدلیہ کی تضحیک کرنے پر فوج عدلیہ کا ساتھ نہیں دے گی اور جمہوریت کی اعلیٰ ترین اقدار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خاموش تماشائی بنے گی۔اگر عدلیہ نے زیادہ زور دکھایا تو آئین میں ایسی ترمیم کردی جائے گی جس سے عدلیہ کو کمزور اور باجگزار بنا دیا جائے گا۔

ایک طرف عدلیہ فوج اور نواز شریف کے رویے سے خائف بولڈ فیصلے کرنے سے کترا رہی ہے اور دوسری طرف فوج بھی اس بات سے خائف ہے کہ اگر زرداری حکومت پر ہاتھ ڈالا تو افتخار محمد چودھدری اور ان کے ساتھی جج جمہوریت نوازی کے شوق میں فوج کے کسی ممکنہ ایکشن کو سٹرائیک ڈاؤن کر کے فوج کو ذلیل و رسوا کر دینگے۔اگر زرداری اور گیلانی ٹولہ کسی ملٹری ایکشن کے تحت بے اقتدار ہو کر عدالتی فیصلے کی صورت میں پھر سے برسر اقتدار آ گیا تو نہ جرنیل سلامت رہینگے اور نہ ہی جج۔ملک میں جاری عدم استحکام اور دھشت گردی ایک ایسی جنگ میں بدل جائے گی جس سے بھارت، امریکہ، ایران او دوسرے ممالک فائدہ اٹھا کر پاکستان کے حصے بخرے کر دیں گے۔

ایران کیوں؟ میں نے پوچھا۔

بظاہر ایران افغانستان کی طرح ہمارا پڑوسی اور مسلمان ملک ہے مگر ایرانیوں اور افغانوں کا قدرتی جھکاؤ ہمیشہ بھارت کی طرف رہا ہے۔ بھارت روسی بلاک میں ہو یا امریکی بلاک میں ایران اور بھارت کی دوستی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ایران پاکستانی اہل تشیع مسلمانوں کی ہر طرح سے حمایت کرتا ہے اور پچھلی دو دہائیوں سے اہل تشیعوں اور دیوبندیوں کے درمیان کھلی جنگ چل رہی ہے۔دیوبندی، اہل حدیث اور وہابی فرقوں کے مسلک اور عقیدے میں انتہائی قربت ہے جن کی حمایت سعودی عرب کرتا ہے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ سعودی اور ایرانی اپنے مسلک کی لڑائی پاکستانی سرزمین پر لڑ رہے ہیں مگر پاکستان کی معاشی، دفاعی اور سیاسی مجبوریاں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ کھل کر

ان ممالک سے بات کرے اور ملک میں جاری فرقہ واریت اور دہشت گردی کے خلاف ٹھوس قدم اٹھائے۔ ان مجبوریوں کا واضح ثبوت کسی دھشت گرد کو عدالت سے سزا نہ ہونا ہے چونکہ پولیس تفتیش کے دوران مختلف وجوہات کی بنا پر ایسا کیس تیار کرتی ہے جس سے مجرم کو عدالت سے سزا نہیں ہوسکتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انٹیلجنس ایجنسیاں پراسیکیوشن کے غیر تسلی بخش اور ادھورے نظام کی وجہ سے مشکوک لوگوں کو سامنے لانے سے کتراتی ہیں اور ملک میں گمشدہ افراد کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اگر پولیس تفتیش صحیح اور درست سمت پر ہو اور اصل مجرموں کو عدالتوں سے سزا ملے تو کوئی وجہ نہیں کہ گمشدہ افراد کا قضیہ بھی حل ہو جائے۔

خدا نہ کرے اگر ملک میں ایسی بحراتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو ایران اور سعودی عرب اپنے ہم مسلکوں کو ترجیح دینگے جس سے بھارت اور افغانستان میں بیٹھے اتحادی کھل کر فائدہ اٹھائینگے جو ملک کی سلامتی کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا۔

مگر نینا پاکستان میں تو اس جھگڑے کا نام شیعہ سنی فساد ہے۔ میں نے کہا۔

ہاں! سبھی شیعہ سنی فساد یا جھگڑا ہی کہتے ہیں مگر حقیقت میں یہ شیعہ اور دیوبندی مسلک کا جھگڑا ہے جنہیں وہابی اور اہل حدیث مسالک کی بھی حمایت حاصل ہے۔ حقیقت میں سنی بریلوی مسلک ہے جن کا عقیدہ اہل تشیع سے قریب تر ہے۔ شیعہ اور سنی یعنی بریلوی مسالک میں بہت سی اقدار مشترک ہیں۔ مثلاً دونوں کا عقیدہ سفر معراج النبی ﷺ ایک ہے کہ یہ جسمانی معراج تھی جبکہ دیگر اسے خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح نور و بشر، حاضر و غیب، ظہور امام مہدیؑ، ولّی اور ولائت جیسے مسائل ہیں جن پر دیوبندیوں، وہابیوں اور اہل حدیث والوں کو شیعوں اور بریلویوں سے یکساں اختلاف ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ فوج اور عدلیہ انتہائی مشکل میں ہے جبکہ اس مشکل سے زرداری گیلانی ٹولہ ہی نہیں بلکہ امریکہ اور دیگر بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

ہاں! 2010ء اور 2011ء کی یہی سچائی ہے نینا نے جواب دیا اور پھر کہنے لگی کہ تم اسے گیلانی زرداری نہیں بلکہ گیلانی، زرداری اور چوہدری ٹولہ کہہ سکتے ہو جنہیں الطاف حسین، فصل الرحمن اور اسفندیار ولی کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ فوج اور عدلیہ میں بداعتمادی کی فضا ہے جس سے کرپٹ عناصر جمہوریت کی آڑ میں فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ملک کو لوٹ رہے ہیں۔

نینا یہ کیسی جمہوریت ہے۔ ملک کا صدر اور وزیر اعظم ہی ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ سٹیل مل اور

رینٹل پاور منصوبے میں صدر اور وزیراعظم کے قریبی دوست اور فرنٹ مین مال بنا رہے ہیں۔ پی آئی اے کو تباہ کرنے والا صدر کا آدمی ہے۔ اور ریلوے کا بیڑہ غرق کرنے والے حکومت کے حامی ہیں۔ حج کرپشن میں وزیراعظم کے حمایت یافتہ لوگ شامل ہیں اور یہی حال دیگر محکموں اور کارپوریشنوں کا ہے۔ اپوزیشن نمائشی احتجاج کرتی ہے اور فوج خاموش تماشائی ہے۔ عدلیہ اس خوف سے فیصلہ نہیں کرتی کہ حکومتی ارکان اور حمایت یافتہ وکیل نہ صرف ان فیصلوں کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ ان پر عمل درآمد کے بجائے عدلیہ کی تحلیل کی دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔ حکومت اور اپوزیشن ملکر آئین میں ایسی تبدیلیاں لا رہے ہیں جس کے تحت عدالتوں کا مینڈیٹ محدود کر کے اسے پارلیمنٹ کے تابع فرمان بنایا جا رہا ہے۔

کیا ان حالات کا تجزیہ کرنے کیلئے کسی دانشور کی ضرورت ہے؟ ہر آدمی حکومتی کرپشن، فوج کی خاموشی اور عدلیہ کی بے بسی سے واقف ہے مگر نواز شریف اور چوہدری ٹولہ اسے جمہوریت تصور کئے ہوئے اسکا نہ صرف حمایتی ہے بلکہ اس کے تسلسل کا واحد حامی اور مددگار بھی ہے۔

میرے اس سوال پر نینا نے کہا۔

کیا تم نے انوار سہیلی پڑھی ہے۔

انوار سہیلی یا انوار کی سہیلی۔ میرے سامنے تو فی الحال تم ہی بیٹھی ہو اور تمھیں پڑھنا مشکل ہے۔ میں نے کہا۔

یہ ایک کتاب ہے جس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ جیسے الف لیلیٰ، ہزار داستان وغیرہ۔

اس کتاب میں خاص کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

اس میں خاص یہ ہے کہ بات ختم نہیں ہوتی بلکہ بات سے بات نکلتی ہے۔ پند و نصائح کا ایسا سلسلہ ہے جو حکمرانوں کی تربیت اور حکمت کا خزانہ ہے۔ میرے بس میں ہو تو ہر سیاستدان اور حکمران کو انوار سہیلی پڑھنے کا مشورہ دوں تا کہ ان کے دلوں پر چھایا دولت اور لوٹ مار کا غبار کم ہو۔

تم جن چار ادوار کی بات کر رہی تھی اس کا انوار سہیلی سے کیا تعلق ہے۔ تمھاری انوار سہیلی سے پرویز مشرف کی روشن خیالی، زرداری کی خوشحالی، گیلانی، الطاف حسین، فضل الرحمٰن، شجاعت حسین اور نواز شریف کی خام خیالی، جمہوری جلالی، کمالی اور جمالی مراد تو نہیں؟

جلالی، کمالی اور جمالی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ نینا نے میرا ہی سوال دہرایا۔

گیلانی اور نواز شریف جمالیاتی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ گیلانی صاحب اپنے ذوق کی تسکین کیلئے سرکاری پیسہ خرچتے ہیں جبکہ نواز شریف اپنے پیسے پر حسن و جمال کی تراوٹ سے اپنے ذوق کو تر کرتے ہیں۔ الطاف حسین جلالی طبیعت رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ جلالی کیفیت میں بیان کرتے ہیں ان کے مریدین کمال فنکاری سے اسکی تشریح کرتے ہوئے اسے الطاف بھائی کا وژن قرار دیتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن دنیا کا واحد مولوی ہے جو نہ جلالی ہے نہ جمالی۔ ملاں ہمیشہ جلال میں رہتا ہے مگر الطاف حسین کی طرح خیال نہیں کھوتا بلکہ جلال کو ہمیشہ خیال کے تابع رکھتا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن پاکستانی سیاست کا کمال خان ہے جس کی کمالی سیاست جیالوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔ شجاعت حسین بھی کمالی ہیں ان کی سیاست کا کمال یہ ہے کہ وہ وسیع تر ملکی مفاد میں مارشل لاء والوں سے لے کر کانگریس اور ٹوری پارٹی تک اتحاد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں تاکہ ذاتی اور خاندانی مفادات پر آنچ نہ آئے۔

میرے اس جواب پر نینا نے کہا۔

جو تم نے کہا یہ پاکستانی سیاست ہے اور انوار سہیلی کی کہانیاں اس کا توڑ ہیں۔ اس کتاب میں کہیں روشن خیالیاں ہیں، کہیں جمالیاں، کمالیاں، جلالیاں اور پھر بدحالیاں اور بے حالیاں بھی ہیں اور ان سے بچنے کے طریقے اور نسخے بھی۔ یہ کتاب ''ارتھ شاستر اور دی پرنس'' کا توڑ ہے۔

یہ پہلا دور ختم کب ختم ہوگا؟ میں نے پوچھا۔

جب پاکستان کے بسنے والوں میں ذمہ داری کا احساس ہوگا، جب وہ جھوٹے اور کھوکھلے سیاسی نعروں اور لٹیرے سیاستدانوں کو مسترد کر دینگے، جب بیوروکریسی کے ظالمانہ، حاکمانہ اور بے رحمانہ رویے کے خلاف بغاوت ہوگی، جب پٹواریوں اور تھانیداروں کو چوراہوں میں جوتے مارے جائینگے اور وہ چیخ چیخ کر بتائینگے کہ وہ عوام کو باہم لڑا کر، جرائم کے ہتھکنڈوں سے پیسہ کما کر کس تحصیلدار، ڈپٹی کمشنر اور سیکریٹری کو دیتے رہے ہیں، جب عدل نہ کرنے والے ججوں کو عدالتوں سے اٹھا کر باہر پھینکا جائے گا، جب جرنیلوں سے انکے پلاٹوں، وسیع زرعی فارموں، اور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائیٹیوں میں عالیشان بنگلوں کا حساب لیا جائے گا، جب کرپٹ سیاستدانوں، بیوروکریسی اور ان کے ہمنواؤں کی کرپشن کا حساب لیا جائے گا۔

لگتا ہے تم نے حسن نثار کا کوئی تازہ کالم پڑھا ہے؟ میں نے کہا۔

نہیں۔

مگر کیوں؟ نینا نے حیرت سے پوچھا۔

حضرت حسن نثار اپنے کالموں اور ٹی وی پروگراموں میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔میں نے جواب دیا۔۔

میں حسن نثار کو نہیں پڑھتی اور نہ ہی کبھی ٹی وی پر دیکھا ہے مگر یہی سچائی ہے۔

دوسرا دور درحقیقت خودفہمی اور خوش فہمی کے شکنجے سے نکلتے ہی شروع ہوگا اور یہ خونی دور ہوگا۔نینا نے کہا۔

پہلے تھوڑا خون بہا ہے۔اب اس کی گنجائش نہیں۔میں نے کہا۔

جب قومیں عقل سے عاری ہوجائیں، انسانوں کو حیوانوں کی طرح ہانکا جائے تو قدرت انھیں خون سے نہلا کر عقل کے تابع کرتی ہے تاکہ انسان اور حیوان کے خون کی پہچان ہو۔

تمہارا کہنا ہے کہ اب ہم انسانی درجے سے بھی گر گئے ہیں۔میں نے کہا۔

ہم انسان نما بے حس حیوان ہوگئے ہیں۔ ویسے تو ٹیلیویژن پر، اخباروں ،تقریروں، سیمیناروں اور اسمبلیوں کے فلور پر ہمارے ہانکے اور آجڑی ہمیں باشعور، جمہوریت پسند اور غیور قوم کہہ کر مزید ہانکا ہانکی اور خرید وفروخت کیلئے تیار کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نہ ہی عقلمند اور باشعور قوم ہیں اور نہ ہی غیور۔اٹھارہ کروڑ انسانوں میں اگر دس بیس لاکھ بھی اس معیار پر اتریں تب بھی یہ قوم نہیں بنتی۔کنویں میں اگر کتا گر جائے تو اسے پاک کرنے کیلئے پچاس فیصد پانی نکالا جاتا ہے۔تصور کیا جاتا ہے کہ ایک عام کنویں میں پانچ سو ڈول پانی ہوتا ہے اگر ڈھائی سو ڈول نکال دیا جائے تو پانی پاک تصور ہوتا ہے۔اب اٹھارہ کروڑ کے کنویں کی صفائی کیلئے کیا کرنا چاہئے اس کا جواب جناب افتخار محمد چوھدری اور اشفاق پرویز کیانی ہی دے سکتے ہیں چونکہ ڈول کی رسی ان کے ہاتھ میں ہے۔سیاست دان لگاتار کرپشن اور لوٹ مار کے کتے اس پاک کنویں میں ڈال رہے ہیں اور جس قدر لوٹ مار کر رہے ہیں اس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی۔

اگر ہم باشعور اور عقلمند قوم ہوتے تو کبھی زرداری، گیلانی، نواز شریف، الطاف حسین، مولانا فضل الرحمٰن، اسفند یار ولی، چوہدری برادران اور شیر پاؤ جیسے لوگوں کو نہ لیڈر مانتے اور نہ ہی انہیں ووٹ دیکر کرپشن، لوٹ مار، افراتفری، قتل وغارت گری، بے ہودگی، بدکلامی اور بے حسی کا

لائسنس جای کرتے ۔ باشعور اور جمہوریت پسند اقوام صرف ووٹ ہی نہیں دیتیں بلکہ ووٹ کا حساب بھی لیتی ہیں۔ پاکستانی قوم کو ہانکنے والوں نے تصور کرلیا ہے کہ ووٹ لینا انکا حق ہے او رووٹ دینا عوام کا فرض ہے۔ ایک بار منتخب ہوجانے کا مطلب مطلق العنانیت، لاقانونیت، دھونس، دھاندلی، کرپشن، دھشت گردی اور غنڈہ گردی کا مکمل اختیار دینا ہے۔

تمھارا کہنا ہے کہ سیاستدانوں میں بھی دہشت گرد ہیں۔ میں نے کہا۔

پاکستان میں ہر سیاستدان دہشت گرد ہے۔ نینا نے جواب دیا۔

تم نے بہت بڑا الزام لگایا ہے جس کا حق صرف امریکہ کو ہے۔ کیا تم اس کی وضاحت کرو گی۔ میں نے پوچھا۔

ہاں کیوں نہیں۔ نینا بولی۔

دیکھو پہلے ہمیں دہشت گردی کی تشریح کرنا ہوگی اور اس کے معنی تلاش کرنے ہوں گے۔ نینا نے بات کرتے ہوئے کہا اور پھر کہنے لگی۔

دہشت، خوف، ڈر اور گھبراہٹ ہم معنی الفاظ ہیں۔ گھبراہٹ کم درجے کا ڈر ہے اور ڈر کم درجے کا خوف ہے۔ ایسے ہی خوف کم درجے کی دھشت ہے جس کا احساس تو ہمہ وقت رہتا ہے مگر بپا ہونے کے وقت کا علم نہیں ہوتا کہ دھشت گرد کس وقت، کس جگہ اور کس طریقے سے کیا کاروائی کرے گا اور اس کا کتنا نقصان ہوگا۔

اگر ہم اس کی مزید شرح کریں تو دہشت گرد ایک ایسا انسان، حیوان یا پھر آلہ ہوسکتا ہے جسکے ذریعے دہشت، خوف، ڈر یا پھر متاثر ہونے والے انسانوں اور حیوانوں کے دلوں اور دماغوں میں گھبراہٹ کی کیفیت طاری رہے اور غیر محفوظ ہونے کا احساس ہر لمحہ بیدار رہے۔ جن جنگلوں میں درندے پائے جاتے ہیں وہاں دیگر جاندار ہمہ وقت دہشت اور خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور انہیں ہر وقت الرٹ اور ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ اس لئے نہیں کہلاتا کہ وہ اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ شیر کی درندگی، خونخواری، اچانک نمودار ہوکر حملہ آور ہونے کی خصلت اور جنگل میں موجودگی کی دھشت درحقیقت اس کی بادشاہی کا سبب ہے۔

آجکل جس اصطلاح کا چرچا ہے اسکی بنیاد بھی یہی ہے کہ کچھ لوگ خودکش حملہ آوروں کی صورت میں یا پھر ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے اور گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں میں یا پھر مختلف طریقوں سے دھشت گردی کے آلات اور بارودی مواد رکھ کر عام انسانوں اور ان کی

املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں جس بنا پر انہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے۔

اب ذرا سیاستدانوں، ججوں اہل قلم حضرات جنہیں ہم صحافی، دانشور اور دانشمند کہتے ہیں اور بیوروکریسی جس میں سول اور ملٹری دونوں شامل ہیں کی طرف آتے ہیں۔

سیاستدان کون ہیں؟

پاکستان کے تمام گدی نشین حضرات جو کہ صاحبزادے، مخدوم اور پیر کہلاتے ہیں۔ سیاست گری کا پیشہ بھی اختیار کئے ہوئے ہیں چونکہ ان کے پاس انگریز سرکار کی طرف سے دی گئی وسیع زمینیں، جائیدادیں اور دیگر مال و متاع ہے جس کی حفاظت کے علاوہ خودنمائی کیلئے ضروری ہے کہ ان کے پاس کوئی حکومتی عہدہ اور پروٹوکول بھی ہو۔ یہی حال علماء اور صوفیاء کا بھی ہے۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو خود کو صوفی اور عالم کہتے ہیں جیسے مولانا فضل الرحمٰن، یوسف رضا گیلانی، سردار عبدالقیوم، مولانا سمیع الحق اور دیگر۔۔۔۔۔۔

سیاستدانوں کی دوسری قسم جاگیرداروں، سرداروں، بڑے زمینداروں، کارخانہ داروں، نو دولتیوں اور اَن دیکھی قوتوں کے سہارے چلنے والی جماعتوں اور کاروباری لوگوں پر مشتمل ہے۔

جاگیردار، زمیندار اور سردار جبر کی پیداوار ہیں۔ انہیں جاگیریں، سرداریاں اور وسیع زمینیں کسی نہ کسی حکمران کی خدمت کے صلے میں ملی ہیں جس پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اَن دیکھی قوتوں کے سہارے چلنے والی سیاسی مشینری کا ملک اور قوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی ڈوریاں کسی دوسرے ملک سے ہلائی جاتی ہیں اور جب ڈوری ہلانے والے ہاتھ ڈوری چھوڑ دیں تو ایسی سیاسی قوتوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی پیشہ وری سے منسلک تیسرا طبقہ نو دولتیوں پر مشتمل ہے جن میں چور، ڈاکو، لٹیرے، سمگلر، نوسرباز، قومی خزانہ لوٹنے والے بیوروکریٹ، ٹھیکیدار، فرنٹ مین، سیاسی خدام، منشیات فروش، جرنیل اور صحافی شامل ہیں۔

اس سے پہلے کہ تم اپنی بات مکمل کرو، تین چیزوں کی وضاحت کردو تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ میں نے کہا۔

کونسی تین باتیں؟ نینا نے سوال دہرایا۔

اَن دیکھی قوتوں کے سہارے سیاست کرنے والے افراد اور جماعتیں، سیاسی خدام، صحافی اور جرنیل۔

میں نے کہا۔

نینا نے ہنستے ہوئے کہا۔'' جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے۔ باغ تو سارا جانے ہے۔''

اس کا مطلب۔ میں نے پوچھا۔

سنو! ایم کیو ایم بظاہر ایک بڑی سیاسی قوت ہے ۔ یہ جماعت اس لئے جذباتی اور آتشیں ہے چونکہ اس کا وجود آتش فشاں کے دہانے پر قائم ہے جسے الطاف بھائی نے اپنی ذات سے ڈھکا ہوا ہے۔ جس دن الطاف حسین نہ ہوا آتش فشاں کا ڈھکن کھل جائے گا اور ایم کیو ایم کے ساتھ کراچی بھی جل جائے گا۔

الطاف حسین لندن میں مقیم ہے اور ایک ایسے ملک میں بیٹھ کر پاکستان میں ایک ایسی سیاسی جماعت چلا رہا ہے جو بادشاہ گر ہے۔ پاکستان کے ابتر سیاسی حالات میں ایم کیو ایم، اے این پی اور جمعیت علماء فضل الرحمٰن تین ایسے مہرے ہیں جو بادشاہ بناتے اور بادشاہت گراتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایم کیو ایم کا مفاد اجتماعی ہے اور باقی دو کا ذاتی۔ ایم کیو ایم حکومتوں سے جو کچھ لیتی ہے اسے اپنی جماعت اور کراچی پر خرچ کرتی ہے۔ اگر جماعت میں تفرقہ پڑ جائے یا پھر کراچی میں ترقی کا پہیہ جام ہو جائے تو ایم کیو ایم کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

ایم کیو ایم اپنے ورکروں، ووٹروں اور قائدین کا تحفظ کرتی ہے اور ان کی ویلفیئر پر خرچ بھی کرتی ہے۔ ایم کیو ایم بیک وقت کئی محاذوں پر لڑتی ہے ۔ کہیں وہ آگے بڑھ کر حملہ آور رہوتی ہے اور کہیں وہ دفاعی پوزیشن اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں وہ نفوذ کر کے اچانک حملہ آور ہو جاتی ہے اور قدم جمانے کیلئے جائز و ناجائز میں فرق نہیں کرتی اور کہیں وہ خاموشی سے پسقدمی کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

ایسی جماعت جو ایک مسلمان ملک میں حکومتیں بنانے اور گرانے کی پوزیشن میں ہے مکمل سیکولر نظریات کی حامل ہے۔ اس کا قائد اور سیاسی قوت کا مرکز ایک ایسے ملک میں ہے جسے پاکستان کے وجود سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ پاکستان مخالف قوتوں کا ہمیشہ سے ہی حامی و مددگار رہا ہے۔

برطانوی میڈیا ہمیشہ بھارتی مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور پاکستان مخالف قوتوں کا ترجمان بن جاتا ہے ۔ برطانوی حکومت اور میڈیا اگر غیر جانبدارانہ رویہ اختیا کریں تو پاکستان اور بھارت کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں چونکہ یہ مسائل خود برطانیہ ہی کے پیدا کیے

ہوئے ہیں۔ برطانیہ چاہتا تو روز اوّل سے ہی مسئلہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی باعزت حل نکل آتا اور برصغیر میں بسنے والے ڈیڑھ ارب انسان اپنی محنت کی کمائی جنگوں پر خرچ کرنے کے بجائے اپنی خوشحالی پر خرچ کرتے تو آج دونوں ملک نہ صرف اچھے پڑوسی بلکہ خوشحال بھی ہوتے۔ ایسا ملک جس کی حکومت اور عوام کا پاکستان جیسے ملک کیساتھ واجبی رویہ ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ملک کی دوسرے درجے کی شہریت کے حامل شخص کے ہاتھ میں پاکستان کی سیاسی لگام بھی ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ لگام الطاف بھائی نے خودنہیں بلکہ برطانیہ اور امریکہ نے تھام رکھی ہے۔ الطاف بھائی جب بھی امریکہ کی مرضی کیخلاف کوئی فیصلہ کرینگے تو برطانیہ انہیں اپنے شہری ہونیکی حیثیت سے نہ صرف پاکستان میں سیاست گری سے روک دے گا بلکہ ان پر برطانیہ میں رہنا بھی مشکل کردیگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ برطانیہ، بھارت اور امریکہ ایم کیو ایم، اے این پی اور جمعیت فضل الرحمٰن کے ذریعے پاکستانی سیاست اور حکومت سے کھیلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن اور اسفند یار ولیّ پاکستان میں رہتے ہیں مگر کام وہی کرتے ہیں جو الطاف بھائی لندن میں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ امریکہ ایم کیوایم کو برطانیہ کے ذریعے، اے این پی کو بھارت اور جمعیت کو سعودی عرب کے ذریعے کنٹرول کرتا ہے۔

تمہارا کیا خیال ہے کہ باقی سیاسی جماعتیں دودھوں نہائی ہیں۔ ان میں صرف پاکستانیت بھری ہے ان پر امریکہ کا کوئی اثرنہیں۔ میں نے کہا۔

تم نے جو پہلے سوال پوچھے تھے ابھی ان کا جواب مکمل نہیں ہوا اور تم نے پھر نیا محاذ کھول دیا ہے۔ نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔

ایسا نہیں۔ نواز شریف نے ایٹمی دھماکہ کیا اور امریکی پابندیوں کا دباؤ بھی برداشت کر لیا تو اسے مشرف کے ذریعے بے اقتدار کرکے جلاوطن کر دیا گیا۔ نواز شریف ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی طرح نہ جاگیردار ہے اور نہ ہی سیاستدان۔ نواز شریف کاروباری آدمی ہے اور اسے پتہ ہے کہ کونسا کام کس وقت کرنا ہے۔ بھٹو کو سعودی عرب نے مولانا مودودی مرحوم کی وساطت سے جلا وطنی کی آفر دی تھی مگر بھٹو کو عوام اور ان دوستوں پر بھروسہ تھا جنہیں انھوں نے کئی بار ذلیل و رسوا کیا تھا۔ بھٹو کو زعم نے مروادیا۔ اگر بھٹو سعودی عرب کی آفر قبول کر لیتے تو نہ صرف جان بچا لیتے بلکہ ملک لوٹا مارکہ سیاستدانوں اور سٹے بازوں سے بھی بچ جاتا۔

بھٹو، نواز شریف اور بینظیر بھٹو نے امریکہ اور امریکہ نواز بیوروکریسی کی حکم عدولی کی جس کا

نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ چوہدریوں نے بھی بیانات کی حد تک سیاسی جھولا جھولنے کی کوشش کی تو انہیں امریکی ایئرپورٹ پر نہ صرف کپڑے اور جوتے اتارنے کی سزا دی گئی بلکہ واپس برطانیہ بھجوا دیا گیا۔ جونہی چوہدریوں نے امریکی تابعداری کا سابقہ ٹریک بحال کیا تو امریکی سفیر ان کے گھر پہنچ گئی اور شاباشیوں کا منقطع سلسلہ پھر سے بحال ہوگیا۔

تمہارا مطلب ہے کہ امریکی کچھ کام براہ راست کرتے ہیں اور باقی چھوٹے موٹے معاملات سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت اور برطانیہ سے حل کروالیتے ہیں۔ میں نے کہا۔

بلکل سچ۔ نینا نے جواب دیا۔

پھر کہنے لگی۔

ہر امریکی حکومت کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اور ان ترجیحات کا تعین سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور پینٹا گان امریکی خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے کرتی ہے۔ یہ ترجیحات امریکی مفادات کا تحفظ کرتی ہیں جس میں دوستوں اور دشمنوں کے معاملات سے لیکر اشخاص کے افعال و کردار تک کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ امریکیوں کو پاکستان پر زیادہ کام اس لئے نہیں کرنا پڑتا چونکہ پاکستانی سیاستدان اور بیورکریسی خود امریکہ کیلئے کام کرتی ہے۔ امریکیوں کی طرف سے شاباشی پاکستانی اشرافیہ، سیاسی جنتا اور بیوروکریسی کیلئے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔

شائد یہی وجہ ہے کہ امریکی پاکستان کے سارے معاملات پر وقت ضائع نہیں کرتے اور یہ کام اپنے ان اتحادیوں کے ذمے لگاتے ہیں جن پر ان کا مکمل بھروسہ اور اعتماد ہے۔ ایران میں جب تک بادشاہت تھی امریکہ نے ایران اور اردن کو پاکستانی معاملات کا ٹھیکہ دے رکھا تھا۔ ایرانی انقلاب کے بعد یہ ذمہ داری اردن اور سعودی عرب کے کندھوں پر آن پڑی۔

شاہ حسین کی وفات کے بعد سعودی عرب، برطانیہ اور عرب امارات کے شیوخ نے پاکستان کا مشترکہ ٹھیکہ لیا چونکہ افغانستان میں سویت یونین کے خلاف جہاد کیلئے تنہا سعودی عرب اربوں ڈالر دینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب نے ملکر امریکی پالیسیوں کو افغانستان میں پائیہ تکمیل تک پہنچایا جس پر اربوں ڈالر خرچ ہوئے۔ روس افغان جنگ کے متعلق بہت سے تجزیہ کار اس حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے اس جنگ کو مغرب اور امریکہ کی جنگ کہتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کے اخراجات سعودی عرب اور عرب امارات نے

برداشت کیئے۔ چین، ترکی اور مصر نے بھی اس جنگ سے فائدہ اٹھایا اور اپنے ڈپوؤں میں پڑا روسی اسلحہ مہنگے داموں بیچ کر اربوں ڈالر کمائے۔ امریکی چاہتے تھے کہ جو اسلحہ روسی افواج مجاہدین کے خلاف استعمال کر رہی ہیں ویسا ہی اسلحہ وسامان مجاہدین کو دیکر دنیا کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ اسلحہ اور گولہ بارود مجاہدین نے روسیوں سے چھینا ہے۔۔

امریکہ نے اس تاثر کو حقیقت میں بدلنے کیلیئے ترکی اور مصر کے پاس موجود روسی ہتھیار عربوں کی دولت سے خرید کر افغان مجاہدین کے حوالے کر دیے جس سے مجاہدین کو دو اہم اور فوری فوائد حاصل ہوئے۔

اوّل: افغان آرمی سے بھاگے ہوئے ہزاروں عساکر اور افسر جنہیں روسی اسلحہ چلانے کی مکمل تربیت تھی ان کیلیئے بغیر کسی ٹرینگ کے اپنے حریف سے مقابلہ کرنا آسان ہوگیا۔

دوئم: مجاہدین چونکہ اپنے علاقے سے بخوبی واقف تھے اس لئے اس اسلحہ کو روسیوں کی نسبت بہتر اور موثر طریقے سے استعمال کرنے لگے جس کی وجہ سے روسی حواس باختہ ہو کر چھاؤنیوں تک محدود ہو گئے۔

مجاہدین کے مقابلے میں روسی فضائیہ اور آرمر کو سبقت حاصل تھی جس کے توڑ کیلیئے امریکہ نے سویڈن سے اینٹی ٹینک میزائل اور اپنے اسلحہ خانے سے سٹنگر میزائل محدود پیمانے پر سپلائی کیئے جس کے موثر استعمال سے روسی فضائیہ اور ٹینک بردار دستوں پر بھی مجاہدین حاوی ہو گئے۔

بعض پاکستانی اور مغربی تجزیہ نگاروں کی رام کہانیاں سنی اور پڑھی جائیں تو یہ تاثر ملتا ہے کہ سارے افغانستان میں سٹنگر میزائل پھیلا دیے گئے اور ہر کوئی کندے پر ایک میزائل اٹھائے پھر رہا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ میزائل محدود پیمانے پر سپلائی ہوئے اور صرف مخصوص کمانڈروں کو دیئے گئے۔

نینا میں نے سنا ہے کہ اگر سٹنگر میزائل نہ بھی ملتے تب بھی مجاہدین کی فتح یقینی تھی۔ میں نے کہا۔

ہاں! نینا نے کہا۔

روائیتی ہتھیاروں، موسموں اور زمین کا استعمال افغانوں سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔ جن علاقوں میں کمانڈروں کو سٹنگر میزائل اور ٹینک شکن ہتھیار نہ ملے ان کی کارکردگی بھی اتنی ہی عمدہ تھی جتنی دوسروں کی۔ میں نے پشاور میں افغان مجاہدین کی ایک فلم دیکھی جس کا نام فضائی

گھات تھا جو کہ ملٹری اصطلاحات میں ایک نیا نام ہے۔

تمھارا مطلب ہے مجاہدین نے فضا میں گھات لگائی۔ میں نے پوچھا۔

ایسے ہی ہوا۔ نینا نے ہنس کر جواب دیا اور کہنے لگی۔

پہلا سین ایک ائیر فیلڈ کا تھا جہاں بہت سے روسی مگ طیارے اور ہیلی کاپٹر کھڑے تھے۔ اس ایئر فیلڈ کے باہر تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گہرا نالہ تھا جس کے دونوں کناروں پر مجاہدین نے زمین سے زمین پر پھینکے جانے والے 107 ملی میٹر راکٹ نصب کر رکھے تھے جنھیں ایک بیٹری سے منسلک کر کے دو مجاہدوں کو ایک خندق میں بٹھا دیا گیا تھا۔

یہ عمل رات کے پچھلے پہر مکمل کر کے باقی مجاہدین وہاں سے ہٹ گئے اور دن کے تقریباً دس بجے پہلے ہیلی کاپٹر اڑے اور ائیر فیلڈ کا جائزہ لیکر ایک طرف گھومنے لگے۔ پھر آٹھ دس جہازوں نے جونہی ٹیک آف کیا تو تین اطراف سے راکٹ بھی فضا میں بلند ہوئے اور دو جہازوں اور ایک ہیلی کاپٹر کو ڈائیرکٹ نشانے پر لے آئے۔ اس ایکشن کے بعد باقی جہاز بلندی پر چلے گئے اور ہیلی کاپٹروں نے اس علاقے پر آگ اور لوہے کی بارش شروع کر دی۔ روسیوں کا ایئر ایکشن تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ حیرت کی بات یہ کہ ایک مجاہد نے ایک چھوٹی سی مشین کا بٹن دبا کر یہ سارا ایکشن کیا اور دوسرا اس سین کو فلما رہا تھا اور روسی بے بسی کے عالم میں ان کے اردگرد بارود کی بارش کر رہے تھے۔

اس سین کے اختتام پر میں نے جلال آباد سے تعلق رکھنے والے مجاہد کمانڈر انجینئر محمود سے سوال کیا کہ اگر مجاہدین کے پاس راکٹ تھے تو انھوں نے ایئر فیلڈ پر بیٹھے جہازوں کو نشانہ کیوں نہ بنایا۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ فلم بنانے کی کیا ضرورت تھی اور اس ایکشن کے بعد ائیر فیلڈ کا کیا بنا۔

انجینئر محمود نے کہا کہ یہ راکٹ کسی نقطہ ہدف پر نہیں گرتے بلکہ علاقے میں پھیل کر گرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس ایمونیشن کی شلف لائف پوری ہو چکی تھی اس لئے اس کی کارکردگی کا معیار بھی کم تھا۔

مجاھدین ایسے اڈوں پر اکثر راکٹ فائر کرتے رہتے تھے مگر ائیر فیلڈ کا دفاعی حصار اس بات کو مدنظر رکھ کر بنایا جاتا تاکہ مجاھدین کے راکٹ حدف تک نہ پہنچ سکیں۔

مجاہدین نے اس کا توڑ بنا لیا اور ائیر فیلڈ کے دونوں جانب کچھ فاصلے پر راکٹ نصب کئے

تا کہ جہاز ٹیک آف کرتے ہی خود راکٹوں کے سامنے آجائیں۔ مجاہدین ایک وقت میں ساٹھ ستر یا کبھی اس سے بھی زیادہ راکٹ ایسے زاویے پر نصب کرتے تا کہ کچھ نہ کچھ دشمن کے سینے میں بھی پیوست ہو جائیں۔ اگر جہازوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو نقصان بھی زیادہ ہوتا۔ اگر کسی وقت جہاز نشانہ نہ بھی بنتے تو کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوتا کہ جہاز اپنے مشن پر جانے کے بجائے راکٹ فائر کرنے والوں کی تلاش میں لگ جاتے اور کئی کئی ٹن ایمونیشن پہاڑوں پر پھینکتے رہتے۔ انجینئر محمود نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ ایمونیشن بھی ہمارے ہی کام آتا۔

وہ کیسے میں نے پوچھا۔

راکٹ دو یا چار مجاہدین پانچ یا چھ گدھوں، دو تین خچروں یا پھر ایک یا دو اونٹوں پر لاد کر لے جاتے اور ایک یا دو راتوں کے بعد ہدف پر پہنچ جاتے۔ ایکشن کے بعد روسی جس قدر بمباری کرتے اس سے کئی ٹن پیتل، لوہا، سکہ اور سٹیل اکٹھا کیا جاتا۔ روسی پیراشوٹ کے ذریعے ایک ایسا بم بھی پھینکتے جس کے گرنے سے زمین سے پانی نکل آتا اور اس بم سے تقریباً ایک ٹرک لوہا حاصل ہوتا۔

انجینئر محمود نے بتایا کہ درہ آدم خیل سے ایک راکٹ ڈیڑھ سو سے دو سو روپے کا ملتا۔ ٹرانسپورٹ کا خرچہ ڈالکر ایک راکٹ ایکشن پر بیس یا پچیس ہزار خرچ آتا جبکہ دو بموں کا لوہا ڈیڑھ سے دو لاکھ کا بکتا۔

یہ لوہا کہاں بکتا تھا؟ میں نے سوال کیا۔

انجینئر صاحب نے بتایا کہ اس کی مارکیٹ پشاور، لاہور اور کراچی میں ہے۔

دوسرا سین ایک اونچے پہاڑ کا تھا جہاں مجاہدین پتھریلی چٹانوں میں بنی غاروں میں بیٹھے تھے۔ اس سین میں چھ روسی ہیلی کاپٹر لائن فارمیشن میں آئے اور جونہی وہ ان پہاڑوں کی بلندی کے لیول میں پہنچے تو ان پر تین اطراف سے فائیر کیا گیا جس سے دو ہیلی کاپٹر نشانہ بن گئے۔

حیرت کی بات کہ باقی چار ہیلی کاپٹروں نے ان مجاھدین کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی اور دوسری جانب وادی میں چلے گئے۔

میں نے انجینئر محمود سے ان بڑے بڑے راکٹ لانچروں کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اسے ایس پی جی نائن راکٹ لانچر کہتے ہیں اور عام راکٹ لانچر آر پی جی سیون کہلاتا ہے۔ دونوں ہی کیمونسٹ ہتھیار ہیں جنھیں چین اور روس بناتے ہیں۔

مجاہدین کے پاس جو ایس پی جی نائن تھے ان میں زیادہ تر مصر اور عراق سے خریدے گئے۔ یہ ایک بڑا ہتھیار ہے جو ٹینکوں اور بکتر گاڑیوں کے خلاف انتہائی موثر ہے۔ اسکا ہیلی کاپٹروں کے خلاف استعمال مجاہدین کی اختراع ہے۔ جب مجاہدین نے اونچی چوٹیوں پر بیٹھ کر ہیلی کاپٹروں کو نشانہ بنایا تو روسی ہیلی کاپٹروں نے پہاڑوں کا رخ کرنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے مجاہدین کو پہاڑوں میں آمدورفت اور سازوسامان جمع کرنے کی آزادی مل گئی۔ افغانستان کے پہاڑوں کی ساخت ایسی ہے کہ ہوائی جہازوں اور توپخانے سے گرایا ہوا فائیر کم ہی اثر انداز ہوتا ہے جس کی مجاہدین بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔

انجینئر محمود نے بتایا کہ بیرونی امداد صرف پارٹی لیڈروں یا پھر بڑے کمانڈروں کو ملتی ہے پارٹی لیڈر یا فیلڈ کمانڈر کی منظوری سے ہی آپریشنل پلان بنتا ہے۔ ایکشن کمانڈروں کو ویڈیو کیمرہ بھی دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ایکشن کی کامیابی کا ثبوت پیش کرسکیں۔ اس طرح کوئی ایکشن کمانڈر ہتھیاروں اور ایمونیشن کی خرید وفروخت بھی نہیں کرتا اور نہ ہی جھوٹی کہانی بنا کر اپنے ایکشن کو بڑھا چڑھا کر پیش کرسکتا ہے۔

میں نے کمانڈر محمود سے دریافت کیا کہ اگر مجاہدین کی تنظیموں میں اسقدر سخت ڈسپلن تھا تو پھر پاکستان کے گلی کوچوں میں ہتھیارروں کی منڈیاں کیسے سج گئیں۔

محمود نے بتایا کہ دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیار مجاہدین استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ ہتھیار جو میدان جنگ میں یا کسی ایکشن کے بعد مجاہدین کے ہاتھ لگتے انہیں تنظیم کے پاس جمع کروادیا جاتا مگر کچھ مجاہدین روسی اسلحہ کے ڈپوؤں اور کانوائے کو بھی لوٹ لیتے اور یہ ہتھیار باڑہ، درہ آدم خیل، سدہ، پاڑہ چنار، لنڈی کوتل سے ہوتا ہوا گلگت بلتستان، سوات اور پھر کراچی تک پہنچ جاتا۔ زیادہ تر مذہبی جماعتیں، سیاسی پارٹیوں کے لیڈر، پنجاب اور سندھ کے زمیندار یہ ہتھیار خریدتے چونکہ حکومت پاکستان نے سیاستدانوں اور بڑے جاگیرداروں کو ان ہتھیاروں کے لائسنس جاری کرر کھے تھے۔ یہ لوگ ایک ہتھیار کا لائسنس بنواتے ہیں اور دس پندرہ ویسے ہی خرید لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستانی اسلحہ ڈیلروں کے نمائندے مجاہدین کے بہروپ میں افغانستان آتے اور روسی فوجیوں سے رابطہ کرکے اور فرضی حملہ دکھا کر بہت سا اسلحہ ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کردیتے جو گلگت، چترال، اعظم ورسک اور چمن کے سرحدی علاقوں سے خچروں اور چھوٹی

گاڑیوں کے ذریعے پاکستان منتقل کیا جاتا۔

دور دراز چوکیوں پر متعین روسی فوجی بھی اسلحہ فروخت کرتے تھے یہ لوگ امریکی ڈالروں اور منشیات کے عوض اسلحہ بیچتے مگر یہ خرید وفروخت محدود پیمانے پر ہوتی۔

انجینئر محمود نے بتایا کہ پاکستان میں اسلحہ کے سب سے بڑے خریدار جیش محمد، انجمن سپہ صحابہ اور ایم کیو ایم تھے۔میرے پوچھنے پر کہ انجمن سپہ صحابہ اور جیش محمد تو ایک دوسرے کے خلاف ہیں مگر ایم کیو ایم والے اسے محض الزام کہتے ہیں۔انجینئر محمود نے مجھے کراچی کا ایک پرانا اخبار اور رسالہ ہیرالڈ کی ایک کاپی دکھائی۔اخبار میں لکھا تھا کہ اگر مہاجروں نے کراچی میں زندہ رہنا ہے تو اپنے فریج، ٹیلیویژن اور واشنگ مشینیں بیچ دیں اور کلاشنکوف خریدیں۔یہ مضمون اقبال تاجر نے لکھا تھا جسے بعد میں کسی نامعلوم حملہ آور نے قتل کر دیا۔ہیرالڈ میں ایک دلچسپ مضمون چھپا تھا جو درہ آدم خیل کے ایک پٹھان اسلحہ فروش کے انٹریو پر مبنی تھا۔اسلحہ فروش پٹھان سے پوچھا گیا کہ تم جو اسلحہ کراچی بھجواتے ہو یہ تمھارے ہی پٹھان بھائیوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔اگر یہ اسلحہ کراچی نہ بھجواؤ تو پٹھان مزدوروں اور محنت کشوں کی جان بچ جائے۔

اس سوال پر پٹھان اسلحہ فروش نے جواب دیا کہ ہم نے پٹھان نہیں کھانا۔

مطلب یہ تھا کہ ہمیں پیسہ چاہیے چونکہ پیسے سے پیٹ بھرتا ہے پٹھان سے نہیں اور نہ ہی پٹھان کھانے کی چیز ہے۔اگر ایم کیو ایم یا کوئی دوسری جماعت یا پارٹی اسلحہ خرید رہی ہے تو پٹھان بھی خرید لیں۔ہمیں پیسے سے غرض ہے پٹھان یا پنجابی سے نہیں۔

تم روسو افغان جنگ کی بات کر رہی تھی۔میں نے کہا۔

نہیں۔میں پاکستانی عسکری تجزیہ نگاروں اور امریکی رویے کی بات کر رہی تھی۔نینا نے کہا۔

پھر کہنے لگی کہ جب پاکستانی معاملات سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے حوالے ہوئے تو ایران پاکستان کی سرزمین پر سعودی عرب کے مدمقابل آ گیا اور دونوں ممالک نے اپنے اپنے مسالک کے پیروکاروں کی مدد شروع کر دی جس کی وجہ سے پاکستان فرقہ پرستی کی جنگ سے گزرتا ہوا دہشت گردی کی جنگ میں جھونک دیا گیا۔عجیب بات یہ کہ پاکستان میں ستر فیصد آبادی حنفی مسلک کی پیروکاروں کی ہے جسے سنی کہا جاتا ہے۔پندرہ فیصد سے بھی کم اہل تشیع ہیں اور پانچ فیصد کے قریب وہابی مسلک کے پیروکار ہیں۔سعودی عرب کا سرکاری مسلک وہابیت ہے جو کہ امام ابن تیمیہ کے پیروکار ہیں کچھ شیعہ بھی ہیں مگر سنی بلکل نہیں ہیں۔سعودی

عرب میں سنی دیوبندی مسلک کے لوگوں کو تھوڑی بہت لفٹ مل جاتی ہے جو بوقت ضرورت اپنے ساتھ سلفی کا اضافہ بھی کر لیتے ہیں مگر سنی بریلویوں کو بلکل برداشت نہیں کیا جاتا اور سعودی انہیں بدعتی کہتے ہیں۔ بہت سے سنی علماء جن میں مولانا شاہ احمد نورانی بھی شامل تھے کا سعودی عرب میں داخلہ ممنوع تھا۔

عربوں کی کسی دیوبندی عالم سے ذراسی خفگی ان کی جان و ایمان پر بن آنے کے مترادف ہوتی ہے۔نوائے وقت میگزین میں ابوالامتیاز نامی ایک صاحب اکثر مضامین لکھتے ہیں۔ ان صاحب نے اپنے ایک سلسلہ وار مضمون میں لکھا کہ انہوں نے جہاد کشمیر کیلئے فنڈ جمع کرنے کا فیصلہ کیا تو آزاد کشمیر حکومت جسکے کرتا دھرتا سردار عتیق احمد خان تھے سے لیکر جماعت اسلامی کے عبدالرشید ترابی تک سب نے اپنے آپ کو جہادی اور مجاہد بنا کر پیش کیا جس کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ فنڈ کس کے حوالے کیا جائے اور کون اپنے بیان میں سچا ہے۔

اس سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ کشمیر کی آزادی کا بزنس کرنے والوں میں سے کسی نے عرب امارات کے کسی وزیر داخلہ شائد قطر کے وزیر داخلہ کو کہہ دیا کہ ابوالامتیاز بریلوی ہے جس کی وجہ سے میرا امارات میں قیام اور بزنس خطرے میں پڑ گیا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ بڑی مشکل سے میں نے وزارت داخلہ کو یقین دلایا کہ میں بریلوی ہرگز نہیں ہوں اور اس کے بعد میں نے آزادی بزنس سے بھی توبہ کر لی۔

اسی طرح روزنامہ نوائے وقت کے سابق کالم نگار عرفان صدیقی نے نواز شریف کی دوبارہ جلاوطنی اور سعودی حکومت کے مشرفانہ رویے کے خلاف ایک کالم لکھا جس کے بعد سعودی سفیر نے عرفان صدیقی کو بلیک لسٹ کر دیا۔ عرفان صدیقی کیلئے سعودی سفیر کی ناراضگی ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور بعد میں موصوف اپنے کالمانہ واویلوں، ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو نہ رکھ سکے اور معافی در معافی کے کالم لکھنے لگے۔ اپنے ایک کالم میں موصوف نے لکھا کہ مجھے امید ہے کہ عزت مآب سعودی سفیر مجھے معاف کرتے ہوئے آئندہ اپنے سفارت خانے کی تقریبات میں ضرور مدعو کریں گے۔

یہ تو تھے پاکستان کے عرب بھائی جو ارب پتی بھی ہیں اور جن کی خیرات، صدقات اور زکواۃ پر سب سے زیادہ حق غریب، مسکین اور یتیم پاکستان کا ہے۔ ایران جو ہمارا ہمسایہ اور عربوں کا رقیب ہے اپنی مسلکی جنگ ہمارے ہی صحن میں لڑتا ہے۔ ایرانیوں کو ہماری کمزوری کا بخوبی علم

ہے جس سے وہ بھر پور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہماری قیادت کی عیاشیوں کی وجہ سے پیدا کردہ غربت و افلاس کے علاوہ علاقیت، قومیت، فرقہ واریت اور سب سے بڑھ کر بھارت اور افغانستان کا پڑوس ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایران کے ساتھ برابری کا ماحول پیدا کرسکیں۔

ایک طرف تو ملک مسلکیت اور فرقہ واریت کا شکار ہوکر دھشت گردی کے تندور میں جا گرا ہے اور دوسری طرف ہم اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کی کشتی کا اکھاڑہ بن گئے ہیں۔ سعودی عرب اور ایران تو کھاتے پیتے گھرانے ہیں مگر حیرت کی بات ہے کہ بھوکا ننگا افغانستان بھی ہم پر مان نہیں۔

میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ پاکستان میں چپقلش کی ابتدا سلفی، دیوبندی یا وہابی مسلک کے ماننے والوں اور اہل تشیع کے درمیان شروع ہوئی جو کہ زیادہ پرانی بات نہیں۔ اگر حکومت وقت چاہتی تو اس فتنے کو دبا سکتی تھی جس کیلئے دونوں مسالک کے رہنماؤں کو بٹھا کر ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن کرنے اور صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ کے متعلق گستاخانہ لب و لہجہ اختیار کرنے سے منع کردیا جاتا تو بات جنگ وجدل تک نہ آتی۔ اس وقت جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی اور امریکہ اور سعودی عرب سمیت ساری دنیا جنرل ضیاء الحق کی مدح تھی۔ روسو افغان جنگ اپنے زوروں پر تھی اور خود ضیاء الحق کا مسلک بھی سعودی مسلک سے ہم آہنگ تھا اور انقلاب ایران کے فوراً بعد ایران عراق جنگ کی وجہ سے ایران کمزور ہو چکا تھا۔

شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ پودے کو ایک ہاتھ سے کھینچ کر جڑ سے نکالنا آسان ہوتا ہے مگر جب وہ درخت بن جائے تو اسے کھینچنے کیلئے چرخی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی آجکل کے لحاظ سے کسی کرین وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے حکمرانوں کی بھی یہی حالت ہے جب تک مسئلہ یا جھگڑا خونی جنگ نہ بن جائے کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا۔

اگر ایران کے اندرونی ماحول کو دیکھا جائے تو وہاں کی کل آبادی کا پندرہ فیصد سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے مگر ایران میں سنیوں، آتش پرستوں اور بہائیوں کو یکساں ڈیل کیا جاتا ہے۔ آتش پرستوں یعنی پارسیوں اور بہائیوں کا تو مذہب الگ ہے مگر سنی یا حنفی تو مسلمانوں ہی کا ایک مسلک ہے جسے غیر مسلموں کی صف میں کھڑا کرنا سمجھ سے باہر ہے۔

1983 میری زندگی کا حسین اور انتہائی رومانٹک سال تھا۔ میں نے مند سے کھنجراب،

جلالہ آباد اور تیرہ وادی سے بھاولپور، سیالکوٹ، ہیڈ والہ، بھمبھر، باغ سر اور پیر پنجال تک سفر کیا۔ میں مظفر آباد، جورا، شاردہ اور کیل سے ہوتی اپنے دوستوں کے ہمراہ بلتستان کی وادیوں تک گئی۔ ہم نے خپلو میں طویل کیمپ کیا اور وہاں کی تاریخی مساجد اور مقبرے دیکھے۔ ہم مقامی لوگوں سے ملے تو پتہ چلا کہ آج دنیا جنھیں بیک ورڈ کہتی ہے کبھی یہ ایک نئی تہذیب کے بانی تھے۔ ہر وادی کے باشندے ایک حکومت، قانون اور ضابطے کے تحت اپنے آزادانہ فطری ماحول میں جیتے تھے۔

کوئی کسی کا مال مویشی اور زمین جائیداد پر قابض نہ ہوسکتا تھا اور نہ ہی کسی کی عزت کی طرف بدنگاہ سے دیکھنے کی جرأت کرتا تھا۔ عورتوں اور بچوں کے حقوق انسانی عظمت و مساوات کے اصولوں پر مبنی تھے۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی تھی اور کوئی کسی کے مسلک میں مداخلت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ علاقہ ہندی، چینی اور ایرانی تہذیبوں کے سنگم پر واقعہ ہونے کی وجہ سے ان کے اثرات سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس خطہ زمین پر ہندو اور بدھ مذاہب کے علاوہ اسلام کے ابدی آثار کندہ ہیں۔ تہذیبوں کے عروج و زوال کے ساتھ جہاں اس خطے کے معاشرتی و معاشی حالات بدلتے رہے وہیں موسموں کی شدت نے زمینی خدوخال بھی بدل ڈالے۔ نئی چوٹیاں ابھریں، دریاؤں نے رخ بدلے، گلیشیئر ٹوٹ کر کئی وادیاں اور آبادیاں بہا کر لے گئے، نئے گاؤں اور بستیاں آباد ہوئیں اور پرانی برفوں اور مٹی کے تودوں تلے دب کر قصہ ماضی بن گئیں مگر اس زمین پر بسنے والوں کے مزاج اور مروت میں فرق نہ آیا۔

گلگت و بلتستان پر لکھنے والے ہر دور میں مولوی حشمت اللہ اور محمد دین فوق کی تحریروں کے محتاج رہینگے اور کوئی بھی تحریر ان کے حوالوں کے بغیر ادھوری رہے گی۔ میں نے مولوی حشمت اللہ اور محمد دین فوق کی کتابوں میں جو پڑھا اسے بلتستان کی چٹانوں پر لکھا پایا۔

گلگت اور بلتستان پہاڑوں وادیوں اور بلند میدانوں ہی کی نہیں بلکہ برفانی طوفانوں اور دریاؤں کی زمین بھی ہے۔ گلگت اور بلتستان کے لوگ قانون فطرت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگاتے اور نہ ہی کوئی فیصلہ کرنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے۔ ان لوگوں سے ملکر اور ان کی تاریخ جان کر بہت سے تاریخی احوال خود بخود غلط ہوجاتے ہیں۔ مگر مسگر سے باہر چند میل کے فاصلے پر ایک میدان میں گم سم بیٹھی بڑھیا کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ سو سال پہلے جب یہ آٹھ یا دس سال کی لڑکی تھی تو لڑکی نہ تھی بلکہ شادی شدہ اور ذمہ دار عورت تھی۔ اس کا خاوند اس سے دس

سال بڑا تھا جس کی ملکیت سو بھیڑیں اور بیس گھوڑے تھے۔ وہ ایک آسودہ حال اور کھلنڈرا نوجوان تھا جس پر سارے گاؤں کی لڑکیاں مر مٹنے کو تیار تھیں مگر وہ خود وقت سے پہلے جوان دکھائی دینے والی یاسمین کی آوارہ زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔

جلات اور یاسمین نے ابھی کرغستان کی پہلی بہار نہ دیکھی تھی کہ روس نے ان کے ملک پر قبضہ کرلیا۔

پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

ہم نے جان علی کی وساطت سے دریافت کیا تو یاسمین کے عمر رسیدہ منگول چہرے پر بنی تہہ در تہہ جھریوں میں سمندر کی لہروں کی طرح ہلچل ہوئی اور وہ آہستہ سے بولی ہم نے ہجرت کی۔

ہم اپنے خچروں، اونٹوں اور گھوڑوں کی پیٹھوں پر جو لاد سکے لیکر چل پڑے۔ ہماری بھیڑیں، بچے، بوڑھے، بیمار اور عورتیں راستے میں مرتے رہے مگر ہم کہیں نہ رکے۔ روسی راتوں کو ہمارے پڑاؤ پر حملہ آور ہوتے جن کا ہم ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور چل پڑتے۔ پھر ایک صبح ہم اس زمین پر اترے اور یہیں کے ہو گئے۔

افغانستان اور کاشغر نزدیک تھے وہاں کیوں نہ رکے؟ ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا۔

تب چین ایک کمزور ملک تھا اور روسیوں کے دباؤ میں تھا۔ کاشغر صوبہ تو چین کا تھا اور مسلمانوں کی آبادی بھی کثیر تھی مگر عملاً حکمران روسی ہی تھے۔ روسیوں کے کاشغر میں آنے اور کسی مسلمان کو پکڑ کر لیجانے پر پابندی نہ تھی اسلئے کاشغر جانے سے بہتر تھا کہ اپنے گھروں میں رہ کر بے دین اور بے غیرت زندگی بسر کر لیتے۔

بہت سے ازبک، ترکمان، قزاق اور کرغزئی افغانستان گئے مگر نہ افغان سرزمین نے انہیں قبول کیا، نہ حکومت نے اور نہ ہی عوام نے۔ افغانوں نے جس کے پاس اچھا قالین دیکھا وہ اونے پونے داموں لے لیا۔ کسی کے گھوڑے، خچر اور بھیڑیں ہتھیا کر علاقے میں رہنے کی اجازت دی اور کچھ کی جوان بیٹیاں اپنے بوڑھوں سے بیاہ کر شہر میں داخلے کا پرمٹ دلوا دیا۔ کچھ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے پاس ٹھہرے اور بہت سے ویرانوں اور جنگلوں میں چھپ گئے جہاں افغان حکومت کی رسائی نہ تھی۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا اور لوگ ادھر سے ادھر بھٹکتے رہے۔ کچھ ترکی اور ایران چلے گئے کچھ ہندوستان کے شہروں میں سما گئے اور بہت سے ان پہاڑوں اور جنگلوں کی مٹی میں مل گئے۔

افغانستان میں تو ایک مسلمان بادشاہ تھا۔ اس نے تم لوگوں کو پناہ کیوں نہ دی؟ کسی نے سوال کیا تو عمر رسیدہ یاسمین نے اپنے ماتھے سے ڈھلکی چنری کو ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مگر چمکدار آنکھوں کو چنری کے بوجھ سے آزاد کرتے ہوئے گلیشئر کی طرف دیکھا اور پھر دیر تک دیکھتی رہی جیسے کوئی نیا قافلہ اس برفانی پہاڑ سے اترنے والا ہو۔

طویل خاموشی کے بعد یاسمین نے کہا کہ افغانستان امن کی جگہ نہیں۔ وہاں کے بادشاہ ہمیشہ کسی بیرونی حکومت کے غلام ہوتے ہیں۔ جو غلامی قبول نہیں کرتے مار دیے جاتے ہیں۔ افغانستان کا بادشاہ اتنی ہی عمر پاتا ہے جتنی غلامی اس کے مقدر میں ہوتی ہے۔ افغانستان کے عوام ہمیشہ آزاد رہے ہیں وہ غلامی قبول نہیں کرتے اس لئے بادشاہ اور رعایا الگ الگ رہتے ہیں۔ افغانستان کی زمین پر ایک بادشاہ کابل میں ہوتا ہے اور پھر ہر مسلک کا ملاں اور ہر قبیلے کا سردار بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ آپ جس کے پاس پناہ گزین ہو جائیں اسکی غلامی میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ بادشاہ کے غلام ہیں تو بادشاہ جس کا غلام ہوگا وہ آپ کو اس کے ہاتھ بیچ دے گا۔ اگر آپ کسی سردار یا ملاں کی غلامی میں ہیں تو وہ آپ کو بیچے گا نہیں بلکہ اپنے مسلک اور روایات کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے گا۔

جو لوگ کابل گئے تھے وہ انگریز کے ہاتھوں بک گئے اور جو قبیلوں کے سرداروں اور ملاؤں کے پاس گئے وہ ان کے ہو گئے۔ وقت گزرتا گیا پرانے مر گئے اور نئے بھول گئے کہ وہ کہاں سے آئے تھے۔ جو روسی ہمارے پیچھے آئے تھے وہ واخان سے ادھر نہ آئے مگر اب افغانوں نے روسیوں کو آنے کی دعوت دیکر ایک بار پھر غلامی کا چغہ پہن لیا ہے۔ ازبک، تاجک اور ترکمان دل سے روسیوں کیساتھ ہیں مگر پختونوں سے بھی ڈرتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں۔ اب تو سنتے ہیں کہ روسی کسی ازبک یا تاجک کو کابل کا بادشاہ بنانے والے ہیں۔

ایسا ممکن ہے؟ میں نے پوچھا۔

کیا کہتی ہے؟ یاسمین نے جان علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جان علی نے میرا سوال دہرایا تو یاسمین نے ماتھے پر باندھی سرخ پٹی دونوں ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ اگر سارے پختون مر گئے تو۔۔۔

پھر کہنے لگی یہ سب صرف پاکستان میں ممکن ہے کسی اور ملک میں نہیں۔

میری دوست پلوشہ اور رنگینہ نے جان علی سے پوچھا کہ یاسمین اردو تو بولتی ہے مگر ہمارے

سوالوں کا براہ راست جواب نہیں دیتی۔ جب ہم سوال کرتے ہیں تو وہ تمہاری طرف دیکھتی ہے۔آخر کیوں؟

جان علی نے بتایا کہ نانی کی بینائی بلکل ٹھیک ہے مگر سننی بہت کم ہے۔ اسکے کان اجنبی آوازوں سے مانوس نہیں۔ گھر کے افراد کی بات سمجھ جاتی ہے۔

جان علی جو یاسمین کا پڑپوتا تھا کراچی میں اردو سائنس کالج کا طالب علم تھا۔ جان علی نے بتایا کہ جس دور میں نانی یاسمین اور دیگر لوگ چھوٹا پامیر عبور کر کے اس علاقے میں اترے ان کے پاس صرف چند بھیڑیں رہ گئیں تھیں۔ زیادہ تر راستے میں مرگئیں یا پھر ان لوگوں نے ذبح کر کے کھالیں۔ اونٹ، خچر اور گھوڑے کافی تعداد میں بچ گئے چونکہ وہ سفر کی تکالیف برداشت کر گئے۔ جان علی نے کہا کہ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ کافی سارا مال مویشی روسیوں سے بچا کر واخان میں داخل ہوئے تو واخی لیٹروں نے ان سے نہ صرف انکا مال مویشی ہتھیا لیا بلکہ روسیوں کو قافلے کے پڑاؤ کی طرف بھی لے آئے۔ واخیوں کی نیت کو بھانپتے ہوئے دادا جلات خان نے جو قافلے کا سردار بھی تھا دو رات اور دو دن کسی جگہ قیام نہ کیا۔ جلات خان نے روائتی راستہ بھی بدل لیا اور گلیشیئر کے شمال سے ہوتا چینی سرحد سے کلنک کے علاقے میں داخل ہوا۔ کہتے ہیں کہ جلات خان جوانی میں پھرتیلا اور پر جوش جوان تھا۔ ایک سال بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چھوٹا پامیر گیا اور واخیوں کے سردار اور دو بیٹیوں کو اٹھا لایا۔ جلات نے واخیوں کو پیغام بھجوایا کہ ہجرت کے دوران لوٹا ہوا مال اور روسیوں کی جاسوسی کے جرم کی سزا ایک سو بھیڑیں لے آؤ ورنہ سردار کو قتل کر دیا جائے گا اور لڑکیوں سے ہم شادیاں کرلینگے۔ کہتے ہیں کہ چار روز کے بعد ہمارے قبیلے والوں کو مال مویشی اور بھیڑیں مل گئیں اور سردار اور اس کی بیٹیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے واپس بھجوا دیا۔

جان علی نے بتایا کہ قائداعظمؒ، میر آف ہنزہ اور مہا راجہ کشمیر دادی کے پسندیدہ حکمران ہیں۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ جب یہ لوگ اس علاقے میں آئے تو گلگت میں مقیم انگریز ریذیڈنٹ نے میر آف ہنزہ پر دباؤ ڈالا تا کہ وہ ہمیں واپس واخان میں دھکیل دے۔ میر نے انگریز کی پرواہ نہ کی اور مہاراجہ کشمیر جس کی بادشاہت میں گلگت اور بلتستان بھی شامل تھے کو ہماری کسمپرسی کی متعلق لکھا۔ میر نے ڈوگرہ مہاراجہ کو لکھا کہ جو لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں وہ کیمونسٹ نہیں اور نہ ہی زار کے وفاداروں میں شامل ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے کسی شہر یا

گاؤں میں آباد نہیں ہونگے۔ یہ ویرانوں اور پہاڑوں کے شیدائی ہیں اور سب کے سب مسلمان اور میرے ہم مسلک ہیں۔

میر آف ہنزہ کی سفارش کے بعد کوئی ڈوگرہ فوجی اس طرف نہ آیا البتہ جو لوگ چترال میں اترے انہیں مہتر چترال اور اس کے سپاہیوں نے خوب تنگ کیا۔

دادی کہتی ہے کہ مہاراجہ کشمیر اور ہنزہ کا میر بہادر، دلیر اور ہمدرد بادشاہ تھے۔

پاکستان بننے کے بعد قائداعظمؒ کراچی آئے تو کئی موقعوں پر دادی نے قائد کو دیکھا۔ دادی کہتی ہیں کہ وہ کشمیری خواتین کے ایک وفد کے ہمراہ محترمہ فاطمہ جناح سے بھی ملیں۔ اس ملاقات کا احوال بتاتے ہوئے جان علی نے بتایا کہ کچھ کشمیری خواتین ایک وفد کی صورت میں مادر ملت سے ملنا چاہتی تھیں جنہیں خیال آیا کہ گلگت اور بلتستان بھی کشمیر کا حصہ ہے تو کیوں نہ کسی گلگتی یا بلتی خاتون کو بھی وفد میں شامل کرلیا جائے۔

ان خواتین نے جب گلگت اور بلتستان کے لوگوں سے رابطہ کیا تو ان کے گھر والوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہماری خواتین صحیح طرح اردو نہیں بول سکتیں اور نہ ہی ان کے پاس روائیتی بلتی ملبوسات ہیں۔ دادا جلات ایک آسودہ حال اور پر مزاح انسان تھے۔ دادی کے لاکھ انکار کے باوجود انہیں بہترین قزاق چوغہ اور پھولدار ٹوپی پہنا کر بھیج دیا بلکہ خود چھوڑ آئے۔

دادی کہتی ہیں کہ اس ملاقات کے دوران پتہ چلا کہ مادر ملت کے گھر میں کشمیر سے آئے ایک خورشید حسن اور ان کی بیوی ثریا بیگم بھی رہتی تھیں جنہیں مادر ملت اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں اور تعلیم کیلئے ولائت بھجوا دیا تھا۔

دادی اس ملاقات میں خاموش بیٹھی رہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انھیں کوئی بات سمجھ نہ آئی مگر محترمہ فاطمہ جناح کا چہرہ انتہائی نورانی تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اور مسکرا کو باتیں کرتیں اور کبھی رنجیدہ بھی ہو جاتیں۔ وفد کی سب خواتین نے ان کی باتیں غور سے سنیں۔ دادی کہتی ہیں کہ واپسی پر محترمہ نے سب خواتین سے ہاتھ ملایا مگر جب دادی سے ملیں تو دادی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دیر تک وفد کی لیڈر سے گلگت اور بلتستان کے متعلق بات کرتی رہیں۔ وفد کی لیڈر نے دادی کو بتایا کہ محترمہ کہہ رہی تھیں کہ گلگت اور بلتستان کے لوگوں نے بہت بہادری دکھائی اور اپنا علاقہ ڈوگرہ راج سے آزاد کروایا۔

جان علی نے بتایا کہ جب ان کا قبیلہ کلک میں آیا تو قریبی گاؤں مسگر، ریشت، چلنج اور سوختر

آباد میں آبادی انتہائی قلیل تھی۔ سوختر آباد بھی ازبک لوگوں نے آباد کیا اور پھر بہت سے لوگ گلگت چلے گئے۔ میں نے جان علی سے پوچھا کہ مسگر، ریشت، چلنجی اور سوختر آباد تو یہاں سے بہت دور ہیں اور کلک بھی آگے ہے تو یہ جگہ کلک کیسے ہے۔ جان علی نے مسکرا کر کہا کہ ہمارے لئے یہ جگہیں دور نہیں اور اس جگہ کا نام بھی یہی ہے۔

پلوشہ نے تجویز دی کہ ان چند جھونپڑوں کا نام یاسمین آباد یا پھر جلات پور رکھ دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ جان علی نے یاسمین کے کان میں کچھ کہا تو وہ مسکرا دی اور آہستہ سے بولی رکھ دو کیا حرج ہے۔ یہ خدا کی زمین ہے۔ ویسے ادھر نیچے بڑی سڑک پر ایک خدا آباد بھی ہے۔

جان علی نے بتایا کہ روسی انقلاب کے بعد ایک مدت تک ان کا خاندان اس زمین پر رہا۔ ایک زمانے میں برفانی طوفانوں نے شدت اختیار کی اور بہت سے مکان گر گئے، مال مویشی مر گئے، زمین میں دراڑیں پڑنے سے نئے ندی نالے بن گئے اور برفیں دیر تک جمی رہیں جس کی وجہ سے زندگی مشکل ہوگئی۔ چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی لوگ گلگت چلے گئے اور پھر کراچی کو مسکن بنالیا۔ یہ واقعہ پاکستان بننے سے پہلے کا ہے۔

دادا جلات خان نے بمبئی، ایران، ترکی اور کاشغر کا سفر کیا اور دیگر لوگوں سے ملکر قالین بنانے کا کارخانہ لگالیا۔ پاکستان بن گیا تو تقریباً سبھی لوگ کراچی منتقل ہوگئے اور کبھی کبھی گرمیوں میں اس زمین کو بھی آباد کرتے رہتے ہیں۔

دادا جلات اور دادی یاسمین نے کئی بار ایران کی سیر کی اور مقدس مزارات کی زیارت پر گئے۔ اسماعیلی فرقے کی عبادات چونکہ دیگر فرقوں سے مختلف ہیں اور اسماعیلی لوگ حج بیت اللہ کا بھی رجحان نہیں رکھتے اسلئے دادا جلات سمیت بیشمار لوگ اثنیٰ عشری مسلک سے وابستہ ہوگئے اور دادی دادا نے حج بیت اللہ کا فریضہ بھی ادا کیا۔

یہ جگہ جہاں دس بارہ مکانوں کے آثار ہیں اور صرف تین چار آباد ہیں کبھی پچاس سے زیادہ گھروں کا ایک آباد گاؤں تھا۔ ہم لوگ اس زمین سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک نسل اس مٹی میں پیدا ہوئی اور ایک نسل یہاں دفن ہے اس لئے اس سے جدائی ممکن نہیں۔ کراچی میں ہم لوگ خوشحال ہیں اور اب تو بہت سے لوگ برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا میں بھی آباد ہوگئے ہیں مگر آسودگی اور روحانی سکون مسگر نالے کے اس پار کھلے میدان میں ہے جہاں ہمارے آباواجداد ایک قافلے کی صورت میں اترے اور ایک نئی بستی آباد کی۔

کئی سال بعد میں نے اپنی گلگت اور بلتستان کی سیر کے متعلق ایک دانشور سے بات کی کہ شمال کی ایک بے نام بستی میں عمر رسیدہ قزاق خاتون نے کہا تھا کہ کوئی تاجک یا ازبک افغانستان کا بادشاہ نہیں بن سکتا مگر پاکستان میں یہ بھی ممکن ہے۔

تمہیں پتہ ہے اس دانشور نے مجھے کیا جواب دیا۔

نینا نے حیرت سے پوچھا۔

پہلے یہ تو بتاؤ دانشور کون تھا؟ میں نے طنزاً کہا۔

نہ سرکاری دانشور تھا اور نہ ہی ٹیلیویژن والا دانشور۔ نینا نے بھی ویسا ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔

سرکاری اور ٹیلیویژنی دانشور کوئی علیحدہ مخلوق ہے۔ میں نے پوچھا۔

سرکاری دانشور وہ ہیں جنہیں حکومت وقت کا سہارا ہوتا ہے۔ یہ لوگ خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے سیاسی پیشن گوئیاں کرتے ہیں اور کالم اور مضامین لکھتے ہیں۔ کتابیں لکھ کر سرکاری خرچے پر شائع کرواتے ہیں اور بیرونی دوروں پر جا کر مال کماتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مرحوم خلیل ملک تھے اور زندہ دانشوروں کے حوالدار میجر نذیر ناجی اور امتیاز عالم تا حال زندہ مثالیں ہیں۔

صوبیدار میجر کیوں نہیں؟ میں نے نینا کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

دانشوروں کے صوبیدار میجر اشفاق احمد، منٹو، مشتاق احمد یوسفی اور قدرت اللہ شہاب ہیں۔ شاعروں کے منیر نیازی اور ضمیر جعفری ہیں، کالم نگاروں کے اجمل نیازی اور ہارون رشید ہیں اور مدیروں کے مجید نظامی ہیں۔

جرنیل کیوں نہیں کہتی۔ میں نے پوچھا۔

صوبیدار میجر سپاہی سے بنتا ہے اور کسی پلٹن کے ہزار بہترین سپاہیوں میں سب سے بہترین کو صوبیدار میجر بنایا جاتا ہے۔ یہ عہدہ تیس سالہ تجربے، علم و ہنر اور عقل کے معیار کو پرکھ کر دیا جاتا ہے۔

جرنیل بننے کی کوالیفیکیشن الگ ہے اور ضروری نہیں کہ جرنیل دانشور بھی ہو۔ جس فوج میں پرویز مشرف جیسے کھلاڑی اور جنرل انور جیسے ہوس پرست، جھوٹے، بددیانت اور مکار جرنیل بن جائیں اور پھر سارے ملک کے مکاروں کو اکٹھا کر کے ایک قبیلہ بنالیں تو ایسے لوگوں کی صف میں عقلمندوں اور دانشمندوں کو کھڑا کرنا علم اور ہنر کی توہین ہے۔

ان میں سے بہت سے صوبیدار میجر تو اب نہیں رہے اور نذیر ناجی موجودہ دانشوروں کا حوالدار میجر کیوں ہے۔صوبیدار یا صوبیدار میجر کیوں نہیں۔میں نے سوال کیا۔

دانشور کا لکھا ہوا اور زبان سے بولا ہوا لفظ کبھی نہیں مرتا۔دانشور کی زندگی اس کے قلم کی سیاہی میں ہوتی ہے اور سیاہی کا رنگ کبھی مدہم نہیں ہوتا۔کنفیوشس،ارسطو،افلاطون،دیوجانسن اور مہاتما بدھ صدیوں پہلے ہوئے ہیں مگر علم وعقل کی دنیا میں آج بھی زندہ ہیں۔سعدیؒ،حافظؒ اور مولانا رومؒ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

نذیر ناجی، مجاہد بریلوی، اطہر عباس اور امتیاز عالم اپنے ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم خیال دانشوروں کے حوالدار میجر اسلئے ہیں چونکہ یہ بدلتے موسموں اور ہواؤں کے مطابق دانشوری بکھیرتے ہیں اور ان کی دانش ملکی اور غیر ملکی خفیہ اداروں کی بنائی ہوئی دھنوں پر الفاظ کا رنگ بکھیرتی ہے۔حوالدار میجر ایک عارضی عہدہ ہے جو کہ بڑے افسر کی خوشنودی اور مزاج کی سردی اور گرمی کا محتاج ہوتا ہے۔کچھ ایسا ہی حال ہمارے حوالدار میجر کالم نگاروں اور دانشوروں کا ہے جسکا احوال کالم نگاروں کی قلابازیاں نامی کتاب میں چھپ چکا ہے۔

لگتا ہے تم فوج میں رہی ہو۔میں نے پوچھا۔

نہیں فوجی کے ساتھ رہی ہوں۔نینا نے کہا۔

تم کسی فوجی جرنیل کی ADC تھی کیا؟ میں نے پوچھا۔

نہیں۔دوست تھی۔

تم دانشور کی بات کر رہی تھی۔میں نے نینا کو یاد دلایا۔

تم نے میری کوئی بات مکمل نہیں ہونے دی۔میری ہر بات ادھوری اور نامکمل رہی ہے۔نینا نے کہا۔

تمہاری بات لمبی ہو جاتی ہے تم کہیں سے کہیں نکل جاتی ہو اور پھر میرے ذہن میں ایک نیا سوال آتا ہے اور تمہاری بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

آئی ایم ویری سوری۔میں نے جواب دیا۔

چلو چھوڑو۔میں ٹیلیویژن والے دانشوروں اور دانشورنیوں کی بات کرلوں۔

آجکل جو لڑکی اچھا فیشن اور میک اپ کرلے اور اپنی اداؤں میں مردانہ اور زنانہ پن کا مکسچر بکھیرنے کا ہنر سیکھ لے،مسکراہٹوں کو حسب ضرورت استعمال کرے اور کسی ایک اخبار کا بغور

مطالعہ کر کے ٹیلیویژن سکرین پر آ جائے تو سمجھ لو وہ دانشورنی ہے۔

ہمارے ملک میں دانشوری کا یہ عالم ہے کہ سلیم صافی، عاصمہ چوہدری، عاصمہ شیرازی، مہر بخاری، ثنا بچہ، جیسے دانشوروں کی پالکی اٹھانے کیلئے ہاتھیوں کی ضرورت ہے۔

میں نے کراچی میں اپنا مکان ٹھیک کروانا تھا۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ ایک دو مکان دیکھے جن پر کام ہو رہا تھا۔ ان میں ایک مکان کا کام ہمیں اچھا لگا اور ٹھیکیدار کا نام پوچھ کر واپس آ گئے۔

کچھ روز بعد ہم پھر وہاں گئے تو کام مکمل ہو چکا تھا اور پتہ چلا کہ ٹھیکیدار حج پر چلا گیا ہے۔ ہم لوگ دو چار بار وہاں گئے اور ٹھیکیدار کا پوچھا تو وہاں بیٹھے چوکیدار نے وجہ پوچھی۔ ہم نے بتایا کہ ٹھیکیدار ایماندار لگتا ہے اور ہم اس سے کام کروانا چاہتے ہیں۔ چوکیدار نے کہا تم اس ٹھیکیدار کو کب سے جانتے ہو۔ ہم نے بتایا کہ ایک ہی بار ملے ہیں۔ دانشور چوکیدار نے کہا کہ اگر ایک بار ملنے پر تمہیں ٹھیکیدار ایماندار نظر آیا ہے تو ایسے بہت سے ایمانداروں کو میں جانتا ہوں اور پتے بھی دے سکتا ہوں کسی ایک کو کام پر لگا دو۔

میں اور میرا بھائی دانشور چوکیدار کی بات سن کر حیران ہوئے۔ ہم نے اس بات کا ذکر ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک سے کیا تو پاکستان کے سب سے بڑے بلڈر اور قبضہ گروپ کے لیڈر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہیں بیٹھے ایک دانشور ویٹر نے بتایا کہ ٹھیکیدار سبھی ایک جیسے ہی ایماندار ہوتے ہیں۔ کوئی مسالہ کم لگاتا ہے، کوئی سریا چوری کرتا ہے، کوئی بجری اور ریت چھپا لیتا ہے، بڑا بلڈر اور کنسٹرکشن کمپنی کا مالک وزیروں، جرنیلوں اور سربراہان مملکت کو رشوت دیتا ہے اور اسے سپیڈ منی کہتا ہے۔ چھوٹا ٹھیکیدار افسر کو رشوت اور چائے پانی دیتا ہے۔ سول میں اسے کرپشن اور رشوت کہتے ہیں اور فوج میں صوابدید کہا جاتا ہے۔ ڈی ایچ اے کا چیئرمین بھی ایک جرنیل ہوتا ہے جس کے لئے ڈی ایچ اے ایک محل بناتی ہے۔ یہ محل صوابدید ہے اور ڈی ایچ کے قوانین کے عین مطابق بھی۔

چھچھورے اور شوخ صحافیوں کی ایک محفل میں پلاٹوں، گاڑیوں، پرمٹوں، بیرون ملک دوروں، سوٹوں اور لفافوں کی بات ہو رہی تھی۔ کسی کو آصف زرداری کی دوستی پر فخر تھا، کوئی رحمان ملک کا راز دان تھا، کسی کو مشرف کا ہم مشرب ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور کوئی جرنیلوں کے گھروں اور دفتروں تک رسائی کی رضائی اوڑھے پاؤں پھیلا رہا تھا۔ صحافت، ادب، علم و

تحقیق کے علاوہ ہر ایک کی اعلیٰ سے اعلیٰ کوالیفکیشن تھی۔ سلیم صافی کو فخر تھا کہ حامد کرزئی اور دوسرے افغان وارلارڈ اس کے ذاتی دوست ہیں۔ کابل جانا اس کے لئے ایسے ہی ہے جیسے تہکال بالا سے تہکال پایاں۔ کابل سے آنے والا ہر وفد اس سے رہنمائی لیتا ہے اور اسکے سینے میں ایسے ایسے راز دفن ہیں کہ حال مت پوچھو۔

محفل گاہ کے دانشور پختون چوکیدار کا کہنا تھا کہ ایسے دانشوروں سے سارا سرحد بھرا ہوا ہے مگر سارے دانشور غریب مزدور ہیں ان کے پاس کالی چادریں اوڑھ کر بیٹھنے کا وقت نہیں۔ جتنے راز سلیم صافی جانتا ہے اتنے راز خود کرزائی، دوستم، استاد عطا، جلال الدین حقانی، سیف اللہ منصور اور ملاں عمر کے علم میں بھی نہیں۔

رہا کابل کے دوروں کا ذکر تو سارے شنواری ڈرائیور ہر روز کابل جاتے ہیں اور شام کو واپس آجاتے ہیں اور ان کے پاس بھی کالی چادریں ہیں اور کابل کے تازہ ترین حالات پر جامع اور مفصل تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

ان شنواریوں اور سلیم صافی میں فرق کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

دانشوری کا زعم، وزیروں، مشیروں سمیت ملک لوٹنے والوں سے میل ملاقات اور پبلسٹی پر فخر۔

بس اور کچھ نہیں۔ نینا نے جواب دیا۔

تم دانشور کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

شکر ہے تمہیں یاد آ گیا نینا نے سنبھلتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔

یہ دانشور ہرنائی کا رہنے ولا ایک سکول ٹیچر تھا۔ ایک سچا پاکستانی وطن پرست اور علم دوست استاد جسے نہ صرف حرفوں کی پہچان تھی بلکہ وہ ان کی زبان سے بھی واقف تھا۔ حروف استاد جمعہ خان کاکڑ سے باتیں کرتے تھے اور بتلاتے تھے کہ انکا مرتبہ اور مقام کیا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے۔ حروف کبھی نہیں بولتے۔ میں نے کہا۔

حروف تو بولتے ہیں مگر ہم سنتے نہیں۔ حروف لکھے ہوں تو ان کی قوت گویائی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ لاؤڈ ہو جاتے ہیں۔ ان کا وزن بڑھ جاتا ہے اور پڑھنے والے پر اثر کرتے ہیں۔ اگر پڑھنے والے کی قوت سماعت اچھی ہو اور ذہن آلائشوں سے پاک ہو تو اسے حرفوں کی زبان سنائی دیتی ہے۔ جب کوئی سچا حرف شناس حرفوں کی زبان سمجھ کر بولتا ہے تو وہی دانشور

کہلاتا ہے۔

کیا ایک سچے دانشور کی یہی تعریف ہے؟ میں نے پوچھا۔

ہاں۔نینا نے جواب دیا اور پھر کہنے لگی۔

بازاری اور سرکاری دانشور نہ علم دوست ہوتے ہیں اور نہ ہی وطن پرست ان لوگوں کا دین و ایمان جہازی اور کاغذی ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر بے جان اور مردہ حروف ترتیب دیتے ہیں اور ان مردہ اور مانگے ہوئے حرفوں پر کسی مردہ حرفوں کے ماہر سے ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ لیکر اپنے نام کے ساتھ پی ایچ ڈی لکھ کر دانشور بن جاتے ہیں۔

کاغذی دانشوروں کی ایک جماعت اور بھی ہے جنہیں روشن خیال اور روشن دماغ کہا جاتا ہے۔ روشن خیال دائیں اور بائیں بازوں والے کہلاتے اور ان کے بیچ والے روشن دماغ مذہب وملت کا راگ تو آلاپتے ہیں مگر مذہب کے نام پر ملت کو تقسیم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔ ان کا نعرہ تو اتحاد بین المسلمین ہے مگر جس قدر مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق کو ان لوگوں نے نقصان پہنچایا ہے کسی ہندو، سکھ، عیسائی اور یہودی نے نہیں پہنچایا۔ یہ لوگ اپنی بداعمالیوں کو یہود و ہنود کی سازش کہہ کر پھر سے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

سوات اور قبائلی علاقوں میں ہونے والی خونریزیوں کا سہرا بھی انہی روشن خیالوں کے سر ہے ۔ سرحد میں ایم ایم اے کی اسلامی حکومت کا پہلا حدف سوات تھا جہاں منظّم طریقے سے خونریزی کا منصوبہ بنایا گیا اور لاکھوں لوگوں کو بے عزت و بے حرمت کرکے دربدر کردیا گیا۔ پہلے مولانا صوفی محمد اور مولوی فضل اللہ کو جیلوں سے رہا کیا گیا، پھر انہیں مسلح کرکے قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنے کے لیے کھلی چھٹی دی گئی اور جب ان کے لشکر مردان کی طرف چلے تو اسمبلی میں کھڑے ہوکر شور مچایا کہ فوج کہاں ہے۔ لشکری مارگلہ کی پہاڑیوں پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔کیا ان لوگوں کو پہلے پتہ نہیں تھا کہ جو کانٹے انہوں نے بوئے ہیں اس پر بمعہ فوج ساری قوم کو ننگے پاؤں چلنا ہوگا اور یہ سفر بڑا ہی لمبا اور طویل ہوگا۔

اگر مذہبی روشن خیال اور اتحاد بین المسلمین کا نعرہ لگانے والے چاہیں تو قبائلی علاقوں سمیت سارے پاکستان میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ پاکستان میں امن اور خوشحالی کیلئے ضروری ہے کہ سعودی عرب اور ایران اسلامی اخوت اور بھائی چارے کا ثبوت دیں اور افغانستان اور پاکستانی قبائلی علاقوں میں اپنے اثر ورسوخ کو فرقہ واریت کے بجائے امت مسلمہ کی بہتری اور بھلائی

کیلئے استعمال کریں۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے فضل الرحمٰن کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ لوگ اپنے فرقوں اور مسلک کی بنیاد پر حکمرانی کا خواب پورا نہیں کر سکتے او نہ ہی سیدھے سادھے مسلمانوں کے دلوں سے حبُ رسول ﷺ کا روحانی جذبہ اور علمائے حق اور اولیائے کاملین کی عزت تکریم ختم کر سکتے ہیں۔

جماعت اسلامی اور جمعیت سمیت اس مسلک کے علماء اور دانشورر جتنا زور نبی ﷺ کو اپنے جیسا انسان اور اولیائے کرام کو بدعتی ثابت کرنے پر صرف کرتے ہیں اگر اس سے کم قوت اتحاد و اتفاق پر لگائیں تو ملک امن کا گہوارہ بن سکتا۔

کیا تم دو باتوں کی وضاحت کرو گی؟ میں نے کہا۔

تین پوچھ لو۔۔نینا نے جواب دیا۔

(۱) تم نے جمعیت علمائے اسلام کو جمعیت فضل الرحمٰن کہا ہے۔

(۲) دوسرے تم نے حضور ﷺ کو اپنے جیسا ثابت کرنے کی سعی کا ذکر کیا ہے۔

(۳) اگر تم تیسری بات کی وضاحت کرنا چاہو تو یہ بھی بتا دو کہ جو کچھ مزارات پر ہوتا ہے کیا وہ سب ٹھیک ہے اور اس کا روحانیت سے کوئی تعلق ہے؟

غور سے سنو اور ایک ہی بار سن لو۔نینا نے کہا۔

جمعیت علمائے اسلام ایک وسیع تر معنی کا حامل نام ہے جس کا مطلب دین اسلام کا علم رکھنے والے علماء کی جماعت جس کا تعلق کسی خاص فرقے ،مسلک یا طبقے سے نہ ہو۔ اسلام صرف دیوبندی علماء اور ان کے متعلقین کا نام نہیں۔ اہل تشعی اور اہل سنت بھی مسلمان ہیں اور ان دونوں مسالک کا تعلق اسلام سے ہے۔ جمعیت علمائے اسلام مولانا فضل الرحمٰن ان کے والد محترم جناب مولانا مفتی محمود کی جماعت ہے جو ان کے بیٹے مولانا فضل الرحمٰن کو وراثت میں ملی ہے۔اگر یہ جمعیت جماعت اسلامی کی طرح ہوتی تو پھر بھی ہم اسے ایک مسلکی جماعت کہہ سکتے تھے چونکہ جماعت اسلامی مولانا مودودی مرحوم کے بعد ان کے بیٹوں کو وراثت میں نہیں ملی۔ وراثت اور ملکیت ہی کا مسئلہ آڑے آیا تو مولانا سمیع الحق نے اپنا دھڑا جمعیت سے علیحدہ کرلیا اور وہ اسی نام کے سمیع الحق گروپ کے صدر بن گئے۔ جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ کا سیاسی کریکٹر پیپلز پارٹی، مسلم لیگ چوھدری گروپ اور نواز گروپ سے مختلف نہیں۔ جمعیت فضل الرحمٰن واحد دینی جماعت ہے جس کے اسمبلی ممبروں میں ہندو سکھ اور کرسچن بھی ہیں اور وہ اپنے

دہرم کے عالم نہیں بلکہ عام سیاسی کارکن ہیں۔ یہ جماعت جمعیت فضل الرحمٰن اسلئے بھی ہے چونکہ کوئی عالم دین سوائے مولانا فضل الرحمٰن کے اس پارٹی کی قیادت کا اہل ہی نہیں جبکہ مولانا فضل الرحمٰن ڈاکٹر طاہر القادری، مولانا مودودیؒ اور دوسرے بیشار علمائے کرام اور مفکرین کی سطح کے عالم دین بھی نہیں۔ سیاست میں اخلاقی اور قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اختلاف رائے کا حق ہے۔ مروجہ اخلاقی اصول و ضابطے سیاسی حدود کا تعین کرتے ہیں مگر جب کوئی جماعت اپنے نام کے ساتھ دینی سیاسی جماعت کا اضافہ کرلے تو پھر اس جماعت پر دینی ضابطوں کا اطلاق بھی ہوتا ہے جس کا دائرہ کار قرآن و حدیث اور سنت رسول ﷺ کی پیروی سے باہر نہیں ہوسکتا۔

قرآنی اور اسلامی تاریخ کا آغاز تخلیق کائینات اور پیدائش آدمؑ سے ہوتا ہے۔ حضرت آدمؑ پہلے مکمل انسان تھے جن کی تخلیق اس مٹی سے ہوئی جو کائناتی اجزاُ کے جواہر کا مرکب تھی۔ پھر خالق کائنات نے اس وجود میں اپنے حکم سے روح پھونکی اور اسے زندگی عطا کی۔ ربّ نے آدمؑ کو بہترین شکل و صورت دی اور اسی مادے سے انکا جوڑا حضرت حواؑ کا وجود تخلیق کیا اور روحانی اور جسمانی لحاظ سے مکمل اس تخلیق کا ٹھکانہ جنت بنایا۔ غور طلب بات ہے کہ جنت جیسے متبرک مقام کے بھی اصول و ضابطے بنائے گئے اور آدمؑ اور حواؑ کو جنت میں ہی موجود ایک شجر کے قریب جانے سے منع کردیا گیا۔ جنت کے بعد حضرت آدمؑ اور اماں حواؑ کو حکم ہوا کہ زمین پر اترو اور پھر زمین پر بھی آدمؑ اور اولاد آدمؑ کیلئے قوانین وضع کیے گئے جسے ایک رسول کی سنت اور شریعت کا نام دیا گیا۔

قرآنی بیان کے مطابق اللہ کے رسول اپنی جانب سے کچھ نہ کہتے تھے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کے متعلق بیان ہے کہ آپ ﷺ کی عام باتیں بھی حکم خداوندی کے تابع تھیں۔ اسطرح ایک نبی اور رسول جو کہتا ہے اور کرتا ہے وہ حکم ربی کے تحت ہی ہوتا ہے۔

دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول آئے انہیں ایک کتاب یا صحیفہ دیکر بھیجا گیا جو اللہ کے بنائے اور بتائے ہوئے قوانین کا مجموعہ تھا۔ جن لوگوں نے ان کتابوں اور قوانین کی پیروی کی انھیں اپنے ربّ کی طرف سے انعامات ملے اور جنہوں نے روگردانی کی ان پر عذاب نازل ہوا۔

چونکہ آپ ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا اور نہ ہی خالق کل کی طرف سے قرآن کے بعد کوئی کتاب اور حکم نازل ہونا ہے اس لئے آپ ﷺ ساری کائنات کیلئے تا قیام قیامت ہادی اور

مرسل بنائے گئے اور قرآن پاک ساری انسانیت کیلئے رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنا کر نازل کیا گیا۔

قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے اقوال جنھیں مجموعہ احادیث کہا جاتا ہے انسان کی رہنمائی کے واضع اصول اور تسلیم شدہ قوانین کا بیش و بہاخزانہ ہے اس عظیم خزانے کی موجودگی میں آپ ﷺ نے اجتہاد کا راستہ بھی دکھلایا تا کہ آنے والے دور میں ظاہری، مادی، ناسوتی اور سائنسی علوم کی ترقی انسان کو گمراہی کے سمندر میں نہ ڈالے اور انسان ان علوم کی روشنی میں حقیقت سے غافل ہو کر مادیت کی دلدل میں نہ گرے۔

جوں جوں سائنس نے ترقی کی اور جدید مادی علوم پر انسان کو دسترس حاصل ہوئی، علمائے حق نے بھی اسلامی قوانین کو قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ اجتہاد کی روشنی میں ڈھالا تا کہ عوام الناس مادیت کی چکا چوند کو کسی شعبدے سے تعبیر کرنے کے بجائے اسے عطیہ خداوندی سمجھیں اور ان ایجادات سے فائدہ اٹھا کر اپنے خالق کی عظمتوں اور چھپی ہوئی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ربّ کے شکرگزار بندوں میں شمار ہوں۔ قرآن اور سائنس کے موضوع پر درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ جو کچھ سائنسی علوم کے ذریعے ہم پر عیاں ہو رہا ہے درحقیقت وہ ربّ کی طرف سے ہی عطیہ ہے۔ جوں جوں سائنس ترقی کر رہی ہے توں توں قرآنی حقائق سے پردے اٹھ رہے ہیں اور سائنسدان قرآن کی اس آیت کا مفہوم سمجھنے لگے ہیں کہ ”تم اپنے ربّ کی کون کون سے نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“۔

سورۃ الرحمٰن کے اسباق کو ہی لیں۔ فرمان خداوندی ہے کہ اے جن وانس اگر ہمت ہے تو زمین وآسمان کے کناروں سے نکل جاؤ۔ آج سائنس نے ربّ کے اس چیلنج کا جواب ڈھونڈ لیا اور اپنی عاجزی اور بے بسی کا بھی اظہار کر دیا۔ سٹیفن ہاکنگ اپنی تصنیف ”اے بریف ہسٹری آف ٹائم“ میں لکھتا ہے کہ 1929ء میں ایڈون ھبل نے مشاہدہ کیا کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور کہکشائیں بتدریج ایک دوسرے سے دور بھاگ رہی ہیں۔ یہی بات چودہ سو سال پہلے خالق کائنات نے اپنے نبی ﷺ کی زبانی اور قرآنی تعلیمات کے ذریعے بتائی کہ ہم نے آسمانوں کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور انھیں مسلسل وسعت دیتے جاتے ہیں اور یہ عمل جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ جب کائنات مسلسل پھیل رہی ہے تو کسے ہمت ہے کہ وہ خدا کی قائم کردہ حدوں کو پھلانگنے کی جرأت کرے۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ چیلنج صرف انسانوں کیلئے نہیں بلکہ

جنوں کے لیے بھی ہے جن کی پیدائش آگ کے شعلوں سے ہوئی اور انہیں بغیر کسی سائنسی ایجاد کے تمامتر ناری کروّں تک رسائی حاصل ہے۔ بہت سے لوگ کیرن آرم سٹرانگ کی تصنیف ''خدا کی تلاش'' کو اہمیت دیتے ہوئے واہ واہ کرتے ہیں مگر مصنفہ خود اپنی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کیرن نے خدا کی تلاش جس راستے سے کی وہ راستہ پیچیدہ اور پرخار ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کیرن کا راستہ خدا کی طرف نہیں جاتا چونکہ خدا ہر جگہ اور ہر سمت ہے۔ خدا نے خود اپنے نبی اور بندے موسیٰؑ سے کہا کہ دکھی اور پکارنے والے دلوں میں رہتا ہوں۔ جب میرے بندے دنیا سے مایوس ہو کر مجھے پکارتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں۔

ربّ نے مایوسی کو گناہ قرار دیا اور مجبوروں اور محکوموں کی رہنمائی کیلئے وسائل پیدا کیئے۔ میرے پسندیدہ شاعر اور صوفی میاں محمد بخشؒ نے کیرن جیسے دوسرے متلاشیان حق کیلئے ہی کہا'' اک بندیاں دا دل نہ ڈھاویں میرا ربّ دلاں وچ رہندا'' جب انسان کا دل گداز ہو اور وہ واقعی اپنے ربّ سے ملنے کا آرزومند ہو تو بقول اقبالؒ کے خدا بندے سے خود پوچھتا ہے کہ بتا تو کیا چاہتا ہے۔ خدا کی تلاش مذاہب کے تقابلی جائزے سے نہیں ہوتی۔ خدا تک رسائی کا نقشہ ہر دل میں موجود ہے۔ میاں محمد بخشؒ نے کہا ہے ''ہنجوں لاگت پانی دیویں تے ریت مٹی رڑ جاوے'' جب انسان یکسوئی سے اپنے ربّ کو اپنے دل کی گہرائیوں میں تلاش کرتا ہے تو دل و دماغ پر چھایا گرد و غبار آنکھوں سے بہہ کر انسانی وجود میں چھپے جواہر کو عیاں کر دیتا ہے۔ رومیؒ نے اسی سمندر میں غوطہ لگایا اور زندگی کا راز پا گیا۔

نینا نے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگی۔ میں جمعیت کی بات کر رہی تھی اور دور نکل گئی۔ یہ میرا المیہ ہے۔

جمعیت علمائے اسلام ایک سیاسی جماعت ہے جس کا کرتا دھرتا مولانا فضل الرحمٰن نامی ایک شاطر سیاستدان ہے۔ دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح یہ جماعت ایک گھرانے کی ذاتی ملکیت ہے جس کے اصول وضوابط نہ اسلامی ہیں اور نہ ہی اخلاقی۔ اسلام اخلاقیات کا درس دیتا ہے جبکہ مروجہ سیاست اخلاقیات سے بالاتر مفادات اور تضادات کا مجموعہ ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کا مشن اور مقصد وہی ہے جو آصف علی زرداری، نواز شریف، اسفندیار ولی، الطاف حسین اور چوھدری شجاعت کا ہے۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ کوئی شخص نام سے مسلمان نہیں ہوتا۔ مسلمان ہونے کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ اسی طرح کسی جماعت یا گروہ کا نام اسلامی

رکھنے سے اس کا کریکٹر اسلامی نہیں ہوسکتا۔ مولانا فضل الرحمٰن کے ہوس وحرص کا وہی حال ہے جو دوسروں کا ہے۔ یہ جماعت نہ قرآنی اور اسلامی اوصاف سے مزین ہے اور نہ ہی دیگر مسلمان مسالک کے لیے وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

خدانہ کرے اگر روس، امریکہ یا بھارت پاکستان پر قابض ہوجائیں تو جمیعت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ، عوامی نیشنل پارٹی ، ایم کیو ایم اور چوہدری حضرات کو کسی غیر ملکی قابض حکمران اور ملک کے ساتھ شراکت اقتدار پر اعتراض نہ ہوگا۔ بشرطہ کی وزارتیں ان کی پسند کی ہوں اور حکومت ان کے اشاروں پر چلے۔

پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور جمات اسلامی کو کیوں نہیں۔ میں نے کہا۔

جماعت اسلامی پاکستان کی واحد سیاسی اور دینی جماعت ہے جس میں جمہوریت ہے، قوائد وضوابط کی پابندی ہے، اختلاف رائے کا حق ہے، پابندی سے اور متعین وقت کے اندر پارٹی میں ہر سطح پر انتخابات کا نظام رائج ہے جس پر سختی سے عمل بھی ہوتا ہے۔ کسی خاندان اور قبیلے کی اجارہ داری نہیں اور جو کوئی پارٹی چھوڑ کر چلا جاتا ہے نہ اس کی کردار کشی ہوتی ہے اور نہ ہی اسے ذلیل ورسوا کیا جاتا ہے۔۔

جماعت اسلامی ہزار ہا خامیوں کے باوجود پاکستان مخالف قوتوں کی آلہ کار نہیں اور نہ ہی ملکی مفاد کو ذاتی مفاد پر قربان کرسکتی ہے۔ جماعت اسلامی کے فیصلے کسی ایک شخص کی ذاتی پسند و ناپسند پر نہیں ہوتے اور نہ ہی صدر جماعت کو اپنے یا اپنے دوستوں یاروں کیلئے پرمٹ اور پلاٹ لینے اور سیاست کے نام پر تجارت کا حق حاصل ہے۔

پیپلز پارٹی ایک سیکولر رجحان رکھنے والی جماعت ہے جس پر لگ بھگ نصف صدی تک بھٹو خاندان کی اجارہ داری رہی اور اب یہ جماعت زرداری خاندان کے قبضے میں ہے۔ بینظیر بھٹو کے بعد اس کا بیٹا زرداری بھٹو کے نام سے پارٹی کا چیئرمین اور بینظیر مرحومہ کا شوہر آصف علی زرداری شریک چیئرمین اور ملک کا صدر تو بن گیا ہے مگر پیپلز پارٹی کے حقیقی کارکن جنہیں جیالے کہا جاتا ہے زرداری خاندان کو بھٹو تسلیم کرنے اور بینظیر کی وصیت کو ماننے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں مگر قائداعظمؒ اور حسین شہید سہروردی کے بعد بھٹو جیسا ذہین اور دانشور سیاستدان اس ملک کو نصیب نہیں ہوا۔ بینظیر میں بھی اپنے باپ کی کئی خوبیاں تھیں مگر بلاول میں ایسی کوئی خوبی نہیں۔ بلاول اپنے باپ

کی خصلت اور جبلت کا وارث ہے اور اسی کے نقش قدم پر چلے گا۔

پیپلز پارٹی کو زرداری خاندان اور انکے بہی خواہ کس طرح چلاتے ہیں اس کا فیصلہ مستقبل کریگا۔ اگر یہ پارٹی اپنا سیکولر کریکٹر اور بھٹو کے بنائے ہوئے اصولوں پر گامزن رہتی ہے تو اس کا وجود بھی قائم رہے گا ورنہ یہ جماعت مسلم لیگ کی طرح کئی دھڑوں میں بٹ کر اسٹیبلشمنٹ کی آلہ کار بن جائے گی۔

جاگیردارانہ ذہنیت اور مغربی تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ذوالفقار علی بھٹو عام لوگوں کے دکھ درد کا مداوہ کرنے اور جنگ سے تباہ حال پاکستان کی تعمیر نو کا عزم لیکر نکلے۔ بھٹو نے مختصر عرصے میں اپنے آپ کو عوامی لیڈر منوالیا جس کا اثر ان کی موت کے بعد بینظیر کی زندگی تک قائم رہا۔ بھٹو کی قائدانہ صلاحیتوں نے اہل مغرب اور امریکہ پر واضح کردیا کہ یہ شخص اپنی شخصیت اور قابلیت کی بنیاد پر عالم اسلام کا واحد لیڈر اور رہنما بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ایٹمی پروگرام کی بنیاد، چین کی مدد سے دفاعی ساز و سامان تیار کرنے کی فیکٹریاں، روس کے اشتراک سے سٹیل ملز اور گڈو بیراج کی تعمیر، اسلامک سوشلزم کے نظریے کا پرچار، قادیانیوں کو غیر مسلم اور جمعہ کو چھٹی کا دن قرار دینا، شراب پر پابندی، متفقہ آئین کی منظوری، اسلامی کانفرنس کا انعقاد اور مسلم ممالک کے درمیان رابطوں اور مشترکہ اسلامک بلاک کی تشکیل نے اہل مغرب اور امریکہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔۔

بھٹو کی شخصیت سے متاثر ہو کر جنم جنم سے بھارت نواز افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ اور پھر سردار داؤد نے پاکستان اور افغانستان پر مشتمل کنفیڈریشن کی تجویز دی جس کی پاداش میں ظاہر شاہ کی حکمرانی اور سردار داؤد کی جان چلی گئی۔ ظاہر شاہ نے تو پاکستان، افغانستان، ایران اور ترکی پر مشتمل ایک مضبوط بلاک کی تجویز دی چونکہ پاکستان، ایران اور ترکی پہلے ہی آر۔سی۔ڈی کے بندھن میں بند چکے تھے جس میں افغانستان کو شامل کر کے قربت کی کچھ اور کڑیاں ملانے کی ضرورت تھی۔

سعودی عرب کے عظیم فرمانروا اور عالم اسلام کے اتحاد داعی شاہ فیصل شہید اور ذوالفقار علی بھٹو کی سوچوں میں ہم آہنگی تھی۔ شاہ ایران، شاہ فیصل، اردن کے شاہ حسین، لیبیا کے معمر القذافی سمیت بہت سے سربراہان کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور تحفظ کیلئے ایک اسلامی تنظیم کی اشد ضرورت ہے تاکہ ملت اسلامیہ ایک پلیٹ فارم سے اور ایک قوت

بنکر ابھرے اور ربّ کے عطا کردہ خزانوں سے امت مسلمہ فیض یاب ہوسکے۔

سوچنے کی بات ہے کہ قدرت کے خزانوں سے مالا مال اسلامی ممالک اگر ایک بلاک میں ضم ہوکر یورپی یونین کی طرز پر خلافت اسلامیہ کے بندھن میں بند جائیں تو نہ صرف مسلمان آسودہ حال اور باعزت ہوجائیں بلکہ دنیا بھر کی محکوم اور مظلوم اقوام کو جینے کا حق بھی مل جائے۔

خلافت اسلامیہ سے جہاں مسلمان محکومی کے شکنجے سے نکل جائینگے اور مسلک کی بنیاد پر جھگڑے ختم ہونگے وہیں اہل مغرب اور امریکہ کی اجارہ داری اور تھانیداری بھی ختم ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بھٹو کو عدالت سے اور شاہ فیصل کو سگے بھتیجے سے شہید کروایا گیا۔ قذافی ایک عرصہ تک دنیا سے کٹ گیا، سویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا اور امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن گیا۔ شاہ ایران کا خاتمہ ہوا اور کولڈ وار کے اختتام پر امریکہ نے اپنے اتحادیوں اور باجگزاروں کی مدد سے ایک نئے کروسیڈ کا آغاز کردیا۔

امریکہ نے پہلے صدام حسین کی پشت پناہی کی اور طویل عرصہ تک ایران عراق جنگ نے اسلامی دنیا کے بے پناہ وسائل کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ ایران عراق جنگ کے خاتمے پر عراق نے کویت پر قبضہ کیا جس کی شہ بھی امریکہ نے دی اور پھر کروسیڈی یلغار کا باقائدہ اعلان ہوا جسے اقوام متحدہ کی منظوری بھی حاصل تھی۔ عراق پر امریکی حملے نے ملت اسلامیہ کا رہا سہا اتحاد بھی ختم کردیا اور اہل مغرب اور امریکہ پر واضح ہوگیا کہ عرب ممالک سمیت دنیا بھر کے اسلامی ملک ایک ایسی شکارگاہ ہیں جہاں کسی بھی وقت کسی کو بھی شکار کرنا انکا بنیادی حق ہے۔

بھارت میں سکھوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوئی اور ہزاروں سکھ مارے گئے، کشمیر کی سرسبز اور خوشبودار وادیوں کو بارود کی بو اور انسانی خون سے سرخ کردیا گیا، سینکڑوں پاکستانیوں کو چلتی ٹرین میں جلا دیا گیا، بوسینا، چیچنیا اور ارض فلسطین میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی مگر نہ اقوام متحدہ کا ضمیر جاگا اور نہ ہی انسانی حقوق کا نام نہاد واویلہ کرنے والوں کو خبر ہوئی۔ یہ سب کیوں ہوا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ آج عالم اسلام ایک لیڈر، ایک امام اور مصلح سے محروم ہے۔

امت مسلمہ کو ایک شاہ فیصل، ایک قائداعظم یا ایک ذوالفقار علی بھٹو کی ضرورت ہے اور پاکستان کی حد تک ایک حسین شہید سہروردی کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر پیپلز پارٹی کا ہی تجزیہ کریں تو آصف علی زرداری اور بلاول زرداری میں ایک تحصیل کا نظام چلانے کی بھی

صلاحیت نہیں مگر ایسے لوگوں کو ملکی نظام چلانے کیلئے منتخب کرنے والی قوم کی عقل وشعور کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں۔

پیپلز پارٹی ایک دوراہے پر کھڑی ہے جہاں ایک طرف بھٹو کی دانش اور سیاسی بصیرت کا اثاثہ ہے جسے اٹھانے اور سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ دوسرے جانب زرداری خاندان اوران کے مرید ومربی ہیں جواس اثاثے کو اپنے ٹریڈ مارک کے ساتھ نیلام کرنے کے درپے ہیں۔

اب تم یہ بھی پوچھو گے کہ بھٹو کا اثاثہ کیا ہے؟ تو سنو۔

ہر سیاسی جماعت کا اثاثہ اس کے نظریات، عوام کی خدمت اور بہتری کا منشور اور ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی حدود کے تحفظ کا منصوبہ اور باشعور کارکن ہوتے ہیں۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی میں سیاسی کارکنوں کی پارٹی منشور کے مطابق تربیت نہ ہوسکی چونکہ بھٹو کو ایک وقت میں ہزاروں کام کرنے پڑے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ بھٹو نے ایک نئی ٹیم کیساتھ نئے پاکستان کی تعمیر کا آغاز کیا تو آدھا پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا اور باقی جاگیردارانہ نظام کے محافظوں، مذہبی، علاقائی اور لسانی سیاست کے علمبرداروں اور بھٹو کے سوشلزم کے درمیان کشمکش کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ بھٹو کے بعد ضیاالحق کے طویل فوجی اقتدار نے سیاسی کارکنوں کو جیالہ بنادیا چونکہ سیاسی کارکنوں کی تربیت کا معیار اکھاڑ پچھاڑ، برادری ازم اور علاقائی اور لسانی مفادات مقرر ہوا۔ بینظیر کے دور میں لوگوں نے پیسہ لگا کر پارٹی عہدے اور اہم حلقے خرید لئے اور جیالہ پن کا ایک نیا روپ سامنے آیا جس کا بھٹو کے سیاسی منشور اور نظریات سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

بینظیر کے بعد ایک وصیعت کے تحت پارٹی کا نظام آصف علی زرداری کو منتقل ہوا جو سراسر ایک غیر سیاسی اور غیر جمہوری عمل ہے۔

حیرت کی بات یہ کہ اس غیر سیاسی اور غیر جمہوری عمل کو اٹھارویں آئینی ترمیم کے ذریعے آئین کا حصہ بنادیا گیا اور سیاسی جماعتوں کے عہدیداروں کو الیکشن کے بجائے سیاسی لیڈروں کی صوابدید قرار دے دیا گیا۔ نواز شریف، زرداری، شجاعت، الطاف حسین اور اسفندیار ولی کو پتہ ہے کہ ان کے اثاثے اور مال و دولت ملک سے باہر ہیں اور خود ان کا وجود بھی پاکستان میں محفوظ نہیں اس لئے متفقہ طور پر آئین میں یہ سہولت پیدا کر لی گئی کہ یہ لوگ چاہئے اسمبلی یا سینٹ کے ممبر ہوں یا نہ ہوں ان کی سیاسی جماعتیں جو کہ ان کے اثاثہ جات کا حصہ ہیں اور ایک بزنس فرم کی طرح ان کی ذاتی ملکیت ہیں ان کے کنڑول میں رہیں۔ الطاف حسین دو عشروں سے خود

ساختہ جلاوطنی پر مجبور ہیں اور اب برطانوی شہری ہیں۔ بینظیر اور نواز شریف عرصہ تک جلاوطن رہے اور آصف علی زرداری کو بھاگنے کا موقع نہ ملا اور قید کردیے گئے۔ چوہدریوں کے گرد گھیرا تنگ ہوا تو ضیاالحق کی طرح مشرف کی بیعت کرلی اور پھر گھریلو ضرورت کے تحت زرداری کو بھی پیر مان لیا۔ اسفند یار ولی تو روزاوّل سے ہی آصف علی زرداری کے ساتھ شریک اقتدار ہیں مگر اب وہ اور ان کا خاندان پاکستان میں محفوظ نہیں رہے اور آئیندہ زندگی میں انہیں بھی دبئی، لندن یا پھر نیویارک میں بیٹھ کر صوبہ سرحد میں سیاست کاری کا کام کرنا ہوگا۔

بات لمبی ہوگئی ہے اور حسب معمول سمت بھی بدل گئی ہے۔ میں نے نینا کو روکتے ہوئے کہا۔

شکریہ۔ نینا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر بولی۔

پاکستانی سیاسی نظام ٹھیکیداری نظام میں بدل گیا ہے۔ سیاست عوامی حلقوں سے نکل کر ٹیلیویژن چینلوں تک محدود ہوگئی ہے جہاں کھلنڈرے اور شوخ طبع اینکروں میں نت نئے رجحان پروان چڑھ رہے ہیں۔ اینکر بازی کے کھیل میں جوں جوں مقابلہ بڑھ رہا ہے کرپٹ سیاسی نظام کی حمایت اور لوٹ مار کرنے والے سیاستدانوں کے ترجمانوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ گالی گلوچ، ہاتھا پائی، فحش ولغو جملے بازی اور اخلاقی حدود سے باہر نکلتی الزام تراشی سیاست کا لازمی جز بن گئی ہے۔

آج کا پاکستانی سیاستدان اور سیاسی نظام اخلاقیات سے مبرا ہو چکا ہے اور پاکستانی عوام میں اس اخلاق باختہ نظام کو رد کرنے کا شعور ہی نہیں۔ برائی اور اچھائی میں تمیز عوامی عقل وشعور کا خاصہ ہی نہیں رہا اسلئے مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی مستقبل میں اپنا وجود قائم رکھنے کیلئے کیا اقدام کرتی ہیں اور قوم ان دو پارٹیوں کے ڈائریکٹروں اور منافع خوروں کے ہاتھوں کس حد تک بکنے کا حوصلہ رکھتی ہے کا حتمی فیصلہ ہی مستقبل کی سیاست کی راہ متعین کریگا۔ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے تمام دھڑوں اور گروپوں کا سیاسی کریکٹر ایک جیسا ہے اور وہ بظاہر اور کھل کر پاکستان کے وجود کو نقصان پہنچانے کا حوصلہ نہیں رکھتیں۔ ایک جماعت کے ماتھے پر تخلیق پاکستان کی پٹی بندی ہے اور دوسری تعمیر پاکستان کا عزم لیکر میدان میں اتری تھی۔ قائداعظمؒ کی مسلم لیگ نے اپنے عزم کی تکمیل کی اور بھٹو کو جلدی نے مروا دیا۔ تکمیل پاکستان اور تعمیر پاکستان دونوں جماعتوں کے پاؤں کی بیڑیاں ہیں۔ ان کے ہاتھ اور زبانیں آزاد ہیں اسلئے کرپشن، لوٹ مار،

بداخلاقی، بدعہدی اور بدکلامی میں ایک دوسرے کو مات دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ان کے پاؤں پر پڑی بھاری زنجیرانہیں ملک دشمن قوتوں کا ایجنٹ بننے سے روکتی ہے ورنہ خواہشات کاخمیر سب کا یکساں ہے۔

موجودہ پیپلز پارٹی زرداری گروپ کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بھٹوازم اور بینظیر ازم ہے۔تم نے دیکھانہیں کہ عدلیہ کی بحالی میں بینظیر نے بعداز مرگ کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک طرف زرداری، کائرہ، فوزیہ وہاب اور بابر اعوان کھڑے تھے اور دوسری طرف بینظیر۔بینظیراس ٹولے کی ہر بات کورد کررہی تھی۔ ہرٹیلیویژن چینل پر بینظیر چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ افتخارمحمد چوہدری میرے چیف جسٹس ہیں ان کے گھر پرجھنڈا لہراؤنگی۔نواز شریف بھی بینظیر کے اقوال کا حوالہ دے رہے تھےمگرزرداری خاموش تھے۔آخر زرداری گروپ ہار گیا اور بینظیرا کیلی جیت گئی اورافتخارمحمد چوہدری کے گھر پر پاکستان کا جھنڈا لہرادیا گیا۔

اسی طرح بھٹو کے دوست اور دشمن سبھی معترف ہیں کہ بھٹودانشور تھے، جدید تعلیم سے آراستہ تھے اور سیکولر رجحان کے حامل دلیر اور باجرأت سیاستدان تھے۔بھٹو کی ذات کرپشن سے مبرا تھی۔آج بھٹو کی جماعت ایک ایسے شخص کی ذاتی ملکیت ہے جس کا بھٹوازم سے دور کا بھی رشتہ نہیں۔سوچ، فکر اور عمل میں میلوں اور سالوں کا فاصلہ ہے تو پھر زرداری بھٹو کے جانشین کیسے ہوسکتے ہیں۔خیر بات پھرلمبی ہوجائے گی اور میں حسب عادت ٹریک سے ہٹ جاؤں گی۔

شکر ہے تمہیں احساس ہوگیا۔میں نے کہا۔

پھرقصہ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

قصہ طویل ہوگیا ہے مگرمختصر خلاصہ یہ ہے کہ مولانافضل الرحمٰن سیاستدان نہیں سیاسی کھلاڑی ہیں جوکسی باؤنڈری یالائن پرکھیلنے کے قائل نہیں۔ وہ مذہب کو ذاتی مفادات اور سیاسی چسکے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دین اسلام خالق کل کا نظام ہے جس کی حدود کا تعین بھی ربّ کائنات نے کردیا ہے۔اگرکوئی شخص ان حدود سے تجاوز کرکے اپنی ذات کیلئے دین کواستعمال کرتا ہےتو وہ نہ دین کی خدمت کرتا ہے اور نہ ہی ملک کی۔ ایسا شخص عالم دین بھی نہیں ہوسکتا چونکہ چوغہ و دستارمولوی کی پہچان ہے دین کی علامت نہیں۔ اسلئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ مولانا کی جماعت پیپلز پارٹیوں اورمسلم لیگوں کی طرح ان کی ذاتی پراپرٹی ہے جس کا وہ کچھ بھی نام رکھ سکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی ان کی تقلید کریں۔ ہاں اگر اس

جماعت میں شیعہ اور سنی علماء بھی شامل ہوں تو جمعیت علمائے اسلام کا مفہوم واضع ہوسکتا ہے ورنہ یہ جماعت جمعیت فضل الرحمٰن ہی ہے۔

اب میں تمہارے دوسرے سوال کا جواب دیتی ہوں۔

نینا نے کچھ سوچا اور پھر بولی۔

یہ انتہائی نازک مسئلہ ہے۔مسلمانوں کا ایک طبقہ اس بات پر اپنی توانائیاں ضائع کر رہا ہے کہ آپ ﷺ بشر ہیں۔آپ ﷺ کو غیب کا علم نہ تھا۔اور تیسرا مسئلہ حاضر و ناظر کا ہے۔

دوسرا طبقہ جنہیں ہم اہل سنت بریلوی مسلک کہتے ہیں، آپ ﷺ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں، آپ ﷺ کے وجود کو نورانی وجود کہتے ہیں اور انکا عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ کو علم غیب تک رسائی تھی۔

دیوبندی مسلک جنکا عقیدہ سعودی عرب کے وہابیوں اور اہل حدیث سے ہم آہنگ ہے ان تین بلکہ چار مسائل پر بحث کرتے ہوئے حد سے نکل جاتے ہیں۔کفر وشرک کے فتوے تو کیا یہ لوگ اپنے ہی نبی ﷺ کی شان میں ایسے ایسے نقاط اٹھاتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا یہ اسی نبی ﷺ کی امت ہے جس کا یہ کلمہ پڑھتے ہیں۔

دیوبندی مسلک اور ان کے قریب تر مسالک کے علماء بریلویوں کو بدعتی کہتے ہیں۔بدعت کا مطلب اضافہ ہے، کفر وشرک نہیں۔میں نے بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور وہابی علماء سے اس مسئلے پر بحث کی تو بہت سے علماء کے پاس محض ہٹ دھرمی کے کوئی مثبت جواب نہ تھا۔

میں نے دیوبندی علماء کو ہمیشہ سورۃ جن کی آخری چار آیات کا حوالہ دیا جس میں ربّ کائنات نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ کہہ دو کہ جس دن کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے میں نہیں جانتا کہ وہ عنقریب آنے والا ہے یا میرے ربّ نے اسکی مدت بڑھادی ہے۔یہ بیان قیام قیامت کا ہے۔پھر فرمایا غیب کی بات جاننے والا وہی ربّ ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔ہاں رسولوں میں سے جسے چاہے تو اس کو غیب کی باتیں بتا دیتا ہے اور اس کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تا کہ معلوم فرمائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے ہیں اور یوں اس نے ان کی سب چیزوں کو ہر طرف سے قابو کر رکھا ہے اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔

یہ بیان قیام قیامت کے جواب میں ہے۔منافقین حضور ﷺ سے پوچھتے تھے کہ قیامت کب بپا ہوگی تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اسکا علم صرف ربّ تعالیٰ کو ہے وہ چاہے تو عنقریب

لے آئے اور چاہے تو اسکی مدت بڑھا دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا! اے نبی ﷺ انہیں کہہ دو کہ اسکا وعدہ تو ہے اور قیامت آ کر رہے گی۔ کب آئے گی اس کا علم اسی پاک ہستی کو ہے جس نے ہر چیز کو اپنے قابو میں رکھا ہے۔ پھر علم غیب کے متعلق بیان ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے مگر اس نے اپنے نبیوں میں سے جنھیں پسند کیا انھیں علم دیا مگر ان پر محافظ بھی بٹھا دیے۔ ان آیات کے مطالعے سے ایک عام آدمی جو مطلب اخذ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یوں تو سبھی نبی اللہ کے پیارے محبوب اور منتخب ہستیاں تھیں مگر غیب کا علم کچھ چیدہ نبیوں کو دیا گیا مگر اس پر سخت قوانین کا نفاذ ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے پہریدار بٹھا دیے۔ غیب کا علم الٰہی ٹاپ سیکرٹ ہیں جنہیں اللہ اور وہی نبی جانتے ہیں جنھیں ربّ نے یہ علم دیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ جس نبی ﷺ کی وساطت سے یہ خبر دی جا رہی ہے وہ اللہ کے آخری نبی اور رسول بھی ہیں تو کیا انہیں اس علم سے محروم رکھا گیا ہوگا۔

یہ ہو نہیں سکتا اور جو شخص اس بحث میں الجھ کر اپنے ہی نبی ﷺ کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنائے وہ عالم دین بھی نہیں ہو سکتا۔

سورۃ آل عمران کی آیات نمبر **179** میں پھر ذکر ہے کہ اللہ کی یہ شان نہیں کہ عام لوگوں کو غیب کا علم دے اور ہاں اللہ منتخب کرتا ہے اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے۔ اس آیت مبارکہ میں عام لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جب کہ سورۃ جن کی آیات میں حضور ﷺ کو مخاطب کیا گیا تھا۔

سورۃ نساء کی آیات نمبر **113** میں بھی آپ ﷺ کو مخاطب کیا گیا کہ آپ ﷺ کی ذات پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو کچھ لوگ آپ ﷺ کو دھوکہ دینا چاہتے تھے مگر وہ اپنے آپ کو ہی بہکا رہے تھے۔ وہ آپ ﷺ کا کچھ بگاڑنے کی ہمت نہ رکھتے تھے چونکہ اللہ نے آپ ﷺ پر کتاب اور حکمت اتاری اور وہ علم سکھایا جو آپ ﷺ نہ جانتے تھے۔

یہ علم وحکمت، رحمت وفضل کیا ہے اور پھر خصوصاً اس علم کا بھی ذکر ہے جو آپ ﷺ پہلے نہ جانتے تھے۔ بجائے ان آیات مبارکہ پر غور کرنے کے اور اس کے مثبت پہلوؤں پر سوچنے کے اگر کوئی ان کی نفی کرتا ہے اور اپنی ذات اور ناقص عقل سے محض جھوٹی شان وشوکت کی خاطر تنقید کا پہلو نکالتا ہے تو اسے خدا ہی سمجھائے کہ وہ دین کی خدمت نہیں کر رہا بلکہ امت میں تفرقہ ڈال رہا ہے۔

سورۃ انعام، یونس، النحل، الرحمٰن اور التکویر میں ایسے ہی احکامات اور انعامات کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی ابتداء ربّ کی مہربانیوں، رحمت و فضل کے کلمہ سے ہوتی ہے کہ اللہ جو انتہائی رحم کرنے والا مہربان نہایت رحمٰن ہے نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔

غور کرو تو سارے کا سارا قرآن عالم غیب سے ہی تو اتارا گیا ہے۔ یہ لوح محفوظ کیا ہے؟ قرآن پاک میں 26 مقامات پر ذکر ہے کہ علم غیب صرف اللہ کی ذات کیلئے ہی خاص ہے اور وہی اپنے سکرٹ جانتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں مگر وہ اپنے خاص بندوں یعنی نبیوں میں سے جنھیں پسند کرے اپنی رحمت، فضل اور علم میں سے کچھ خاص عنایت کر دے۔ حیرت کی بات یہ کہ اسمبلی کی ٹکٹوں، زمین و جائیداد، پلاٹوں، پرمٹوں اور مادی فوائد کیلئے لڑنے والے علماء میں اتنی جرات ہے کہ وہ قرآنی احکامات اور اللہ کے پسندیدہ بندوں کو اپنی بحث کا موضوع بنا کر امت میں تفرقہ تو ڈالتے ہیں مگر امریکہ، ایران، سعودی عرب، افغانستان، بھارت اور برطانیہ کو ناراض کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ایران اور سعودی عرب کے پاس تیل ہے، افغانستان پر تنقید کرنے سے امریکہ اور بھارت ناراض ہوتے ہیں۔ بھارت پر کشمیر کے حوالے سے کشمیریوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی صورت میں تنقید سے بھی امریکہ اور برطانیہ ناراض ہوتے ہیں اور برطانیہ سبھی کا مشترکہ وطن ہے چونکہ ہر بھاگنے والے کا گھر، دولت اور کاروبار ولائت میں ہے۔ کسی نے کھلے عام ایک محل خرید رکھا ہے اور برطانیہ کے بینکوں میں لاکھوں پاؤنڈ بُرے وقت کیلئے محفوظ کیئے ہوئے ہیں اور کچھ نے فرضی ناموں اور فرنٹ مینوں کی خدمات حاصل کی ہوئی ہیں۔ وہ جو دن رات کہتے نہیں تھکتے کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ کا اختیار ہے وہی کائنات کا ربّ، خالق و مالک ہے مگر پاکستان کی وزارت عظمیٰ کیلئے امریکی سفیر کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ جہاں تک درباروں اور مزاروں کا تعلق ہے تو وہاں پر بھی وہ کچھ ہوتا ہے جو بزرگان دین کی تعلیمات کے مطابق نہیں بلکہ علاقائی رسومات اور رواج کے علاوہ بہت سے خرافات کو روحانیت کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ رقص کی محفلیں سجانا اور عرس کو میلے میں بدل کر کاروباری بازار لگانا کسی بھی ولیؒ کی تعلیمات کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ جوں جوں ایک طالب پر ربّ کے مخفی راز کھلتے ہیں توں توں وہ دنیا سے بیزار ہوتا ہے۔ ایک شخص اس وقت تک ولی ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی زندگی قرآن و حدیث اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق نہ ہو۔ توحید و رسالت پر پختہ ایمان کے ساتھ قرآن و حدیث کا علم اور اسوہ رسول ﷺ کی پیروی کا نام طریقت ہے جس پر اصحاب رسول ﷺ اور

علمائے حق نے عمل کیا اور ولائت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

میلے لگانا، رقص و موسیقی کی محفلیں سجانا اور خرافات کو روحانیت کہنا اصل بدعت اور خلاف شریعت فعل ہے۔ جو چیز اسوہ رسول ﷺ اور اصحاب رسول ﷺ کی زندگیوں اور علمائے حق کی تعلیمات سے ثابت نہیں وہ نہ دین ہے اور نہ ہی روحانیت۔

اگر ایک طبقہ بدعات وخرافات اپنالے اور دوسرا عقل سے کام لینے کے بجائے پیغمبر کی شان میں گستاخی کرے اور محض ایک طبقے کی جاہلیت پر مبنی عقائد کو بنیاد بنا کر نبی ﷺ کی ذات کو موضوع بحث بنالے تو وہ بھی جاہلیت میں کم نہیں۔

قرآن پاک کے تراجم وتفاسیر دیکھیں تو آدمی حیران ہوتا ہے کہ جو لوگ خود کو عالم اور محقق کہتے ہیں وہ علم وتحقیق کے بنیادی اصولوں سے ہی واقف نہیں۔ ہر طرف بے ادب اور بے مراد والی بات نظر آتی ہے۔ ہم اپنے دوستوں یاروں، ماں باپ، حکمرانوں اور افسروں کے معاملے میں تو بڑے با ادب ہیں اور جرأت نہیں کر سکتے کہ ان کے نام کے ساتھ جناب عالی، اعلیٰ حضرت، عالی المرتبت، آپ یا جناب لگائے بغیر لکھیں یا کلام کریں۔ بصورت دیگر افسر، حاکم اور سیاستدان کی ناراضگی مول لینے کا اندیشہ ہوسکتا ہے مگر جہاں اللہ کے سب سے برگزیدہ پیغمبر کا ذکر آتا ہے تو عالم اور مفسر آپ ﷺ کے بجائے تم کہہ کر لکھتے اور پکارتے ہیں۔ میں نے کئی تفسیروں میں لفظ اُمی کا ترجمہ ان پڑھ لکھا دیکھا ہے۔ عربی زبان فصاحت و بلاغت کی زبان ہے۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی مطالب و معنی ہیں۔ قرآن پاک کی اصل زبان کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ ممکن ہی نہیں اسلئے جو ترجمہ جس بھی زبان میں ہو اس کا مقصد صرف مفہوم کو سمجھنا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم کبھی ایسے الفاظ نہیں لا سکتے جو آیات کا صحیح ترین ترجمہ ہوں اور اللہ کے فرمان کو کماحقہ لفظوں میں ادا کرنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ مگر اسکا مفہوم ضرور معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اسی ضمن میں کچھ نامی گرامی علماء، مترجمین اور مفسرین کے تراجم وتفاسیر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان حضرات نے اپنے تراجم میں پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی عزت وتعظیم کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا اور محض ان لوگوں کی مخالفت میں جو نبی ﷺ کو (بعد از خدا بزرگ تو ہی) کہتے ہیں ایسے الفاظ لکھے ہیں جو نبی ﷺ کی شان اور اللہ کے فرمان کے مطابق نہیں۔ قرآن پاک میں جہاں رسول اکرم ﷺ کی شان کا بیان ہے وہی یہ بھی ذکر موجود ہے کہ آپ ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے

اداب کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے۔خدا نے اپنے قانون کے مطابق انسانوں میں سے ہی بعض کو فضیلت عطا کی اور انہیں نبوت ورسالت کے درجے پر فائز کیا۔نبی اور رسول اللہ کے منتخب اور مقرب انسان تھے۔وہ شکل وصورت میں تو دیگر انسانوں کی طرح تھے مگر رتبے اور فضیلت میں دیگر انسانوں سے اعلیٰ وارفع تھے۔

سمجھنے کی بات ہے کہ جب نبی اور رسول انسانوں کی رہنمائی کیلئے آئے ہیں تو وہ انسانوں میں سے ہی ہیں۔ان کے ماں باپ تھے، بیویاں اور بچے تھے، حسب ونسب تھا، وہ بیمار ہوئے، جنگوں میں زخمی ہوئے، وہ کھاتے اور پیتے تھے اور پھر مقررہ وقت پر اللہ کے حکم سے ان پر موت کا وقت بھی آیا اور وہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔جب منکرین نے یہ سوال اٹھایا کہ اللہ فرشتوں کو پیغمبروں کے روپ میں کیوں نہیں بھیجتا تو ربّ کائنات نے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے اس کا جواب بھی دیا۔

اس میں بھی شک نہیں کہ حضور ﷺ بشر تھے مگر وہ عام انسانوں جیسے نہ تھے۔بشر ہونے کی بھی دو صورتیں ہیں۔اوّل ظاہری شکل وصورت ہے۔آپ ﷺ ظاہری شکل وصورت میں بھی منفرد انسان تھے کہ آپ ﷺ جیسا حسین وجمیل شخص کبھی پیدا نہ ہوا۔آپ ﷺ جیسی خصوصیات کا حامل بھی کوئی نہیں۔آپ ﷺ جیسی ظاہری صورت وسیرت کا بھی کسی سے موازنہ نہیں۔فرشتے جو نوری مخلوق ہیں ان کا سردار جبریل امین آپ ﷺ کیلئے اللہ کا پیغام لاتا ہے اور آپ ﷺ کے حضور پیش ہو کر ہم کلام ہوتا ہے تو ایک نوری مخلوق کی موجودگی آپ ﷺ کے انسانی وجود پر اثر انداز نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا انسانی ظاہری وجود اسقدر قوی تھا کہ ایک لطیف نورانی وجود کی لطافت اور قوت اس پر اثر انداز نہ ہوتی تھی بلکہ آپ ﷺ کی موجودگی کے اثرات اس قدر قوی تھے کہ جبریل امین کے نورانی جسم کا اثر جو کے ایٹمی شعاعوں کے اثرات سے کڑوروں درجے لطیف اور قوی ہے کا کچھ بھی اثر اصحاب رسول ﷺ پر بھی نہ ہوتا تھا۔

دیکھو! میں سیاستدان نہیں ہوں اور نہ ہی کسی دین کے معلّمہ ہوں میں ایک عام انسان ہوں اور اپنی دسترس کے مطابق ادیان کا مطالعہ کیا ہے جس میں قرآن کریم اور سیرت پاک ﷺ بھی شامل ہے۔کوئی بھی دین سمجھنے میں مشکل نہیں ہوتا چونکہ دین کی بنیاد عقیدے پر ہوتی ہے اور عقیدے کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔جسطرح ہر شخص چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا کم علم دیہاتی ہو یا شہری سب انسان عقائد کی پیروی میں یکساں ہیں۔ہندو، مسلمان،

سکھ، عیسائی، بدھ ہوں یا کسی اور مذہب کے ماننے والے بلحاظ عقیدہ سب برابر ہیں۔ ہر شخص کے دل میں ایک ایسی ہستی کا تصور موجود ہے جو ان دیکھی ہے مگر ہر جگہ اور ہر لمحہ موجود ہے۔ ایک ایسی قوت کا خوف ہر دل میں ہے جس کی گرفت میں ہر کوئی آنے والا ہے۔

یہ ہستی، یہ قوت کیا ہے اور کہاں ہے یہ کوئی خفیہ راز نہیں چونکہ اس ہستی اور قوت کا اظہار کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔ کہکشائیں، سمندروں کی گہرائیاں، پہاڑوں کی بلندیاں، صحراؤں کی وسعتیں، رنگ رنگ کے پھولوں اور پرندوں کی اقسام، زمینوں میں چھپے خزانے اب راز نہیں رہے۔ جوں جوں قدرت کے مخفی راز انسانوں پر عیاں ہو رہے ہیں اَن دیکھی ہستی اور قوت کے راز بھی کھل رہے ہیں۔

سائنس کا علم انسان کو قدرت کے رازوں سے واقفیت ہی نہیں دلا رہا بلکہ عقائد کی مضبوطی میں بھی معاون ثابت ہو رہا ہے۔ سائنسی تحقیق کا ایک اہم موضوع انسانی جسم ہے جو بمنزلہ کائنات ہے۔ سائنس نے یہ تو ثابت کر دیا کہ انسانی جسم کائناتی اجزاء کا مرکب ہے مگر سائنس فی الحال یہ ثابت نہیں کر سکی کہ ان مرکبات کا جوہر انسانی جسم کی تخلیق میں کیسے عمل کرتا ہے اور انسان ان جواہرات کے اثرات پر خود کیوں دسترس نہیں رکھتا۔ انسانی جسم کو متحرک کرنے کا آلہ دماغ ہے اور زندگی برقرار رکھنے کیلئے دل کی اہمیت ہے۔

بظاہر دل جسم میں خون پمپ کرنے والا آلہ ہے جس میں خرابی کے باعث صحت مند انسانی زندگی ممکن نہیں اور دل مختلف بیماریوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ دل کے علاج کے طریقے بھی دریافت ہو چکے ہیں مگر دل کے کچھ اور بھی کام ہیں جو خفیہ ہیں اور کسی میڈیکل ریکارڈ پر نہیں آتے۔ سائنسی تحقیق عقل و شعور اور تحت الشعور کو بھی تسلیم کرتی ہے مگر سائنسدان اس پر حتمی رائے سے قاصر ہیں کہ عقل و شعور کا تعلق دل سے ہے یا دماغ سے ہے یا پھر دونوں کے درمیان ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ دماغ پر چوٹ لگے یا بیماریوں سے متاثر ہونے کی وجہ سے انسانی یادداشت پر اثر پڑتا ہے۔ انسان سب کچھ یا بہت کچھ بھول جاتا ہے مگر خون کی ترسیل اور دل کی قوت سے زندہ رہتا ہے۔ دل کی طرح سائنسدان کوئی مصنوعی دماغ ایجاد کرنے سے قاصر ہیں اور دل اور دماغ کے خفیہ ربط و احساس سے بھی سائنس واقف نہیں۔ دل کی جگہ مصنوعی پمپ کچھ عرصہ کے لئے تو انسان کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے مگر یہ عارضی نظام دل کا اصل بدل نہیں۔ ایسے ہی کچھ مشینیں انسانی زندگی کو عارضی سپورٹ دیتی ہیں مگر مشینوں پر لگا انسان محض زندہ لاش ہی ہوتا

ہے۔کلوننگ سمیت سائنسدانوں نے بہت سے تخلیقی دعوے کیے مگر خود ہی اپنی تخلیق کو ادھورا اور مضر قرار دیکر خالق کائنات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

تم دل میں تھی۔میں نے نینا کی روانی میں خلل ڈالتے ہوئے کہا۔

کس کے دل میں؟ نینا نے پوچھا۔

ہاں دل کی بات کر رہی تھی۔

نینا نے خود ہی جواب دیا اور کہنے لگی کہ دل و دماغ ہی نہیں بلکہ انسانی جسم کا ہر حصہ ظاہری اور باطنی امور کا خزانہ ہے۔جسم کی ظاہری بناوٹ، خدوخال، اجزاء اور قواء پر سائنس نے کسی حد تک تو دسترس حاصل کرلی ہے جس کا تعلق انسانی صحت اور غذا تک محدود ہے۔سائنس نے بتایا ہے کہ انسانی جسم کن اجزأ کا مرکب ہے اور ان مرکبات میں خلل کی وجہ سے اسے کون کونسی بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔ان بیماریوں سے محفوظ رہنے اور ان کے لاحق ہونے کی صورت میں صحت کی دوبارہ بحالی کیلیئے کیسی اور کیا تدابیر ضروری ہیں۔ان تدابیر میں ادویات اور خوراک کے علاوہ سرجری کا بھی اہم رول ہے مگر ان انوکھی اور حیرت انگیز ایجادات کے باوجود انسان موت کے ہاتھوں محفوظ نہیں چونکہ ہر انسان اپنی گائیڈ بک لیکر اس دنیا میں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

کونسی گائیڈ بک؟ میں نے پوچھا۔

نینا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔تقدیر۔

پھر کہنے لگی میں نے گلگت اور بلتستان کے دور دراز علاقوں میں سوسال سے زیادہ عمر کے مرد اور خواتین دیکھی ہیں جنہیں کبھی کوئی بڑی بیماری لگی ہی نہیں۔نزلہ وزکام ہوجائے تو مقامی جڑی بوٹیوں کا سوپ پی لیتے ہیں۔شدید بخار ہو تو مشروم کا سوپ اکسیر ثابت ہوتا ہے۔اسی طرح عام قسم کی ہر بیماری کا مقامی علاج موجود ہے۔

تمہیں پتہ ہے ان لوگوں کی صحت کا راز کیا ہے؟ نینا نے پوچھا۔

نہیں۔میں نے جواب دیا۔

سادہ غذا، ٹنشن فری لائف، سخت محنت، قدرتی ماحول اور گلیشیر کا پانی۔

گلیشیر کا پانی تو صاف نہیں ہوتا میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے۔میں نے کہا۔

شائد تم نے کوئی تحقیقی مقالہ پڑھا ہوگا چونکہ اکثر تحقیقاتی مقالے تحقیق پر نہیں بلکہ مفروضوں

پر مبنی ہوتے ہیں۔ نینا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

دریائے ہنزہ اور شمشال کا پانی انتہائی گدلا ہے۔ اس پانی میں کوئی لیس دار مادہ تیرتا رہتا ہے مگر ذائقہ بلکل قدرتی پانی جیسا ہے۔ میں نے جن طویل العمر لوگوں کی بات کی ہے وہ یہی پانی پیتے اور جیتے ہیں چونکہ اس پانی میں ایسے جواہرات موجود ہیں جو انسانی جسم کی قوت مدافعت بڑھاتے ہیں اور انسان بیماریوں کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے۔

وہ کام جو محقق اور سائنسدان کرتے ہیں اور تجربات کی بنیاد پر نئی ادویات تیار کرتے ہیں وہی کام قدرت کا نظام کر رہا ہے اور دریا کے پانی میں وہ سب کچھ مکس کر دیا ہے جو انسانی صحت کے لئے ضروری ہے۔

یہ تو انسانی جسم کا ظاہر ہے۔ باطن کیا ہے اس کا سائنس احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ ماہرین نفسیات تو سرے سے ہی فرشتوں، جنات، اور روح کے وجود سے انکاری ہیں چونکہ ظاہری علم ان تک رسائی سے قاصر ہے۔

مگر قرآن مجید نے تو فرشتوں اور جنات کے وجود پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور روح کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ یہ امر ربیّ ہے تم اسے سمجھنے سے قاصر ہو لہٰذا اس پر بحث نہ کرو۔ میں نے نینا کے بیان میں مداخلت کی۔

ہاں تم درست کہتے ہو اور میں بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ وہ لوگ جو علم کو عقل کے تابع رکھنے کا ہنر جانتے ہیں وہ عالم، محقق اور سائنسدان تو کہلاتے ہیں مگر وہ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ عقل شعور سے رہنمائی حاصل کرتی ہے اور علم کی حیثیت روشنی جیسی ہے جو عقل کے اندھیروں کو روشن کرتی ہیں۔

چرچل ایک عقلمند انسان اور قابل سیاستدان تھا مگر عربوں کو کمتر انسان سمجھتا تھا۔ وہ مسلمانوں سے بھی نفرت کرتا تھا مگر خود بھی ایک مکمل عیسائی نہ تھا کہ اسے بائبل کا عالم سمجھا جائے۔ ہٹلر عقلمند، دلیر اور شاطر انسان تھا مگر بے رحم اور بے حس بھی تھا۔ اگر ہم چرچل، ہٹلر، مسولینی، لینن اور سٹالن کی عقلی خوبیوں اور علم کا موازنہ نہ کریں تو جمع و تفریق کے بعد ہر ایک کا عقلی وزن اور خوبیاں تقریباً یکساں ہیں۔ چرچل انگریزوں کا ہر دلعزیز لیڈر تھا مگر مسلمانوں، خاص کر عربوں سے نفرت کرتا تھا جو کہ انسانی اصولوں اور اخلاقیات کے منافی عمل ہے۔ لینن، سٹالن اور مسولینی ہر اس شخص کی جان کے دشمن تھے جو ان کے ذاتی اور پارٹی اصولوں سے ٹکراتا تھا۔ ان کی پسند

ونا پسند اور انانیت نے لاکھوں انسانوں کو قتل اور کروڑوں کو دربدر کر دیا۔ یہی حال ہٹلر کا تھا۔ اس کے دماغ میں یہود دشمنی نے گھر کر لیا تھا جس کے نتیجے میں لاکھوں یہودی مارے گئے۔ اس کے نزدیک یہودی بچہ، بوڑھا، عورت اور مرد سبھی برابر تھے۔ اگر ہٹلر یہودیوں سے نفرت کرتا تھا، چرچل عربوں اور مسلمانوں سے بغض رکھتا تھا، لینن اور سٹالن غیر کیمونسٹوں کا قتل جائز سمجھتے تھے تو پھر فرق کہاں ہے۔

عرب، مسلمان، یہودی اور غیر کیمونسٹ بھی تو انسان ہیں، خدا کی مخلوق ہیں، خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور خدا کی نازل کردہ کتابوں کے ماننے والے ہیں تو کیا ان کا گناہ صرف عقیدہ ہے۔ اب اگر ایک شخص ظاہری مادی قوت کے زور اور اپنے بنائے ہوئے اصولوں اور عقیدے کو خالق کے بنائے ہوئے عقیدے اور اس کی مخلوق کا دشمن ہے تو یہ اس کا عقل ہے جو اسے شعوری طور پر ایک غیر انسانی اور غیر فطری فعل پر اکساتا اور مائل کرتا ہے۔ یہی شخص اپنی عقلی تاویلوں اور سفلی دلیلوں سے اپنے ہر فعل کو جائز قرار دیکر اسے اپنی قوم کی برتری، بہتری اور ترقی کا باعث قرار دیکر ساری قوم کو اپنے عقیدے، خیال اور اصول پر عمل پیرا ہونے پر مجبور اور قائل کرتا ہے اور اپنی سوچ اور انا کو قومی مفاد قرار دیکر ساری قوم کا ترجمان بن جاتا ہے۔ وہ اپنی سوچ وفکر کو عملی جامع پہنانے کی خاطر ایک لیڈر اور قائد کی حیثیت سے ساری قوم کے وسائل اور سوچ سے دوسری اقوام کو اپنی سفلی جبلت کے تابع ظلم وجبر کا نشانہ بناتا ہے اور ان کے وسائل پر قابض ہو کر اپنی قوم اور ملک کی خوشحالی یا پھر ناکامی کی صورت میں ذلت و رسوائی کا باعث بن جاتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے بہانے ہندوستان میں داخل ہوئی اور مقامی سیاسی قوتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سارے ہند پر قابض ہوگئی۔ نوآبادیاتی نظام کی تشکیل میں انگلینڈ، فرانس، اٹلی، ہالینڈ اور دیگر یورپی اقوام بھی شامل ہوگئیں اور غیر یورپی اقوام کے وسائل پر قابض ہو کر خوشحال بن گئیں۔ نوآبادیاتی نظام جبر وظلم اور غلامی کی بدترین مثال ہے مگر اس جبری ظالمانہ نظام کی تشکیل، حکمرانوں کی سوچ اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کے تحت ہی ہوئی جن کے مقرر کردہ وائسرائے، کمپنی ایجنٹ، گورنر، جرنیل اور دیگر اہلکار جبر وظلم برپا کرنے کا باقاعدہ حکم لیکر جاتے اور مقبوضہ علاقوں اور ممالک کے باشندوں کے وسائل کو ایک قائدے اور قانون کے تحت لوٹتے۔ یہی افسر، اہلکار اور اعلیٰ عہدیدار جب لوٹ مار کی معیاد پوری کرنے کے بعد واپس اپنے ملکوں کو جاتے تو ان کا استقبال ایک قومی ہیرو اور فاتح کے انداز میں ہوتا۔ انہیں اپنے ملک

میں انعامات، جاگیریں اور اعزازات دیئے جاتے اور بڑی بڑی شاہراؤں، باغوں، قلعوں اور تاریخی عمارتوں اور دیگر مقامات کو ان کے نام سے منسوب کیا جاتا۔

اگر انسانیت، اخلاقیت، روحانیت اور فطرت کے قانون کو دیکھا جائے تو یہ سب لوگ چور، ڈاکو، لٹیرے اور غاصب تھے جنہوں نے اپنے جیسے انسانوں کے وسائل پر قبضہ کیا، انہیں قتل کیا، غلام بنایا اور ان کے وسائل کو لوٹ کر اپنے اپنے ملکوں کو لے گئے۔ قرآن پاک میں ربّ ذوالجلال کا فرمان ہے کہ زمین کے خزانوں کا مالک میں یعنی ربّ ہے۔ اسی طرح خالق کائنات قرآن میں کہتا ہے کہ زمین میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ میرے ہی حکم اور مرضی سے ہے اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا! کہ جو تم پانی پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے برسایا یا ہم نے نازل کیا اور ہم چاہئیں تو اسے کھاری کر دیں تو پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ قرآن پاک میں ربّ العزت نے ہزارہا مثالیں دیکر انسان پر واضع کیا ہے کہ اس کی عقل محدود ہے۔ انسانی شعور میں جو کچھ پنہاں ہے عقل اسی کے مطابق اپنا اظہار کرتی ہے اور یہ بھی قدرت کا عطیہ ہے جس نے انسان کو بولنے اور اپنے شعور و عقل سے پیدا ہونے والے خیالات کا اظہار کرنے کی قوت دی۔ خالق کائنات نے بحری جہازوں کی مثال دی کہ وہ اس کے حکم سے پہاڑوں کی مانند سمندر میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سمندروں اور دریاؤں کی مثالیں دیں اور پھر ان کی گہرائیوں میں انسان کے لئے بیش و بہا خزانوں اور انعامات کا ذکر کیا۔ طرح طرح کی سواریوں کا ذکر کیا جو کہ ربّ کی نعمتوں میں شمار ہیں۔ کائنات کی وسعتوں کو بیان کیا کہ وہ بتدریج پھیل رہی ہیں اور یہ عمل ربّ کے حکم کے تابع ہے۔ ستاروں کی منازل کی قسم کھائی اور فرمایا کہ یہ بہت بڑی قسم ہے۔ چاند، سورج، دن اور رات کا ذکر کیا کہ یہ سبھی اس کی نشانیاں ہیں۔ زمین کے خزانوں اور اس کی سطح پر پیدا ہونے والی اشیاء کا ذکر کیا جس میں انسان کے لئے طرح طرح کے فائدے ہیں۔

غور کیا جائے تو انسانی علم نہ صرف محدود ہے بلکہ قدرت کے پنہاں رازوں کا محتاج بھی ہے۔ انسانی عقل صرف معلوم چیزوں تک محدود ہے اور جوں جوں معلوم چیزوں کے راز افشاں ہو رہے ہیں انسانی عقل میں بھی وسعت آ رہی ہے۔ سائنسی ایجادات اور علوم بھی معلوم چیزوں تک ہی محدود ہے۔ انسان سمندروں، پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں اور ان میں بسنے والی مخلوق کے عمل کا علم سے کھوج لگا کر ایک نئی چیز سامنے لاتا ہے جسے ڈسکوری یا پھر ایجاد کہا جاتا ہے۔

فضاؤں اور خلاؤں میں انسان کی رسائی چاند اور مریخ تک ہے مگر یہ رسائی اور علم ابھی تک نامکمل ہے۔ چاند پر انسان نے قدم رکھا اور مریخ پر ایک آلہ بھجوا کر کچھ معلومات حاصل کیں چونکہ چاند اور مریخ انسانی گہوارے جسے زمین کہتے ہیں کہ نزدیک ترین اجسام ہیں۔اس کے آگے کیا ہے؟ کہکشاؤں کی بناوٹ اور وسعت کیسی ہے سب نامعلوم ہے اور نامعلوم ہی رہے گا چونکہ اگر کوئی انسان قیام قیامت سے پہلے کسی کہکشاں کی موجودہ پوزیشن تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوجائے تو وہ کہکشاں تب تک کروڑوں سالوں کی مسافت پر کہیں دور جا چکی ہوگی۔

تاریخ گواہ ہے کہ انسان جب بھی خدائی احکامات میں دخل اندازی کرتا ہے تو فتنے کا باعث بنتا ہے۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کو حقیر سمجھ کر محض مادی لالچ، تکبر اور ہٹ دھرمی کا شکار ہوکر انسانوں میں تفرقے ڈالتا ہے، نفرت کے بیج بوتا ہے، کشت وخون کا موجب بنتا ہے اور ظلم و جبر کے ہتھکنڈوں سے لیس ہوکر خالق اور مخلوق کا دشمن بن جاتا ہے تو نہ صرف صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے بلکہ نشان عبرت بن جاتا ہے۔ایک ظالم، جابر، متکبر، متعصب اور غاصب شخص اپنے فرقے، طبقے، قوم، خطے اور علاقے کا ہیرو، سردار، حکمران، عالم، محقق اور دانشور تو ہوسکتا ہے مگر مخلوق کا مجرم اور انسانیت کے معیار سے گرا ہوا ایک نفرت انگیز کردار بھی ہوتا ہے جس کی سطحی سوچ اور محدود عقل سے لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ انسان بیماروں اور اذیتوں میں مبتلا ہوتے ہیں، غلام اور قیدی بنا دیے جاتے ہیں، ظلم و جبر کا شکار ہوتے ہیں۔ بچے ماؤں کی گودوں میں ماردیئے جاتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں لوگ گھر سے بے گھر ہوجاتے ہیں اور ربّ کی عطا کردہ نعمتوں سے محروم کردیئے جاتے ہیں۔انسانی عقل وشعور نے سائنسی علوم، ایجادات کے علاوہ دنیا کو جمہوریت، کیپٹلزم اور سوشلزم کی فکروفلسفے پر نئے اور جدید رجحانات بھی دیئے۔اہل مغرب نے بادشاہوں اور مذہبی اجارہ داروں سے نجات کے لئے جمہوری نظام حکومت کو اپنایا اور پھر سائنسی ایجادات اور دولت کے جبر سے اسے دیگر ممالک پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ جمہوری نظام حکومت اگر واقعی جمہوری ہو اور انسان اپنی کامل سوچ اور علم کے مطابق ایک حکمران کا چناؤ کرنے میں آزاد ہو تو اس سے بہتر نظام حکومت ہو ہی نہیں سکتا۔ چونکہ یہ نظام حکومت خدائی احکامات اور انسانی عظمت و وقار کی نفی کرتا ہے اور اپنے بنیادی فکروفلسفے کی ضد ہے اس لئے آمریت اور بادشاہت سے بھی بدتر ہے۔ جمہوریت کے علمبردار برطانیہ اور امریکہ ہی کی

مثال لے لو۔ برطانیہ ایک جمہوری ملک ہے جہاں ایک ووٹر مکمل آگاہی اور علم کے ساتھ ووٹ کا استعمال کرتا ہے مگر حکمران جماعت کبھی بھی اپنے ووٹروں کے بنیادی مسائل اور جذبات کا خیال نہیں رکھتی۔ برطانوی عوام عراق اور افغان جنگ کے خلاف ہیں اور جانتے ہیں کہ ان جنگوں سے لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہورہی ہیں، وسائل کا بے دریغ اور لا حاصل استعمال ہورہا ہے، نفرتیں بڑھ رہی ہیں اور دہشت گردی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اشیائے ضرورت کی کمی ہورہی ہے اور غربت بڑھ رہی ہے۔نفرت کا یہ عالم ہے کہ گوری اقوام کا یورپ اور امریکہ سے باہر جانا کسی خطرے سے خالی نہیں۔ ذہنی پریشانیاں اور ڈپریشن عام ہو چکی ہیں مگر اس کے باوجود حکمران طبقہ طویل اور لا حاصل جنگوں پر اپنے وسائل لٹا رہے ہیں تا کہ وسط ایشیأ اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر مکمل دسترس حاصل ہو سکے۔ ہوس وحرص کے ساتھ ساتھ جبر واستحصال اور سوچ وفکر کا دھرا معیار بھی جدید جمہوریت کے عطیات ہیں۔ اہل مغرب اور امریکہ صرف ایسے جمہوری نظام کی حمایت کرتے ہیں جو ان کے خیالات سے ہم آہنگ اور مفادات کا محافظ ہو۔جلال طالبانی، حامد کرزائی اور پرویز مشرف کے جمہوری نظام پر کسی کو اعتراض نہ تھا اور نہ ہی ان کے عمل اور کردار پر برطانوی پارلیمنٹ اور امریکی سینٹ اور کانگرس میں کبھی کوئی بحث ہوئی۔ طالبان نے اپنے تیل کے کنویں اتحادیوں کے حوالے کر دیئے جبکہ مشرف اور کرزئی نے اپنے عوام اور وسائل پر مغرب اور امریکہ کا حق تسلیم کر لیا۔قذافی اور حسن مبارک نے ٹوٹل سرنڈر سے انحراف کیا تو وہاں جمہوریت کی ہوائیں چلنے لگیں اور اقوام متحدہ کی منظوری سے طوفان بنکر مصریوں اور لیبیا والوں پر نازل ہوگئیں۔ سعودی عرب، امارات اور اردن والوں نے بھی جمہوریت کا پرچم اٹھالیا کہ شائد یہ سوچ کی تبدیلی کا موسم ہے مگر اہل مغرب اور امریکہ نے انہیں باور کروادیا کہ ہر جگہ کے اپنے اپنے موسم اور سوچ کے تقاضے ہیں۔ سعودی عرب اور امارات میں امریکہ کے فوجی اڈے اور مفادات ہیں اور جب تک یہ مفادات ہیں بادشاہت جمہوریت سے بہتر ہے۔ دوہرے معیار کی ایک مثال تیان من سکوائیر کا حادثہ ہے جو اہل مغرب اور امریکہ کو کبھی ہضم نہیں ہوسکتا۔ تیان من سکوائیر میں لاکھوں چینیوں کا اجتماع اہل مغرب اور امریکہ کے لئے ایک اچھا موقع تھا مگر یہ اجتماع حادثے میں بدل گیا اور انسانی حقوق کی پامالی کا ایک بدترین واقع قرار پایا جسے ہر فورم پر مغربی دانشور اور انسانی حقوق کے علمبردار نہ صرف ڈسکس کرتے ہیں بلکہ چینیوں کو ان کے جبر پر لعن طعن بھی کرتے ہیں۔اس

دانشوری کا منافقانہ پہلو یہ ہے کہ کسی دانشور یا انسانی حقوق کے ٹھیکیدار کو کٹے ہوئے بازوں اور ٹانگوں والے عراقی، افغانی اور فلسطینی بچے یاد نہیں اور نہ ہی کشمیر میں تیزی سے آباد ہوتے قبرستان اور فاٹا میں بکھری لاشوں کے ٹکڑے نظر آتے ہیں چونکہ اہل مغرب، امریکہ اور ان کے ہم نواؤں کا انسانی اقدار اور حقوق کا اپنا معیار ہے۔ جو اس معیار پر پورا اترے وہی انسان ہے اور اسی کے حقوق ہیں۔ ایسا ہی حال دہشت گردی کا ہے۔ ڈرون حملوں میں مرنے والے غریب پٹھانوں کا قتل جائز ہے چونکہ افغانستان میں مقیم نیٹو فورسز کے پاس عالمی امن کے لیے بنائی گئی تنظیم جسے اقوام متحدہ کہا جاتا ہے کی طرف سے افغانوں اور پاکستانیوں کو مارنے کا سرکاری اجازت نامہ ہے۔

توقف کے بعد نینا بولی۔

سنا ہے کہ پچھلے زمانوں میں ایک چنگیز خان اور ہلاکو ہوا کرتے تھے۔ وہ شہروں اور بستیوں کو تباہ کرتے تھے اور کبھی کسی پر رحم نہ کرتے تھے۔ چنگیز اور ہلاکو کے بعد ہٹلر آیا جس کے مظالم بہت مشہور ہوئے مگر جنرل ڈائیر پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی غدر کے دوران دہلی میں ہونے والے قتل عام پر کسی کو شرمندگی ہوئی۔ ہم نے نہ ہلاکو اور چنگیز دیکھے۔ نہ ہٹلر، ڈائیر اور دہلی کی گلیوں میں بکھری لاشوں کا نظارہ کیا مگر بغداد، بصرہ اور کابل کے نظارے ہمارے مقدر میں لکھے تھے جس کا اہتمام بش اور بلیئر نامی لیڈروں نے کیا چونکہ یہ دونوں دنیا کی مثالی جمہوری حکومتوں کے سربراہ اور انسانی حقوق کے علمبردار تھے۔ جھوٹ، دغابازی اور پراپیگنڈہ بھی جدید جمہوری ہتھیار اور تہذیب یافتہ اقوام کے اخلاقی اقدار کا حصہ ہے۔ اسامہ بش کا دوست اور بزنس پارٹنر رہا اور جب ضرورت نہ رہی تو بدترین دشمن بن گیا۔ ایک روز بش کو خواب آیا کہ صدام حسین کے پاس تباہی مچانے والے ہتھیار ہیں جن سے عالمی امن کو عمومی اور اہل مغرب اور امریکہ کو خصوصی خطرہ لاحق ہے۔ بش نے ٹونی بلیئر کو خواب سنایا تو ٹونی نے تعبیر نکالی کہ صدام کے ہتھیاروں کا تو پتہ نہیں مگر ہمارے پاس ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کا تجربہ کرنے کے لئے عراق سے بہتر جگہ نہیں ہوسکتی ہے۔ اس خواب کے دو نہیں بلکہ تین فائدے ہیں۔ اوّل ہمارے ہتھیار ٹیسٹ ہوجائینگے اور ان کی تباہی اور بربادی کا عملی مظاہرہ ہوگا۔ زندہ انسانوں، پلوں، بلند و بالا عمارتوں پر تجربات سے تیل پیدا کرنے والے دیگر ملکوں پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور ہمیں تیلی ملکوں میں من مانی کا حق بھی مل جائے گا۔ اس جنگ میں مرنے والے سوائے عربوں اور

مسلمانوں کے کسی دوسرے مذہب کا کوئی بندہ نہیں ہوگا اس لئے حقوق انسانی کی پامالی کا بھی اندشیہ نہیں ہوگا۔ اس جنگ کو ہم مزید پھیلانے کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں اور عراق میں رہتے ہوئے ایران، شام، ترکی سمیت دیگر عرب اور مسلم ممالک پر کسی بھی وقت جمہوریت اور انسانی حقوق کا جنون طاری کر کے خانہ جنگیاں کروا کر اقوام متحدہ کی منظوری سے ان پر بمباری وغیر کر سکتے ہیں جو آخر کار ہمارے ہی فائدے میں ہوگا۔

دوسرا فائدہ تیل کے ذخائیر پر قبضہ ہے جس پر زیادہ بات کی ضرورت نہیں چونکہ یہ فائدہ سب فائدوں کی ماں ہے۔ تیسرا اور اہم فائدہ دنیا میں بدامنی، غربت، دہشت گردی اور افراتفری کا پھیلاؤ ہے جن کی آڑ میں ہم عرب ممالک کو کسی بھی وقت غرق کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ٹونی بلئیر کی اس تعبیر پر عمل ہوا اور آج اس کے فوائد سامنے آرہے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے جمہوریت پسند اور جدید تہذیب کے سرخیل ممالک اور اقوام نے اقوام متحدہ کی منظوری سے دہشت گردی، جمہوریت، انسانی حقوق اور تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تلاش میں دنیا کا امن تہہ و بالا کر رکھا ہے۔ ابتدائی ریہرسل اور ہتھیاروں کو زندہ انسانوں پر آزمانے کا تجربہ پہلے عراقیوں پر پھر افغانوں پر کیا گیا اور انسانی تباہی و بربادی کے مناظر بش، بلئیر اور دیگر اتحادیوں کو دکھا کر انہیں سکون قلب مہیا کیا گیا۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو پرویز مشرف اور کرزئی کی مدد سے زندہ انسانوں کو گوانتاناموبے کے پنجروں میں بند کر کے انہیں ایسے ایسے مظالم کا نشانہ بنایا گیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ملاضعیف کا قصور اتنا تھا کہ وہ پاکستان میں طالبان حکومت کا سفیر تھا۔ ملاضعیف نے گوانتاناموبے سے واپسی پر اپنے تاثرات پر مبنی کتاب لکھ کر دنیا کے سامنے رکھی مگر انسانی حقوق والوں نے ملاضعیف اور گوانتاناموبے کے اسیروں کو انسان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پرویز مشرف نے عورتوں اور بچوں کا بھی سودا کیا جس کی بدترین مثال عافیہ صدیقی اور اس کے بچے ہیں۔

امریکی اور مغربی معیار انسانیت کے مطابق جو ملک، قوم اور انسان ان کے خیالات سے متفق نہیں وہ انسان ہی نہیں۔ اس کا قتل، بربادی اور رسوائی کا لائسنس اقوام متحدہ جیسا ادارہ جاری کرتا ہے جس کا بنیادی مقصد امن کا قیام تھا۔

تم نے تو سنا ہی ہوگا کہ تاتاری مفتوعہ اقوام کا قتل عام کرتے اور پھر ان کے سروں کو ایک

ترتیب سے رکھ کر ان کا مینار بناتے تھے۔کبھی کبھی فتح کی خوشی میں تاتاری جرنیل اور سردار انسانی کھوپڑیوں میں شراب ڈال کر بھی پیتے اور فتح کا جشن مناتے تھے۔

نینا نے طویل گفتگو کے بعد سوال کیا۔

ہاں! کتابوں میں پڑھا ہے۔میں نے جواب دیا۔

تاتاریوں کو تاریخ میں سب سے بڑے ظالم اور سفاک قوم کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور موجودہ دور کو تاریخ کا ترقی یافتہ اور علم و آگاہی کی معراج کہا جاتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ امریکی فوجی نہ کھوپڑیوں کا مینار بناتے ہیں اور نہ ہی انسانی کھوپڑیوں میں شراب بھر کر پیتے ہیں۔اگر کہیں ایسا ہوتا ہے تو فی الحال اس کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا۔تاتاریوں اور اتحادیوں میں تھوڑا سا فرق بہر حال موجود ہے چونکہ اتحادی فوجیں تہذیب یافتہ اور جمہوری ممالک کے باشندوں پر مشتمل ہیں۔

تو پھر فرق کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

فرق یہ ہے کہ تاتاری ظالم، سفاک، ان پڑھ اور اجھڈ تھے۔اتحادی پڑھے لکھے مہذب اور ماڈرن معاشرے کے فرد ہیں۔تاتاری چراگاہوں اور وسیع میدانوں کی تلاش میں نکلے تھے اور اتحادی دنیا کو امن اور جمہوریت کا درس دینے اور تیل کے کنوؤں کی حفاظت کا مشن لیکر نکلے ہیں۔تاتاری کھوپڑیوں کے مینار بناتے تھے جب کہ اتحادی تفریح کے لئے دس پندرہ افغانوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے انہیں گولیوں سے اڑا دیتے ہیں اور پھر ان کے کھوپڑیاں، اور انگلیاں کاٹ کر اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں اور انہیں فریموں میں سجا کر رکھتے ہیں جسے وہ وار سوئینیر یا ٹرافی کہتے ہیں۔تاتاری مردے پھینک کر چلے جاتے تھے اتحادی کبھی کبھی اپنے افغان دوستوں کی ہمراہی میں مردوں کے پیٹ میں تیل بھر کر انہیں آگ لگاتے ہیں اور مردے کا ناچ دیکھتے ہیں۔اگر موسم اچھا اور مزاج میں شوخی ہو تو بزکشی کا اہتمام بھی ہوتا ہے جس میں دنبے یا بکرے کی جگہ کسی مردہ افغان یا طالب کی لاش استعمال کی جاتی ہے۔

فرق ہے نا! نینا نے سوالیہ نگاہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو کہنے لگی۔

اتحادیوں نے گوانتاناموبے کے علاوہ بگرام، کابل اور دوسرے دوست ممالک میں ایسے قید خانے بنا رکھے ہیں جہاں وہ انسانوں کو حیوانوں کے پنجروں میں بند کر کے رکھتے ہیں اور انہیں

پٹ یعنی پالتوں جانور کہتے ہیں۔

ہوسکتا ہے یہ محض پراپیگنڈہ ہو۔ میں نے نینا کو جواب دیا۔

بزکشی اور مردے کے ڈانس کی ویڈیو ابھی سامنے نہیں آئی باقی سب انٹرنیٹ پر موجود ہے۔دکھلاوے کے لئے کچھ امریکی فوجیوں کا جھوٹا موٹا ٹرائیل بھی ہورہا ہے جنہیں بعد میں چھوڑ دیا جائے گا۔نینا نے کہا۔

نیناتم بہت دور نکل گئی ہو۔بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔میں نے کہا۔

دیکھو یہ پی ٹی وی کا ٹاک شوتو نہیں کہ میں ایک ذہن بنا کر بات کروں اور پھر اپنے موضوع کو سچ ثابت کرنے کے لئے ایک پارٹی کی طرف دار بن کر ٹاک شو کو شاک شو بنادوں۔ میں کھلے دل اور دماغ سے وہ باتیں کررہی ہوں اور وہ کہہ رہی ہوں جو حقیقت اور سچ ہے۔ میں تصویر کے دونوں رخ دیکھتی ہوں۔ میں دیوار پر لگے بدنما دھبے کو دیکھتی ہوں تو دیوار کے پیچھے کھلے خوشبودار پھولوں کی کیاریوں کی تعریف بھی کرتی ہوں۔ میں کانٹوں کی باڑ میں اپنا آنچل الجھا کر واویلا کرنے کی عادی نہیں بلکہ باڑ کے مقصد کو سمجھتی ہوں اوراس کی آڑ میں پھیلے سرسبز کھیتوں کے حسن اور شادابی کے سحر میں کھوکر گنگناتی بھی ہوں۔

میرے نزدیک زندگی نہ بے جان ہے اور نہ ہی بے مقصد۔مگر بدقسمتی کہ ہماری زندگی ادھار اور مقصد ادھورا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر شخص کا اپنا اپنا مقصد اور زندگی کا معیار ہے مگر ایک محدود مقصد اور کمتر باجگزار زندگی انسان کے تخلیقی مقصد کا معیار نہیں۔انسان کی وجہ تخلیق کا مقصد وہ نہ تھا جس کا لبادہ اُوڑھ کر انسان نے فطرت کے اصولوں پر انسانی حقوق اور جمہوریت کا ملمع چڑھا لیا اور دوسرے انسانوں کو بے مقصد اور بدحال زندگی گزارنے پر مجبور کردیا۔

کچھ سوچ کر نینا نے کہا۔

انسانی جبلت اور قدرت کے فطری نظام میں فرق ہے۔ جب انسان قدرت کے نظام فطرت کے برعکس سوچتا اور عمل کرتا ہے تو فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے۔ دنیا میں جتنی جنگیں ہوئیں، فتنے اور فساد اٹھے ان کا موجب انسانی جبلت اور سفلی سوچ وعمل ہی تھا۔انسان نے جب بھی الٰہی قوانین اور فطرت کے آفاقی نظام سے ہٹ کر مادی سوچ کو بروئے کار لایا ایک نیا فتنہ وفساد اس کا مقدر بنا جو بالآخر ایک تہذیب کی تباہی کا باوعث بنا۔

جدید جمہوری نظام کروڑوں انسانوں کے فطری ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ برطانوی جمہوری

نظام میں کہیں درج نہیں کہ پارلیمنٹ دوسری اقوام کو غلام بنانے یا ان پر جنگیں مسلط کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ امریکہ کے آئین میں بھی یہ بات درج نہیں کہ امریکہ کا صدر جب جی چاہئے کسی ملک پر بمباری کروادے۔ مگر یہ سب کچھ ہورہا ہے۔ افغانستان میں دہشت گردی کے خاتمے کے لئے ڈیڑھ لاکھ فوج لگی ہے اور مظلوم اور بے کس انسانوں کا خون بہا رہی ہے۔ یہ فوج دہشت گردی کے خاتمے کی آڑ میں جنازہ پڑھتے لوگوں اور باراتیوں پر بمباری کرکے ہر ماہ ہزاروں انسانوں کو قتل کر دیتی ہے۔ آج امریکی خود بھی مان رہے ہیں کہ عراق کے پاس تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہیں تھے بلکہ یہ ایک جھوٹا پراپیگنڈہ اور عراق پر فوج کشی کا من گھڑت بہانہ تھا۔ کچھ سالوں بعد یہ خبر بھی آئے گی کہ فوجی یلغار کا مقصد افغانستان کی آڑ میں پاکستان کو تباہ کرنا، چین، ایران اور وسطیٰ ایشیاۓ کے ممالک کو کنٹرول کرنا اور وسطی ایشیائی ریاستوں کے گیس اور تیل کے ذخائیر پر قبضہ کرنا تھا۔ افغانستان ان سب ممالک کا دروازہ ہے جس پر امریکی اتحادی بیٹھ کر سب کچھ کنٹرول کرسکتے ہیں مگر وہ بھول گئے یہ افغانستان ہے۔

مغربی جمہوری نظام جس طرح کی سوچ وعمل پر استوار ہے اور انسانی حقوق اور آزادی کا جو دوہرا معیار جمہوریت پسند اپنائے ہوئے ہیں اس کے تناظر میں دیکھا جائے تو جمہوریت اپنا مقصد کھوچکی ہے۔ جمہوریت عوام کو دھوکہ دینے ان سے ٹیکس وصول کرکے دنیا کا امن تباہ کرنے اور دوسرے ملکوں کے عوام کو بے دریغ قتل کرنے اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ پاکستان جیسے ملکوں میں جمہوریت غنڈہ گردی اور جبرواستحصال کا دوسرا نام ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ پاکستانی جمہوریت مفاد پرستوں اور ہوس پرست بیوپاریوں کا کھیل ہے جس کے ذریعے عوام کو چکمہ دیکر ان کی جمع شدہ پونجی کو ہڑپ کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں سینٹ کی سیٹ دس کروڑ سے بیس کروڑ اور آزاد کشمیر میں کشمیر کونسل کی سیٹ پانچ سے دس کروڑ میں بکتی ہے۔ ایسا ہی حال صوبائی اور قومی اسمبلی کی سیٹوں اور پارٹی ٹکٹوں کا ہے۔ وزارتوں، سفارتوں، مختلف محکموں کے سربراہیوں اور کارپوریشنوں کے الگ سے ریٹ ہیں۔ پی آئی اے، ریلوے، گیس، بجلی، سٹیل مل اور دیگر منافع بخش کارپوریشنوں کو لوٹنے والوں کا ملک کا صدر اور وزیراعظم خود چناؤ کرتا ہے۔ جس ملک میں بچوں کو ملاوٹ والا دودھ اور مریضوں کو جعلی ادویات محکمہ صحت کی منظوری سے سپلائی کروائی جائیں اور یہ کام جمہوری حکومتوں کے دور میں ہوتو اس سے بہتر نہیں کہ کم ملاوٹ، تھوڑی کرپشن اور لوٹ مار والا مارشل لاء برداشت کرلیا جائے۔

خیر چھوڑو۔

یہ سب دل دکھانے والی باتیں ہیں جن کا پاکستان کے بدقسمت عوام پہ کبھی اثر نہ ہوگا۔ پاکستانی عوام پر پرویز مشرف مسلط ہو یا زرداری اور گیلانی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے سامنے لال مسجد میں قتل عام ہو یا کوئی دوسرا المیہ یا حادثہ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ووٹ وہ ہمیشہ غنڈوں، سمگلروں، وڈیروں، گدی نشین پیروں اور جاگیرداروں کو دینگے اور پھر انہیں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوکر بھوکے مرینگے، خودکشیاں کریں گے مگر صابر وشاکر اتنے کہ کبھی احتجاج نہیں کریں گے۔ اب تو پاکستانی میڈیا نے اٹھارہ کروڑ انسانوں کو یرغمال بنالیا ہے اور نت نئے اینکر انٹرنیٹ پر موجود سچی جھوٹی خبروں، تبصروں اور دیگر اطلاعات پر مبنی ہر روز ایک نئی کہانی پیش کرتے ہیں اور عوام کو کنفیوژ کرنے کا مشن آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہر خبر پر نظر کے عنوان سے پیش کردہ بے خبریوں نے عوامی جذبات اور احساسات کا بر کس نکال دیا ہے اور لوگ اس بات پر ایمان لے آئے ہیں کہ پاکستان، امریکہ اور امریکی امداد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ پاکستانی ادارے نا اہل، کرپٹ اور ملک دشمن عناصر کے ہاتھوں تباہ ہو چکے ہیں اور اب ان کی بحالی کا کوئی راستہ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ملک تباہ حالی کا شکار ہے مگر جب عوام اپنے مستقبل سے مایوس ہوکر اپنے ہی منتخب کردہ لیڈروں کی کرپشن، لوٹ مار، غنڈہ گردی، بے حسی اور بداعمالی کا حساب لینے سے قاصر ہوں اور محض ٹیلیویژن سکرین کے سامنے بیٹھ کر حامد میر، لقمان مبشر، نسیم زہرہ، جاوید چوہدری، کامران خان، عاصمہ چوہدری اور دیگر دانشوروں کے نوحے اور افسانے سن کر آنسو بہانے کے عادی ہوجائیں تو انہیں ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیاں ٹریڈ کارپوریشنوں میں بدل چکی ہیں اور ان کے لیڈر درحقیقت ان بزنس کمپنیوں اور کارپوریشنوں کے ڈائیریکٹر اور چیف ایگزیکٹو ہیں۔ میں شیخ رشید کو سیاست کا خالد عباس ڈار سمجھتی ہوں جو طنز ومزاح میں کچھ کام کی باتیں بھی کر جاتا ہے۔ ایک ٹیلیویژن پروگرام میں فرزند راولپنڈی نے فرمایا کہ سیاستدانوں کے بچے ٹیکنیکل چور ہیں۔ شیخ نے واشگاف الفاظ میں مدہوش پاکستانیوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا کہ مستقبل کے ان سیاستدانوں سے بچ سکتے ہو تو بچو اور آج موقع ہے کہ ان سے اپنے بچوں کے مستقبل کو بچاؤ۔ یہ کمپیوٹر کی پیدوار ہیں۔ ان کے بڑے نیم خواندہ اور ناخواندہ تھے انہیں لوٹا ہوا مال سمیٹنے کا طریقہ نہیں آتا تھا اس لئے وہ ملک کے اندر ہی جائیدادیں خریدتے یا پھر ہیرا پھیری کرتے رہے۔ پرانے چوروں

اور ڈاکوؤں کی نئی پود پڑھی لکھی اور ٹیکنالوجی کی ماہر ہے۔ وہ ایسے طریقے سے ملک لوٹ رہے ہیں کہ کسی کو نشان بھی نہیں ملتا۔ ان لوگوں نے اپنے میڈیا مینجر، اینکر اور چینل خرید رکھے ہیں جو نہ صرف ان کی چوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں بلکہ ان کی برائیوں اور بداعمالیوں کو اچھائیوں اور نیکیوں میں بدلنے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ کتنے ہی دانشور دن رات ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ بلاول بھٹو زرداری، مونس الٰہی، عبدالقادر گیلانی، حمزہ شہباز شریف اور اسی برادری کے کچھ اور جیالے اور متوالے پاکستان اور پاکستانیوں کا مستقبل ہیں۔

نینا تم بہت دور نکل گئی ہو۔

میرا سوال کچھ تھا اور تم جواب دیتے دیتے قطب شمالی سے قطب جنوبی اور پھر بیچ میں کہی ملکوں، شہروں اور بستیوں سے ہو کر سمندروں کی تہہ تک چلی گئی ہو۔

میں نے نینا کو یاددہانی کرائی۔

ہاں! ایسا ہی ہے۔ نینا سے بھیگی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے دکھ سے کہا۔

میرا وطن جل رہا ہے۔ میرے ہم وطن بے حسی اور بدبختی کا شکار ہیں۔ حکمران انہیں لوٹ رہے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ ادارے تباہ حال ہیں اور عدلیہ آزادی کے باوجود الجھاؤ کا شکار ہے۔ حکمران عدلیہ اور فوج کو بابر اعوان اور رحمٰن ملک کے ذریعے تابع فرمان کرنے کی جستجو میں ہیں اور کسی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ آزاد اور بے لگام میڈیا کا ایک بڑا حصہ عدلیہ کے خلاف پیش کردہ قراردادوں اور توہین آمیز رویوں کی تعریف بھی کر رہا ہے اور عدلیہ کے خلاف سخت رویے کا حامی ہے۔ وزیراعظم کے خاندان سے لیکر ان کے دوستوں اور مشیروں کے نام کرپٹ ترین افراد کی لسٹ میں شامل ہیں مگر کوئی پوچھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ اگر کسی کے خلاف انکوائری ہوتی ہے تو حکومت انکوائری مکمل ہونے سے پہلے ہی انکوائری افسر بدل دیتی ہے یا پھر ماتحت عدالتوں سے ملزم کو ضمانت پر رہا کروا کر بیرون ملک بھگا دیتی ہے۔ اخلاقیات اور روایات کا خاتمہ ہو چکا ہے اور علماً سیاست کے منافع بخش کاروبار سے منسلک ہو کر اپنے اصل مقصد سے ہٹ گئے ہیں۔ فوج اندرونی اور بیرونی محاذوں پر لڑ رہی ہے اور اغیار کے ہاتھوں بلیک میلنگ کا شکار ہے۔ سیاستدان اپنی کرپشن، نااہلی اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے فوج کے کردار کو مشکوک بنانے میں لگے ہیں۔ وزیر، مشیر اور سفیر بننے کی کوالیفکیشن کرپشن، ملک دشمنی نااہلی اور بددیانت حکمرانوں کی غلامی ہے۔

مگر حسین حقانی تو دانشور ہے۔ میں نے کہا۔

ہاں ہے۔ مگر امریکن دانشور ہے۔ نینا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

حقانی امریکی تھنک ٹینک کا حصہ ہے اور امریکی مفادات کے لئے کام کرتا ہے۔ حقانی کا پاکستان زرداری ہاؤس تک محدود ہے۔ وہ زرداری کا وفادار ہے اور بیرون ملک زرداری کے مفادات کا بھی خیال رکھتا ہے۔ امریکہ میں زرداری کی نمائندگی حسین حقانی اور فرزانہ راجہ کرتے ہیں۔ انگلینڈ میں واجد شمس الحسن اور رحمٰن ملک۔ فرانس میں معاملات زرداری صاحب خود دیکھتے ہیں جبکہ عرب امارات اور سعودی عرب کا منیجر بھی رحمٰن ملک ہے۔ جس ملک کا سربراہ اپنی سرکاری حیثیت کا کاروباری مفادات کے لیے استعمال کرے اور عوام خاموشی سے آئیں بھرنے کے عادی ہوں وہاں کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے پھر بات لمبی کر دی۔ نینا نے خود ہی کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔

یہ میرا نہیں ہر اس پاکستانی کا المیہ ہے جسے اپنی مٹی سے محبت ہے۔ ہمارا یہ بھی المیہ ہے کہ کروڑوں پاکستانی مٹی کی محبت سے مبرّا ہو چکے ہیں اور مادیت کے بتوں کو پوجنے لگے ہیں۔

خدا نہ کرے۔ کیا پاکستانی بت پرست ہو گئے ہیں؟ میں نے نینا کو ٹوکا۔

ہاں! ایسے ہی ہے۔ نینا نے سنجیدگی سے کہا۔

تمہاری بات واضح نہیں۔ میں نے پوچھا۔

بات واضح ہے مگر تم ان ہی پاکستانیوں میں شمار ہوتے ہو جنہوں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لی ہیں۔ تم ان کروڑوں پاکستانیوں میں سے ہو جو مفاد پرستی اور مادیت کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو کر ذلت و رسوائی کا شکار ہیں۔ تم ان کروڑوں ووٹروں میں سے ایک ہو جو زرداری، نواز شریف، الطاف حسین، فضل الرحمٰن، اسفندیار ولی اور شجاعت حسین کے بتوں پر اپنا ووٹ نچھاور کرتے ہیں اور پھر ذلت و رسوائی کی زندگی جیتے ہیں۔ کبھی بوریوں میں بند لاشوں کی صورت میں گندے نالوں سے پڑے ملتے ہیں، کبھی چوکوں اور چوراہوں میں اندھی گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور کبھی ڈرون حملوں میں جل مرتے ہیں۔ کبھی بسوں اور گاڑیوں میں جلا دیے جاتے ہیں اور کبھی دھماکوں کی نذر ہو کر گور و کفن سے ہی محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

اگر تمہیں بت پرستی پر اعتراض ہے تو فرعونیت کہہ لو یہ زیادہ، موزوں لفظ ہے۔ نینا نے کہا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

نینا نے ہنس کر کہا۔

مٹی، پتھر یا لکڑی کا بنا بت بے جان ہوتا ہے جسے بت پرست بھگوان کی شبیہ یا ماڈل سمجھ کر پوجتے ہیں۔ بت پرست کو پتہ ہوتا کہ یہ بت بھگوان کی اصل نہیں صرف ایک سمبل ہے۔ بھگوان کا مطلب ہے سب سے بڑا اور ہر لحاظ سے سب سے بڑا جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اب اس بھگوان کے بہت سے نام ہیں مگر یہ بھگوان بے ضرر ہے۔ اگر ایسے بھگوان کا بت کسی گھر میں رکھا ہے تو اسے عزت واحترام سے گھر کے کسی کونے میں رکھا جاتا ہے۔ جب گھر والے کے جی میں آئے وہ اس کی پوجا کرتا ہے مگر بھگوان اس پوجاری سے کچھ نہیں مانگتا۔ جبکہ فرعون مانگتا تھا۔ وہ ووٹ نہیں لیتا تھا مگر سجدہ کرواتا تھا۔ زبردستی کا بھگوان تھا جو نہ مانے اسے ماردیتا تھا۔ مال و دولت چھینتا تھا غربت وافلاس کے مارے لوگوں کو اور مارتا تھا۔ ظلم وجبر اس کا شیوہ تھا اور فرعون استحصال کی علامت تھا۔ عوام بھوکوں مرتے تھے اور فرعون کے خزانے بھرے رہتے تھے۔ اس کے وزیر، مشیر اور جادوگر عیش وعشرت کی زندگیاں بسر کرتے تھے مگر پتہ نہیں اس دور کے بابر اعوان، رحمٰن ملک، منظور وٹو، شجاعت حسین، اسفندیار ولی، حسین حقانی، نواز شریف، مشاہد حسین، زرداری اور گیلانی وغیرہ کے کیا نام ہوتے تھے۔ مگر یہ سب کسی نہ کسی صورت میں تب بھی موجود تھے۔

تمہیں پتہ ہے کہ سارے فرعون ظالم نہ تھے۔ نینا نے پوچھا۔

نہیں! میں نے جواب دیا۔

کچھ اچھے بھی تھے۔ کچھ کم سنی میں بادشاہ بنے اور فرعون کا لقب اختیار کیا اور پھر جوانی میں ہی مر گئے۔

تمہارا مطلب ہے کہ ہمارے موجودہ فرعون جب مرکھپ جائیں گے تو ان کے بیٹے اور بیٹیاں ہمارے مستقبل کے فرعون ہونگے؟ میں نے سوال کیا۔

لگتا تو ایسے ہی ہے۔ میں نے تمہیں شیخ رشید کے انٹرویو کا بتایا ہے وہ کہتا ہے کہ آنے والی نسل میں زیادہ خطرناک اور ٹیکنیکل فرعون ہونگے۔

چلو اب بس کرو۔ ہم ایک محکوم، مجبور اور بے بس قوم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے چونکہ جیسا ہم سوچتے ہیں ایسا قوم نہیں سوچتی۔ ہماری قوم وقت کے سیاسی فرعونوں پر ایمان رکھتی ہے اور انہیں پوجتی ہے۔ فرعون اپنا کام کر رہے ہیں اور جبر واستحصال کے ہتھیاروں

سے بے حس قوم کا خون چوس رہے ہیں۔ نینا نے بیزاری سے کہا۔

شائد کوئی موسیٰ آجائے۔ میں نے پوچھا۔

ہاں! نینا جواباً کہا۔

یہ ربّ کا اصول ہے کہ جب فرعونیت بڑھ جاتی ہے اور عوام مغلوب ہوجاتے ہیں تو ربّ سارا معاملہ ہی الٹ دیتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اسلامی دنیا سے ایک وفد تیار ہونا چاہئے اور یہ وفد ایسے علمأ پر مشتمل ہو جو قرآن اور حدیث کو فرقہ واریت پر فوقیت دیں۔ یہ وفد مناظرے نہ کرے بلکہ اپنے خرچ پر مغربی مما لک اور امریکہ کی عوام کو اسلام کی سچی اور حقیقی روح سے متعارف کروائے کہ قرآن کیا کہتا ہے اور نبی آخرالزمان ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن کو لوگوں کے سامنے کیسے پیش کیا اور خود نبی ﷺ کی زندگی کیسی تھی۔ اس وفد یا ایسے وفود کا ٹارگٹ عام لوگ ہوں جن میں طالب علم اور تحقیق سے منسلک لوگوں کو شامل کیا جائے۔ اسلامی مما لک کے سفارتخانے ان وفود کے سفر اور حفاظت کو ممکن بنائیں تا کہ یہ لوگ کھل کر اہل مغرب اور امریکیوں کو بتا سکیں کہ اسلام دشمنی میں جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس سے دنیا محفوظ نہیں بلکہ تباہ ہوجائے گی۔ سائنسی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی کا گھمنڈ جس کے بل بوتے پر ان اقوام نے استحصال و جبر کا نیا طریقہ اختیا کیا ہے اس سے عرب وعجم میں بسنے والے مسلمان تو شائد مغلوب ہوجائیں بلکہ کسی حدتک ہو ہی چکے ہیں مگر ربّ اپنی مخلوق کی بے بسی اور بے حرمتی برداشت نہیں کریگا۔

نینا اگر میری جگہ تمہارے سامنے نصرت جاوید، جاوید احمد غامدی، منو بھائی اور ان کے دوسرے بھائی ھود بھائی، نذیر ناجی، معید پیرزادہ، نجم سیٹھی، شیخ رشید، جنرل درانی، ایاز امیر، سرتاج عزیز، نسیم زہرہ اور ہم نواؤں میں سے کوئی بیٹھا ہوتا تو تمہیں ڈیزی کٹروں، سٹلتھ بمبروں، بنکر بسٹروں، کلسٹر بموں، نیوکلائی اور کیمائی ہتھیاروں کے خوف میں مبتلا کرتا اور تمہارا سارا جوش اور حُب الوطنی نکال کر تمہیں رحمٰن ملک کے اصولوں پر چلتے ہوئے زرداری کی غلامی پر مجبور کر دیتا۔ میں نے نینا کی روانی میں خلل ڈالتے ہوئے کہا۔

تم امن کی آشا اور سیفما والوں کو بھول گئے ہو۔ نینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دیکھو ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جن کی مثال اس لومڑی جیسی ہے جو صحرا میں اونٹ کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہے کہ اب اونٹ کا لٹکتا ہوا ہونٹ گریگا اور وہ کھالے گی۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اونٹ کی بناوٹ ہی ایسے ہے۔ یہ لوگ بھی اس امید پر جیتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی امریکہ

پاکستان پر قبضہ کر کے اسے بھارت کے حوالے کر دیگا اس لئے پہلے سے دونوں کے ساتھ بنا کر رکھو۔

خیر چھوڑو۔ ہر کسی کو اپنی امید کے سہارے جینے اور مستقبل کے سہانے یا پھر ڈراؤنے خواب دیکھنے کا حق ہے۔

جو شخص جیسے خواب دیکھتا ہے اور جیسی زندگی جیتا ہے وہ یہ بھی چاہے گا کہ باقی لوگ بھی اس جیسے ہو جائیں، اغیار کی غلامی کریں اور باجگزار زندگی جئیں۔

تم نے امتیاز عالم کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔ امتیاز عالم کا بھی ایک حلقہ ہے جو فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہی مقیم رہتے ہیں مگر اخراجات کوئی اور برداشت کرتا ہے۔ اسلام آباد کی عالیشان کوٹھیوں میں رہنا بھی آسان نہیں۔ حامد میر نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس نے موٹر سائیکل سے جمپ لگایا اور بہت سی گاڑیوں کے اوپر سے کود کر ان کا مالک بن گیا ہے۔ ایک دن وہ الیاس کشمیری کی شان میں کالم لکھتا ہے تو دوسرے دن امن کی آشا کا جاپ کر کے بھارتیوں کا دیا ہوا امن میڈل سینے پر سجا لیتا ہے۔

بھیا ہر کسی کا اپنا اپنا جاپ ہے۔ اس بار پھر تم نے مجھے پٹڑی سے اتارا ہے۔ نینا نے کہا اور پھر بولی۔

اس سے پہلے کہ تم مجھ سے کچھ اور پوچھو میں اپنے نقطے پر واپس آتی ہوں۔ میں جس وفد کی بات کر رہی تھی اگر یہ وفد اہل مغرب اور امریکہ کی عوام اور طالب علموں کو آسان اور سادہ الفاظ میں یہ بتا دے کہ تم سے پہلے بھی ٹیکنالوجی والے بہت آئے اور عبرت کا نشان بن گئے۔ قوم عاد اور ثمود اور فرعون تم سے زیادہ عقلمند، ایڈوانس اور آسودہ حال تھے۔ بنی اسرائیل کا حال آج کے مسلمانوں سے بھی بدتر تھا اور وہ اس دور کے مسلمان تھے۔ ان کے بیچ میں بھی ڈرانے والے اور فرعون کی دہشت کا پراپیگنڈہ کرنے والے موجود تھے۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ کو ربّ نے ان کا نجات دھندہ بنا کر بھیجا مگر وہ ان کی بات پر یقین نہ کرتے تھے۔ ربّ نے ایسے بے یقینوں اور فرعون کے ایجنٹوں کی پروہ نہ کی اور اپنے برگزیدہ نبی کی دعا قبول کر لی۔

مگر فرعون کی تباہی ستر سال بعد ہوئی۔ میں نے کہا۔

ہاں! تم پھر امتیار عالم بن رہے ہو۔

دیکھو ربّ بہتر جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری چالیں، چالاکیاں، منصوبے اور خفیہ مشن

میری مرضی اور حکم کے سامنے خاک بھی نہیں۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ امریکہ نے ساری دنیا کیلئے ایک سکرپٹ تیار کر رکھا ہے کہ کب کسے تباہ کرنا ہے اسی طرح ربّ نے بھی ایک سکرپٹ بنا رکھا ہے جسے تقدیر کہتے ہیں۔ وہ کبھی جلدی اور کبھی دیر سے حرکت کرتا ہے۔ مگر جب حرکت ہوتی ہے تو پیچھے کھنڈر اور ڈھانچے رہ جاتے ہیں۔ مجھے قوی یقین ہے کہ اگر اہل مغرب خاص کر طلباء اور سنجیدہ طبقے کو ان اقوام کا احوال بتا دیا جائے تو مغربی حکومتوں اور متکبر منصوبہ سازوں کا رویہ بدل جائے گا۔

میں یہ بھی بتا دوں کہ اس میں ہر اس شخص کا فائدہ ہوگا جو امن سے جینا چاہتا ہے اور حکومتی اداروں کی طرف سے پھیلائے ہوئے اسلام فوبیا میں مبتلا لوگوں کی زندگیاں آسان ہو جائینگی۔ اسلام نہ تو کسی کو زبردستی اپنے دائرے میں لاتا ہے اور نہ ہی جبر و استحصال کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام نہ ہی فرقہ واریت اور تشدد کا دین ہے اور نہ انسانوں میں تفریق اور تقسیم کی حمایت کرتا ہے۔ اسلام علم و دانش، مساوات اور امن کا پیغام دیتا ہے جس کا عملی نمونہ صرف حضورﷺ کی ذات ہے اور ان ہی کی زندگی اور تعلیمات کے مطالعہ سے قرآن کی عملی اور عقلی تشریح ممکن ہے۔

مغرب کے سوشل سسٹم سے لیکر عدالتی اور انتظامی امور میں تو اسلام پہلے سے ہی نافذ ہے جو خود اسلامی ممالک میں نہیں۔ کیا کوئی زرداری، گیلانی، نواز شریف یا شجاعت حسین کسی مغربی ملک میں کونسلر کا الیکشن لڑ سکتا ہے؟

نہیں میں نے کہا۔

چلو بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب آگے سنو۔

میں نہیں کہتی کہ اہل مغرب کے سامنے اسلام اور قرآن کا حقیقی بیان سو فیصد کامیاب ہوگا مگر ایک بات حقیقت ہے کہ لوگ منفی پراپیگنڈے کے متعلق سوچ ضرور کرینگے جس سے وقتی ہی سہی مگر کچھ ٹھہراؤ ضرور آئے گا۔ اہل مغرب میں تجسس ہے اور اسلام کی اصل حقیقت سے واقفیت انہیں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق پھیلائے گئے منفی پراپیگنڈے کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ مسلمان مبلغین جو یورپ اور امریکہ میں اپنا کام کر رہے ہیں وہ نہ تو اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کی۔ یورپ میں پھیلی مساجد پر مخصوص برادریوں، طبقوں، فرقوں اور بعض جگہوں پر مساجد سیاسی جماعتوں اور گدی نشین پیروں کی ملکیت ہیں جہاں ان ہی کے پیروکار آتے ہیں۔ مسجدوں پر قبضہ ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ آزاد کشمیر کی

ایک مخصوص برادری اس کاروبار پر قابض ہے اور مسجدوں سے کمائے ہوئے پونڈوں سے آزاد کشمیر کے نام نہاد سیاستدانوں اور قبضہ گروپوں کی مدد بھی کی جاتی ہے۔

وہ لوگ جو یورپ اور امریکہ میں دین کو کاروبار، مساجد کو کاروباری مراکز اور برادری سہولت سنٹر بنا کر مال کماتے ہیں وہ جسطرح کا دین پھیلا رہے ہیں اس کے نتائج باہمی چپقلشوں، سیاسی نفرتوں اور دیگر معاشرتی اور اخلاقی مسائل کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ ان مساجد کے امامین اپنے مسلک اور فرقے کے علاوہ دوسری بات کرنے کے مجاز نہیں اور نہ ہی ان کا علم اور مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ وہ قرآن کی اصل روح بیان کرسکیں۔ یورپ میں آج کل انگلش میڈیم اور ینگ علماً کا رواج بھی عام ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے فرقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایسا اسلام اپنے ہی لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش میں ہیں جو ان ینگ اور یورپ میڈ علماً کی سوچ کا عکاس ہے۔ کچھ مساجد میں ہر جمعے کو امام صاحبان سب سے پہلے حاضرین کو یاد دھیانی کرواتے ہیں کہ حضورﷺ بشر تھے چونکہ انہیں شک رہتا ہے کہ کئی ان کے مقلدین نور و بشر کا جھگڑا بھول نہ گئے ہوں۔ کچھ مساجد میں کوئی پیر صاحب یا ان کا نمائندہ یا خلیفہ اپنے مرشد اور ان کے سلسلہ عالیہ کے فیوض براکات دھراتے ہیں تاکہ مریدین اور حاضرین کو یاد رہے کہ وہ کس سلسلے کی مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ کچھ مساجد میں گیسٹ علماً اور دانشور بھی آتے ہیں مگر بدقسمتی یہ کہ یہ خواتین اور حضرات بھی فرقہ واریت سے مبرا نہیں ہوتے چونکہ انہیں دعوت دینے والے لوگ انہیں بھاری معاوضہ اور سہولیات دیکر بلاتے ہیں اور پھر ان کے پروگراموں اور پبلسٹی سے کروڑوں کماتے بھی ہیں۔ یہی حال نعت خوانوں اور قاری صاحبان کا ہے۔ جب دین کو کمرشلائز کردیا جائے تو اس سے نہ صرف دین کی اصل روح اور حقیقت مخفی ہوجاتی ہے بلکہ سننے والوں کے قلب و روح کی تسکین بھی نہیں ہوتی۔ جس عالم اور دانشور کا مقصد فرقہ واریت کو پھیلانا اور نفرتوں کے بیج بونا ہو وہ دوسروں کو کیا سمجھائے گا۔

دین کی روح مخفی کیسے ہوتی ہے؟ میں نے سوال کیا۔

تم میری بات سے نقطہ اٹھاتے ہو اور متن کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ میں نے کہا۔

سنو۔ نینا نے سنجیدگی سے کہا اور بولی۔

دین ایک حقیقت اور خدائی احکامات کا مجموعہ ہے۔ دین خالق اور مخلوق کے درمیان رابطے کا ذریع ہے۔ دین حقوق و فرائض کا خلاصہ ہے۔ جب بندے کا ربّ سے رابطہ کٹ جائے تو دین

ہی اسے بحال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے مگر جب بندہ ربّ کے وجود سے منکر ہوکر مادی بتوں پر بھروسہ وانحصار کرتا ہے تو وہ نہ صرف دین کی حقیقت سمجھنے سے عاری ہوجاتا ہے بلکہ اس کی روح قوت پرواز کھوبیٹھی ہے۔ بندہ جب بندگی کی راہ سے ہٹ کر جیتا ہے تو وہ بندے کی صورت میں درندہ بن جاتا ہے جس کی ظاہری مادی صلاحیتوں سے مخلوق کوضرر پہنچتا ہے۔جس طرح بہتے چشمے اور دریا صحراؤں میں گم ہوجاتے ہیں ویسے ہی دین کی روح مخفی ہوکر انسان کی قلبی تسکین کا موجب نہیں بنتی۔اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے چٹان پر سوسال بارش برسنے سے بھی سبزہ نہیں اگتا جبکہ مٹی پر ایک قطرہ ہریالی کا باعث بن جاتا ہے۔انسان کتنا ہی عالم اور عاقل کیوں نہ ہووہ دین کے بغیر ایک بے روح اور بنجر چٹان کی طرح ہے جس سے مخلوق کو فائدہ نہیں ہوتا۔

اس سے پہلے کہ تم مجھے سائنس اور ٹیکنالوجی کی مثالیں دواور اصل موضوع سے ہٹا دو میں خود ہی تمہارا ذہن کلیئر کرنا چاؤنگی۔میڈیکل سائنس نے ترقی کی اور آج ترقی یافتہ ممالک میں کینسر اور ایڈز جیسے موذی امراض کا علاج کسی حدتک ممکن ہورہا ہے۔اعضاء کی پیوندکاری ہورہی ہے اور دل، جگر، گردے اور پھیپھڑے کی صفائی سرجری اور بحالی کے عمل سے گزر کر مریض صحت مندی کی طرف آجاتے ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے ریسرچ سے جدید علاج اور ادویات دریافت کی ہیں وہی ان بیماریوں کا باعث بھی ہیں۔ایڈز کے جراثیم انسانوں نے بنائے اور پھیلائے، ماحول، غذا اور معاشرے کو انسانوں نے آلودہ کیا جس سے انسان کا سکون چھن گیا اور طرح طرح کی بیماریاں انسانی وجود کولاحق ہوئیں۔انسان نے ایٹم بم، ہائیڈ وجن بم ہی نہیں بلکہ کیمیائی، ریڈیائی اور حیاتیاتی ہتھیار بنا کر ان کے تجربات سمندروں، فضاؤں اور زمین پر زندہ انسانوں پر کئے جس نے نہ صرف زندگیاں کم دیں بلکہ بعض جانداروں کی نسلیں ہی ختم ہوگئیں۔دنیا کے جس کونے میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا قدم نہیں پڑا، وہاں زندگی سادہ اور آسان ہی نہیں بلکہ محفوظ اور طویل بھی ہے۔ میں نے ہنزہ، نگر اور ملحقہ علاقوں کی بات کی تھی جہاں لوگ خالص قدرتی ماحول میں جیتے ہیں۔

کیا تم جدید سائنسی سہولیات اور آسائشوں کی نفی کرتی ہو۔میں نے نینا سے سوال کیا۔

نہیں۔۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔

میں سائنس کے منفی اور مضر استعمال اور قدرتی ماحول کو آلودہ اور زندگی کے لئے خطرات پیدا

کرنے والے رجحانات کی مخالف ہوں۔ میں ان رویوں اور روشوں کی بات کررہی ہوں جس نے کرہ ارض پر بسنے والوں کی زندگیاں غیر محفوظ اور محکوم بنادیں ہیں۔ وہ ممالک جنہیں جدید ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل ہے وہ اس ہنر وفن کے ذریعے دینا سے غربت، بیماری، بھوک اور جاہلیت کے خاتمے کے بجائے غیر ترقی یافتہ اقوام کو محکوم بنانے اور ان کے زیر استعمال زمینوں، پہاڑوں، صحراؤں اور سمندروں میں چھپے قدرتی خزانوں پر قابض ہوکر مزید دولت لوٹنے اور سمیٹنے کی فکر میں ہیں۔ جارحیت اور بربریت کی پہلی بدترین مثال نوآبادیاتی نظام ہے۔ پھر دو عالمی جنگوں کے بعد کولڈ وار کا طویل دورانیہ اور اب اقوام متحدہ کی منظوری سے دوبار عراق پر یلغار اور پھر افغانستان پر قبضہ۔ ترقی یافتہ اور جدید ٹیکنالوجی کی حامل اقوام اور حکومتوں نے اب نیا ڈھونگ رچایا ہے اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخیروں پر براہ راست قابض ہونے کیلئے جمہوریت کی آڑلیکر ایک بار پھر اپنی گھر کی لونڈی اقوام متحدہ کو استعمال کرتے ہوئے لیبیا پر یلغار شروع کردی ہے۔

عراق پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنانے اور رکھنے کا بھونڈا الزام تھا جس سے اہل مغرب، امریکہ اور ان کے دوستوں کو خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ تھا۔ عراق پر یلغار اور انسانیت سوز مظالم ڈھانے کے بعد جدید ٹیکنالوجی سے لیس ممالک نے خود ہی کہہ دیا کہ یہ تو ایک سفید جھوٹ تھا اور ہمیں پتہ تھا کہ عراق کے پاس ایسی کوصلاحیت ہی نہیں۔ مگر کیا کریں ہمیں تفریحِ طبع کے لئے اور اپنی ٹیکنالوجی کو اصل اہداف اور انسانوں پر آزمانے کے لیے ایک ایسے ملک کی ضرورت تھی جس پر ہتھیار اور اسلحے کی آزمائش بھی ہوجائے اور اس جنگ پر جتنا خرچہ ہو وہ بھی پورا ہو۔ عراق پر جارحیت کے بعد دہشت گردی کی عالمی جنگ کا کھیل شروع ہوا جس کا کوئی اختتام نہیں۔ **9/11** اور **7/7** کے واقعات کیسے رونما ہوئے اور ان کے اصل محرکات کیا تھے تا حال ان سے پردہ نہیں اٹھا۔ ان دونوں واقعات کا عالمی سطح پر گہرا اثر ہوا جس سے ترقی یافتہ اور جدید جنگی رجحانات رکھنے والی امریکی اور ان کے حامی اور اتحادی اقوام کو دہشت گردی کے خوف میں مبتلا کر کے دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے پر مائل کرلیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اتحادیوں کو جو کامیابی عراق میں ملی وہ افغانستان میں نہیں مل رہی اور یہی حال شام اور یمن کا ہے جبکہ مصر میں انقلاب جمہوریت کے لئے نہیں بلکہ ایک جرنیل سے اقتدار دوسرے جرنیل کو سونپنے کا بہانہ تھا۔ اگر مصر میں جمہوریت کی اصل روح کے مطابق آزادانہ انتخابات ہوئے تو اقتدار اخوان المسلمین

کو منتقل ہو جائیگا جو امریکہ اور اتحادیوں کو کبھی قبول نہ ہوگا۔امریکہ، اسرائیل اور مغربی ممالک ترکی، فلسطین اور ایران میں جمہوریت کا تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ترکی اور ایران میں جمہوریت نے جڑ پکڑ لی ہے اور فلسطین سے جمہوریت کو نکال باہر کیا گیا ہے۔میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ امریکہ اور اتحادیوں کی روش اور رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے جو بظاہر ممکن نہیں۔اہل مغرب اور امریکہ دیگر دنیا میں کرزائی، مشرف، زرداری اور طالبانی ٹائپ جمہوریت چاہتے ہیں جوان کے اشاروں پر ناچے، عوام پر جبر و استحصال کے پہاڑ ڈھائے اور مغرب کی باجگزاری اور تابعداری کو جز ایمان سمجھے۔

تم سائنسی ترقی کی بات کرتے کرتے سیاست کی طرف چلی گئی ہو۔

میں نے نینا کو روکتے ہوئے کہا۔

یہی تو ظلم ہے کہ جنہیں اللہ نے عقل دی ہے انہیں سمجھ سے عاری کر دیا ہے۔جن کے پاس ہنر ہے وہ اسے مخلوق کی بہتری کے لئے نہیں بلکہ بربادی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔مغربی ممالک، امریکہ اور دیگر اقوام جنہوں نے سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھالیا وہ نہیں چاہتیں کہ دیگر اقوام تک یہ علم پہنچے اور وہ ان کی ہم پلہ ہو جائیں۔دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں نے دیگر دینا کو یرغمال بنالیا چونکہ ان کے پاس جدید ہتھیار اور ایٹمی صلاحیت ہے۔وہ دنیا میں امن و مساوات کے لئے قائم کردہ ادارے اقوام متحدہ کو جنگی جرائم اور اپنی اجارہ داری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل وہی ہوتا ہے جسے امریکہ کی آشیرباد حاصل ہوتی ہے۔اگر امن کے لئے بنایا گیا ادارہ جنگوں کے اجازت نامے جاری کرتا ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔مگر فی الحال سوائے دل جلانے کے اس المیے کا کوئی حل نہیں۔غریب اور کم ترقی یافتہ ممالک جنہیں تیسری دنیا کہا جاتا ہے، کے اپنے مسائل ہیں۔تم عرب لیگ، افریقی اتحاد، آسیان، آرسی ڈی، موتمر عالم اسلامی اور سارک کا موازنہ نیٹو اور یورپی یونین سے کرسکتی ہو۔نیٹو کا بنیادی مقصد یورپی اقوام پر امریکہ کی اجارہ داری ہے۔یہ تنظیم وارسا پیکٹ کے مقابلے میں بنی مگر سویت یونین کے ٹوٹنے کے باوجود اس تنظیم کو نئے خدوخال کے ساتھ نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرتے ہوئے دیگر دنیا پر یورپی اور امریکی نظریات اور خواہشات مسلط کرنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔ہاتھی کے پاؤں میں سب کا

پاؤں کے مصداق امریکہ نے یورپی اقوام کو اپنے پاؤں سے باندھ رکھا ہے اور وہ جہاں یلغار کرتا ہے یورپ والے نیٹو کی زنجیر میں بھندے خود ہی کھنچے چلے جاتے ہیں۔ یورپی یونین بھی علاقائی تنظیم ہے جس میں امیر یورپی ممالک شامل ہیں۔ یورپ میں بسنے والے مسلمانوں خاص کر ترکی اور کم ترقی یافتہ اقوام اس تنظیم کا حصہ نہیں۔ روس اور ترکی یورپ کی جغرافیائی حدود میں رہتے ہوئے اس اتحاد سے باہر ہیں چونکہ یورپی یونین پر بھی امریکہ کا اثر ہے جسے ترکی اور روس من وعن تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔

میری اس بات پر نینا نے کہا۔

چلو چھوڑو۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگیوں میں ہی جمہوریت، انسانی حقوق، دہشت گردی اور تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے بچاؤ جیسے بہانوں، چکموں اور عالمگیر جھوٹ اور فراڈ کی آڑ میں ہونے والے ظلم اور استحصال کا خاتمہ ہو اور اقوام متحدہ جیسا ادارہ طاقتور استحصالی قوتوں کے گھر کی لونڈی کا کردار چھوڑ کر سچ کا ساتھ دے اور دنیا میں امن و مساوات برقرار رکھنے کا رول ادا کرے مگر یہ کسی طور ممکن نہیں۔ قدرت کے اپنے اصول ہیں جن کے تحت نظام کائنات چلتا ہے۔ کب اور کیسے اس جبر کا خاتمہ ہوگا اس کی پیشگوئی ممکن نہیں۔ قدرت کا نظام کبھی جلدی اور کبھی دیر سے حرکت پذیر ہوتا ہے مگر قدرت کا انتقام انتہائی بھیانک، اٹل اور حتمی ہوتا ہے۔ قدرت کا نظام حرکت میں آتا ہے تو کوئی گواہی دینے والا نہیں بچتا۔ قوم نوحؑ، لوطؑ، عاد وثمود، فرعون، اہل سبا اور دیگر کی مثالیں اہل علم وعقل کے لئے کھلی نشانیاں ہیں مگر وقتی سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی اور مادی چمک دمک ہمیشہ انسان کے تنزل کا باعث بنی اور قومیں خش و خاشاک کی طرح وقت کے سمندر میں بہہ گئیں۔

آج دنیا امریکی پابندیوں، سٹلتھ بمبار طیاروں، ڈیزی کٹر بموں اور میزائلوں کی زد میں ہے۔ امریکہ جہاں چاہے اور جب چاہے کاروائی کا حق رکھتا ہے۔ اقوام متحدہ جیسا ادارہ بے معنی ہو چکا ہے اور جاپان سے ناروے تک ہر ترقی یافتہ ملک اور قوم امریکی ہاں میں ہاں ملانے میں ہی آفیت سمجھتی ہے۔ جدید سہولیات سے لطف اندوز ہونے والی ترقی یافتہ اقوام حکومتی پراپیگنڈے پر یقین کرتی ہیں چونکہ انہیں دیگر ذرائع سے کوئی خبر میسر ہی نہیں ہوتی۔ ذرائع ابلاغ پر حکومتوں کا کنٹرول ہے اور یہ ادارے وہی اطلاعات عوام تک پہنچاتے ہیں جس سے

عوام کے ذہنوں کو مفلوج کر کے انہیں جھوٹ کو سچ ماننے پر مجبور کر دیا جائے۔ میڈیا اور حکومتی مشینری جس کے ہاتھ جدید سائنسی علوم کی روشنی ہے وہ نہ صرف اپنے عوام کو اندھیرے میں رکھ کر انہیں دیگر اقوام سے نفرت اور دشمنی پر اکساتے ہیں بلکہ انہیں اس بات سے خوفزدہ بھی رکھتے ہیں کہ تیسری دنیا میں بسنے والے اجڈ اور جاہل، دہشت گرد ہیں اور وہ کسی بھی وقت ترقی یافتہ اقوام پر حملہ آور ہو کر ان کا جدید لائف سٹائل نہ صرف تباہ کر دینگے بلکہ ان کے ملکوں پر قابض بھی ہو جائینگے۔ تیسری دنیا میں یوں تو بیشمار ممالک اور اقوام آباد ہیں مگر یورپ اور امریکہ میں تیسری دنیا اور دہشت گردی کا مطلب مسلم دنیا اور مسلمان ہیں جسکا مفصل ذکر سیموئل پی ہٹنگٹن نے اپنی تصنیف ''تہذیبوں کے تصادم'' میں کیا ہے۔ اب یہ مسلم دنیا کے حکمرانوں اور مسلمان علماً کی سوچ اور ذہنیت پر منحصر ہے کہ وہ کسی کمپلکس کے بغیر جرأت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے خود سچائی اور خودداری کی راہ پر چلیں اور پھر اسلام کی حقیقت اور روحانیت سے ترقی یافتہ اقوام کو باور کروائیں کہ اسلام درحقیقت سلامتی، امن، ترقی اور انسانی بھائی چارے کا دین ہے۔ اسلام اصل جمہوریت اور انسانی حقوق کا علمبردار ہے جس کا درس نبی آخرالزمان ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب نے نہ صرف تعلیم بلکہ عمل کی صورت میں بھی دیا۔ اہل یورپ آج پندرہ سو سال بعد جس بے اختیار جمہوریت اور بے بنیاد انسانی حقوق کا علم اٹھائے دیگر دنیا کو اپنے نظریات کے تابع کرنا چاہتے ہیں اس کا حقیقی اور بنیادی درس اسلام نے ہی دیا۔

بے اختیار جمہوریت کیسے؟ میں نے پوچھا۔

جمہوریت ووٹ کے ذریعہ ایک فرد کو منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجنے کا نام نہیں بلکہ جمہوریت کا مطلب عوام کی خواہشات کا احترام بھی ہے۔ لوگ ووٹ دیکر ایک اسمبلی تو منتخب کر لیتے ہیں مگر وہ اس کا محاسبہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے جبکہ اسلامی جمہوری نظام میں قدم قدم پر عوام کو محاسبے کا اختیار ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا آج جنت کا نمونہ ہوتی اور کرہ ارض سے دوسری اور تیسری دنیا کا تصور مٹ چکا ہوتا۔ ترقی یافتہ ممالک زندہ انسانوں پر اپنے ہتھیار نہ آزماتے اور جھوٹ اور فریب پر مبنی پراپیگنڈہ مہم چلا کر اپنے ہی عوام کو بیوقوف نہ بناتے۔ یہ بے اختیار جمہوریت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج امریکی عوام یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہم ٹیکس اس لئے نہیں دیتے کہ حکومتیں دوسرے ممالک پر جنگیں مسلط کریں۔ دیکھا جائے تو امریکہ نے ویتنام، کوریا اور عراق سے لیکر افغانستان تک جتنی جنگیں لڑیں وہ نہ صرف بے مقصد تھیں بلکہ شکست اور ندامت کا

باعث بھی تھیں۔امریکہ کی ان جنگوں میں امریکی عوام نے اپنے حکمرانوں کی حمایت نہیں کی۔ وہ دولت جو امریکی حکمران اپنی پالیسیوں کے تسلط کے لیے خفیہ اور ظاہر جنگی منصوبوں اور دوسرے ممالک میں سازشوں کے ذریعے حکومتوں کو کمزور اور باجگزار بنانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اگر یہی دولت امریکی عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کریں تو آج جس حال میں امریکی عوام ہیں اس سے کہیں بہتر زندگی کی سہولیات انہیں میسر ہوں۔

اگر امریکہ کو واقعی پاکستان جیسے ممالک میں ٹانگ اڑانے اور وہاں اپنی مرضی کی حکومتیں مسلط کرنے کا شوق ہے تو اسے نفرت، دھونس اور جبر سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔مشرف کے بعد زرداری، گیلانی، رحمٰن ملک اور حسین حقانی جس قدر پاکستان کا نقصان کرینگے پاکستانی عوام اتنے ہی امریکہ سے بدظن اور متنفر ہونگے۔امریکہ اور اہل مغرب کو معلوم ہونا چاہیے کہ کوریا، عراق اور افغانستان کے عوام کا مزاج پاکستانیوں سے مختلف ہے۔اس میں شک نہیں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ پاکستانی میسر ہونگے جو امریکی مفادات کے لئے کام کرنے کو تیار ہونگے مگر جب یہ ایک کروڑ کھل کر سامنے آجائینگے تو ان کی زندگیاں چند روز سے زیادہ نہ ہونگی۔آج بلوچستان پر علیحدگی پسندی کا سیاہ بادل چھایا ہوا ہے جس کی بنیاد پرویز مشرف، مشاہد حسین، شجاعت حسین اور وسیم سجاد نے رکھی مگر بلوچستان کی کل آبادی کا ایک بڑا حصہ آج بھی پاکستان کا حامی ہے۔بلوچستان کے عوام میں پھیلی مایوسی، عدم تحفظ اور غربت سے نہ صرف پاکستان کی سیاسی جماعتیں فوائد حاصل کررہی ہیں بلکہ دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیاں بھی بھرپور کردار ادا کر کے پاکستان سے بلوچستان کو علیحدہ کرنے کی کوشش میں ہیں۔

پچھلے دس سالوں میں بلوچستان میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اگر ان کا موازنہ مشرقی پاکستان کے حالات سے کیا جائے تو بلوچستان کے حالات سابقہ مشرقی پاکستان سے کئی زیادہ بدتر ہیں۔ پاکستان مخالف قوتوں نے سابقہ مشرقی پاکستان کے مقابلے میں بلوچستان پر زیادہ توجہ دی اور اربوں ڈالر بھی خرچ کیے مگر سوائے خون خرابے اور نفرتوں کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔امریکہ اور اتحادیوں کو پتہ ہے کہ بلوچستان کے بغیر افغانستان پر کنٹرول ممکن نہیں مگر انہیں یہ علم نہیں کہ بلوچستان پر قبضہ افغانستان سے بھی کئی گنا مہنگا اور ناممکن ہے۔ایران شمالی اتحاد کا خیرخواہ تو ہے مگر وہ نہ تو افغان فارسی بانوں اور نہ ہی ہم مسلک اہل تشیع افغانوں کو اپنے ہاں پناہ یا کسی قسم کی تربیت دینے کا متحمل ہوسکتا ہے۔ایرانی عقلمند قوم اور دانشوروں کی نسل سے ہیں جو

دوسروں کو حکومت، حکمرانی، سیاست اور ادب سیکھاتے آئے ہیں۔ وہ نہ مسلک اور نہ ہی زبان کے جھانسے میں آتے ہیں اور نہ ہی کسی کو اپنی سرزمین پر پرایا کھیل کھیلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ایرانیوں کو پتہ ہے کہ ایسے کھیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے چونکہ پاکستان اس کے پڑوس میں اس کھیل کا نتیجہ بھگت رہا ہے۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

جیسے تم جانتے نہیں۔ نینا نے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگی۔

کسے پتہ نہیں کہ ضاء الحق نے افغانوں کی مسلک کی بنیاد پر مدد کی اور ایرانیوں نے اپنے ہم مسلکوں کو کیمپوں تک محدود کر دیا۔ ضیأ الحق نے سارا پاکستان افغان کیمپ میں بدل دیا جو آج دہشت گردی کے جہنم میں بدل چکا ہے۔ ضیأ الحق کے دور میں پیر صاحب گیلانی اور نبی محمدی کی پارٹیوں کو وہ پذیرائی نہ تھی جو گلبدین، یونس خالص، اور دیگر کو تھی چونکہ گیلانی اور نبی کا تعلق پیروں کے گھرانوں سے تھا اور ان کا مسلک عرب ڈونروں سے ہم آہنگ نہ تھا۔ جب تک ایران کی مدد نہ ہو امریکہ اپنی تمام تر قوت اور اتحادیوں کی دولت کے باوجود بلوچستان پر نہ تو قبضہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے پاکستان سے کاٹ کر آزاد بلوچستان بنا سکتا ہے۔ ایران کو پتہ ہے کہ پاکستانی بلوچستان ہی نہیں بلکہ ایرانی بلوچستان بھی امریکی ایجنڈے پر ہے جس کی تکمیل کی صورت میں ایران پاکستان سے پہلے ہی بکھر جائے گا۔

ایرانی عقلمند اور باشعور قوم ہے اور ایک قدیم تہذیب و ثقافت کی علمبردار بھی ہے۔ ایران انقلابوں کی سرزمین ہے اور ایرانی قوم نے پچھلی چند دہائیوں میں جتنی قربانیاں دیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ گو کہ ایران پاکستان کے معاملے میں نہ اپنا ہے اور نہ ہی بیگانہ مگر اسے اپنی حفاظت اور مشرقی سرحدوں پر امن کے لئے ایک آزاد بلوچستان کی نہیں بلکہ ایک پاکستان کی ضرورت ہے۔ ایرانی خلیج پار عربوں، مغرب میں اپنے ہم مسلک عراقیوں، شمال اور شمال مغرب میں بسنے والے افغانوں پر کبھی اعتماد نہیں کرتے۔ عرب امریکہ کے اتحادی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے ورنہ رہیں گے ہی نہیں۔ ایران کا عراقیوں سے مسلکی اور افغانوں سے لسانی رشتہ تو ہے مگر مسلک اور زبان اعتماد اور بھروسے کی ضمانت نہیں۔ عراق اور افغانستان کا ایک اپنا مزاج ہے جو وقت اور حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اس مزاج کی ایک اپنی تاریخ بھی ہے۔ عراقیوں اور افغانوں نے کبھی پڑوسیوں کی تکالیف کا احساس نہیں کیا اور ہمیشہ سے ہی ایسی قوتوں سے دوستی کا

ہاتھ بڑھایا جوان کے پڑوسیوں کے دشمن تھے۔۔

میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ افغانستان بھارت کا فطری دوست ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کی جو بھی قوت پاکستان کو نقصان پہنچائے افغان ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ امریکہ یا کوئی بھی مغربی ملک پاکستان پر الزام تراشی کرے افغان حکومت اس کی ہمیشہ ہی وعدہ معاف گواہ بن جاتی ہے۔

ایران بھی تو بھارت کا ازلی دوست ہے۔ میں نے کہا۔

ہے۔ اور ترکی کے علاوہ آزربائیجان، آرمینیا اور جارجیا بھی تھوڑے بہت ایرانیوں کے پڑوسی ہیں مگر بھارت یا کوئی دوسرا ملک ایرانیوں کی پالیسیوں پر اثرانداز نہیں ہوتا اور نہ ہی ایرانی کسی کے کہنے پر پاکستان دشمنی کا اظہار کرتے ہوئے کسی دوسرے ملک کو پاکستان کے خلاف کسی قسم کی مدد فراہم کرتے ہیں۔

ایران کو پاکستان سے جو شکایات ہیں ان میں سرفہرست پاکستان کی امریکہ نوازی اور پھر امریکہ کے ہاتھوں ذلت و رسوائی کے بعد پھر دوستی ہے۔ ایرانیوں کی دوسری شکایات پاکستان میں شیعہ سنی (دیوبندی) فساد ہے۔ میں جن ایرانیوں سے ملی ہوں ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں اہل تشیع فرقے کے لوگوں پر ظلم ہوتا ہے اور انہیں سنی اکثریت کے مقابلے میں کمتر سمجھا جاتا ہے۔

تم کیا کہتی ہو؟ میں نے نینا سے پوچھا۔

میرے خیال اور علم کے مطابق ایران کی تینوں شکایات حقیقت پر مبنی نہیں اور ایرانیوں کو اس مسئلے کو ازخود حل کر کے پاکستان پر نہ صرف ناقابل یقین بھروسہ کرنا چاہئے بلکہ پاکستان کی مدد بھی کرنی چاہئے چونکہ امریکہ اور پاکستان کا رشتہ مجبوری کا ہے۔ یہ رشتہ دوستی، محبت اور ہمدردی کا نہیں بلکہ غلامی، محکومی، مایوسی اور مجبوری کا ہے۔ یہ رشتہ دو قوموں کا نہیں بلکہ پاکستانی حکمرانوں، اشرافیہ اور اہل ثروت کا ہے۔ پاکستان اس وقت تک امریکی غلامی میں رہے گا جب تک اس بدقسمت قوم کو ایک دیانتدار، مخلص، محبّ وطن اور باعمل قائد نہیں ملتا۔ بدقسمتی سے آج کل پاکستان میں کاروباری اور کرپٹ ذہنیت کے حامل بیوپاریوں کی ایک منڈی سجی ہے جنہیں اہل پاکستان قائد اور لیڈر کہہ کر دل بہلا رہے ہیں۔ ان قائدین کے ذاتی مفادات امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک جن میں اہل مغرب کے علاوہ عرب، افغان اور بھارت بھی شامل ہے سے

منسلک ہیں اور وہ امریکہ سمیت کسی اتحادی کو ناخوش کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ پاکستانی قوم کو اپنی بربادی کا احساس نہیں کہ جنہیں وہ لیڈر اور قائد سمجھ کر اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھائے ہوئے ہیں وہی ان کے دشمن ہیں۔ پاک افغان اور بھارت افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کیا ہے اور امریکی وزیر خارجہ اور سینٹروں کی اس معاہدے میں کیا دلچسپی ہے کسی پاکستانی دانشور کو غرض نہیں اور نہ ہی عوام کو اپنی بربادی کا احساس ہے۔ اسی طرح ایک کروڑ افغانوں کا پاکستان میں ہر طرح کے کاروبار پر چھا جانا اور حکومت کے ہر ادارے کو اپنے حق میں استعمال کرنا ایک ایسا معمہ ہے جس کا نہ حکومت کے پاس جواب ہے اور نہ عوام کو احساس۔ ایرانیوں کو پاکستان اور اہل پاکستان پر ترس کھانا چاہیے نہ کہ ان سے ناراض ہو کر ان کی تکلیفوں میں اضافہ۔ ایرانیوں کو پتہ ہے کہ پاکستان میں قائداعظمؒ سے لے کر آصف علی زرداری اور گیلانی تک سبھی حکمران شیعہ مسلک کے پیروکار تھے اور ہیں۔

کچھ سنی بھی تو تھے۔ میں نے کہا۔

ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ نینا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

قائداعظمؒ کے بعد طاقتور حکمران سکندر مرزا تھے وہ شیعہ بھی تھے اور ایرانیوں کے داماد بھی۔ ایوب خان صرف مسلمان تھے جن پر مغربی ثقافت اور فوجی تربیت کے علاوہ اور کوئی رنگ نہ تھا۔ ایوب خان مکمل سیکولر اور امریکہ نواز حکمران تھے۔ ایوب خان کے بعد یحییٰ خان آئے جو ایرانی نژاد شعیہ مسلمان تھے مگر سیکولر ہی نہیں بلکہ سیکولروں کے استاد بھی تھے۔ قائداعظمؒ اور حسین شہید سہروردی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم پاکستان کے عظیم قائدین میں شمار ہیں اور وہ بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ پرویز مشرف، بے نظیر بھٹو کے بعد زرداری اور گیلانی بھی شیعہ ہیں جنہیں پاکستان کے اٹھارہ کروڑ لوگوں نے اپنا قائد اور لیڈر تسلیم کیا ہے۔ غلام اسحاق خان، نواز شریف اور ضیاءالحق کا مسلک بھی دیوبندی ہے اور اس مسلک کے ماننے والے سنی بریلوی اکثریت کی نسبت اہل حدیث اور وہابی مسالک کے زیادہ قریب ہیں۔ سوائے ضیاءالحق کے باقی کسی بھی شیعہ، دیوبندی سنی نے اپنے ہم مسلک طبقے کی کھل کر حمایت نہیں کی اور نہ ہی کھلے عام لوگوں کو مسلک کی بنیاد پر تقسیم کیا اور باہم لڑایا ہے۔ پاکستان میں حکمران شیعہ ہو یا سنی عوام کو کبھی اس سے غرض نہیں رہی اور نہ ہی قومی سطح پر ایسی سوچ ہے۔ قائداعظمؒ، حسین شہید سہروردی اور ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ہر پاکستانی لیڈر کا مذہب اقتدار اور دولت ہے اور مسلک امریکہ

ہے۔ جو حال ایران میں سنی اقلیت کا ہے اس کا ذرہ بھر شائبہ بھی پاکستان میں نہیں۔ ایران میں کسی سنی کا صدر بن جانا تو درکار کسی سرکاری ادارے کا چپراسی اور خاکروب بننا بھی ممکن نہیں۔ پاکستان میں مسلک، زبان اور علاقائیت کو ہوا دینے اور فسادات پھیلانے میں بھی دوسرے ممالک کا ہاتھ ہے اور اس گھناؤنے فعل میں مسلمان ممالک بھی شامل ہیں۔

پاکستان میں شیعہ سنی کی کوئی تقسیم نہیں۔ ایک ہی خاندان، برادری اور قبیلے کے لوگ مختلف مسالک کے ماننے والے ہیں۔ میں ایسے کئی گھرانوں کو جانتی ہوں جن کی بیٹیاں اہل تشیع گھروں میں بیاہی ہیں اور بہت سی شیعہ لڑکیاں سنی گھروں کی زینت ہیں۔ اسی طرح سوائے انتہائی کٹر گھرانوں کے وہابی، اہل حدیث، بریلوی اور دیوبندی گھرانوں اور خاندانوں کی باہم رشتہ داریاں بھی ہیں۔

میں تمہیں ایک مزے کی بات بتاتی ہوں۔ نینا نے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود ہی بولی ایک نہیں تین باتیں بتاتی ہوں۔

ضیاٗ الحق کے دور میں حکومت میں جمعیت نے زور پکڑا اور سارے ملک کے تعلیمی ادارے میدان جنگ بن گئے۔ جمعیت کے مقابلے میں پی ایس او، ایم ایس ایف، بی ایس او اور دیگر سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والی طلباٗ یونین نے اعلان جنگ کردیا اور کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خونی معرکے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت اور یونین کو حکومتی مدد اور حمایت حاصل تھی وہی فتح یاب ہوئی اور تعلیمی اداروں پر قابض ہوگئی۔ دوسری تنظیموں نے بھی ہار نہ مانی مگر ان اداروں میں ان کی چوہدرائٹ ختم ہوگئی۔ جمعیت کی قوت کے بعد ہر ادارے کا حال یہ تھا کہ سالانہ داخلوں کے موقع پر ہر طالب علم جمعیت کی رکنیت حاصل کرتا اور مزے سے داخلہ حاصل کرلیتا۔ ان طلباٗ میں شیعہ سنی بریلوی اور دیوبندیوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی طلباٗ بھی شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ مجبوری کا نام شکریہ اور فاقے کا نام روزہ۔ میری ایک جاننے والی کرسچین لڑکی کا نام ایلن اور باپ کا نام بشیر تھا۔ میڈیکل کالج میں داخلے سے پہلے اس نے اپنا نام علینا بشیر رکھ لیا اور جمعیت والے بھائیوں کی حفاظت اور مدد سے ڈاکٹر بن کر امریکہ چلی گئی۔ پاکستان میں جس کے ہاتھ ڈنڈا ہو اس کا فرقہ اور مسلک چلتا ہے۔

ضیاء الحق کے زمانے میں زکوٰۃ کا قانون بنا تو ملک بھر کے امیر اور دولت مند لوگوں نے مسلک کے خانے میں شیعہ لکھ کر اربوں روپے کی زکوٰۃ بچالی۔ کیا پتہ کہ پاکستان میں بسنے

والے پندرہ فیصد شیعہ مسلمانوں میں پانچ فیصد زکوٰۃ بچانے والے سنی بھی شامل ہوں۔

دوسرا واقعہ اوکاڑہ کا ہے۔ انجمن سپہ صحابہ اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ میں جنگ چھڑی تو پہلے اوکاڑہ میں سپہ صحابہ کا لیڈر قتل ہوا اور پھر کچھ عرصہ بعد فقہ جعفریہ کے مقامی قائد کو قتل کر دیا گیا۔ ان دنوں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور اوکاڑہ میں پیپلز پارٹی کا ایم این اے چوہدری شفقت عباس ربیرہ تھا۔ چوہدری صاحب کی وسیع و عریض حویلی ملتان روڈ پر واقع تھی جس کے صدر دروازے پر ریشمی علم نصب تھا۔ یہ علم اس قدر بلندی پر لگایا گیا تھا کہ کئی میل کے فاصلے سے کالے ریشمی علم پر یا عباسؓ پڑھا جا سکتا تھا۔ فقہ جعفریہ کے قائد کے قتل کے بعد تنظیم کے لوگ چوہدری صاحب کے پاس گئے اور انہیں قیادت سنبھالنے کی درخواست کی تو پتہ ہے کیا ہوا۔

کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

نینا نے ہنس کر کہا کہ چوہدری شفقت عباس نے سرے سے ہی انکار کر دیا کہ ان کا فقہ جعفریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ چوہدری صاحب مرحوم نے کہا کہ وہ تو صرف آل رسول ﷺ سے محبت کرتے ہیں اس لئے برکت و ثواب کے لئے علم لگایا ہے ورنہ ان کا اصل مسلک تو دیوبندی ہے۔ کچھ روز بعد دیکھا گیا کہ حویلی کے صدر دروازے سے علم ہٹا دیا گیا اور چوہدری صاحب پر بھی زوال آ گیا اور آخر کار انہوں نے خودکشی کر لی۔

چوہدری صاحب کا اصل مسلک کیا تھا؟ میں نے پوچھا۔

کہہ چکی ہوں کہ اہل ثروت و سیاست کا مسلک دولت، دھونس، ظلم و جبر اور تکبر ہوتا ہے۔ چوہدری صاحب بھی سیاستدان تھے اور جاگیردارانہ سیاست ان کا مسلک تھا۔ ان کی سیاست کا اہم کارنامہ اپنی مخالف جماعت کے کارکنوں کو درختوں سے باندھ کر زندہ جلانا تھا اور ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پاکستان کو ایک مضبوط ایٹمی قوت دیکھنا تھا۔

چلو ایک خواہش تو اچھی تھی۔ میں نے کہا۔

ہاں۔ نینا نے جواباً کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

میں مسلکی سیاست کی بات کر رہی تھی کہ عوام میں ایسی کوئی بیماری نہیں جس کا وہم ایرانیوں کو ہے۔ ساری نفرتیں اور کدورتیں سیاستدانوں، سیاسی علماً اور ہمارے دوست ملکوں اور خفیہ اداروں کی پیداوار ہیں جس کا نشانہ پاکستانی عوام ہیں۔

فوج میں ایک ایسا دور بھی تھا جب ہر طرف تبلیغی جماعت کا چرچہ تھا۔ کوئی فوجی مشق ہو یا

عام تربیت، تبلیغ پر جانے والے افسروں اور جوانوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ بعض یونٹوں میں تبلیغ پر نہ جانے والے افسروں کو اچھا نہ سمجھا جاتا اور جہاں کوئی بڑا کمانڈر تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتا ہو وہاں تبلیغ پر جانا مجبوری بھی تھا۔ میں ایک ایسے افسر کو جانتی ہوں جس نے اپنے کمانڈر کی خوشی کے لئے داڑھی بڑھالی اور اونچے پائنچوں والی شلوار پہنی شروع کر دی۔ اس کا مزاج بھی بدل گیا اور وہ سہ روزہ اور چالیس روزہ تبلیغی دوروں پر جانے لگا۔ بریگیڈیئر مستنصر باللہ اور جنرل عباسی کے بغاوتی منصوبے کے عیاں ہونے کے بعد فوج سے تبلیغ پر جانے والوں کا سلسلہ تھما تو مجبوری کی تبلیغ میں بھی ٹھہراؤ آگیا۔ وہ افسر جو سالانہ رپورٹوں پر منفی ریمارکس سے بچنے کے لئے تبلیغ پر جاتے تھے ان کی جان بخشی ہوگئی اور وہ واپس اپنی پرانی ڈگر پر آگئے۔ تبلیغی جماعت کا مسلک بھی دیوبندی ہے وہ اپنے تبلیغی نصاب سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کرتے۔ یہی حال دیگر مسالک کا ہے مگر ان کے ماننے والوں میں کوئی کٹر پن نہیں۔

اور اس سجیلے افسر کا کیا بنا جس نے اچکن پہن لی تھی؟ میں نے پوچھا۔

وہ بھی واپس سوٹ میں آگیا اور پہلے سے بھی زیادہ لبرل اور سیکولر ہوگیا۔ دیکھو میں کسی فرقے یا مسلک پر تنقید نہیں کر رہی۔ میرا بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت ملت اس چیز کو زیادہ اہمیت دیں جس کا حکم ربّ اور رسول ﷺ نے دیا ہے اور جو قرآن اور حدیث سے واضح ہے۔ اگر مسلمان بحیثیت امت اسلام کے پانچ بنیادی ارکان اور قرآن و حدیث پر توجہ رکھیں تو نہ ہی کسی ملا، سیاستدان اور بیرونی قوت کو موقع ملے گا کہ وہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرے اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے ملکوں اور وسائل پر قبضہ کر کے انہیں ذلت و رسوائی کی زندگی جینے پر مجبور کرے۔

مجھے ایک سعودی باشندے نے بتایا کہ حضرت امام خمینیؒ اتحاد مسلم کے بڑے داعی تھے مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر وہ کوئی بڑا اقدم نہ اٹھا سکے۔ امام خمینیؒ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ساری دنیا کے مسلمان کسی ایک طریقہ نماز پر متفق ہو جائیں تو امت مسلمہ کی آدھی پریشانیاں دور ہو جائینگی۔ اگر مسلمان ایک مشترکہ فوج، مشترکہ کرنسی اور مشترکہ اقتصادی پالیسی پر اتفاق کرلیں تو مسلم امہ دنیا کی سب سے خوشحال اور طاقتور قوت بن جائے اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ امام خمینیؒ کی یہ بھی خواہش تھی مدینہ کی طرح حضور ﷺ کے زمانے کے سارے شہر مکہ کو حرم پاک کا حصہ قرار دیکر ساری عمارتیں اور ہوٹل ہٹا دیئے جائیں اور حرم پاک کے چاروں اطراف کھلا میدان

چھوڑ دیا جائے۔ امام خمینیؒ چاہتے تھے کہ حرم شریف سے لیکر میدان عرفات تک وسیع میدان ہو کہ زائرین اور حجاج کرام بغیر کسی تکلیف کے مقدس مقامات تک آ اور جاسکیں۔

پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

سعودی باشندے کے مطابق امامؒ کے کچھ پیروکاروں نے کہا کہ جناب آپ اس پر فتویٰ صادر فرمائیں تو امام نے مسکرا کر کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ اس پر عمل نہیں ہوگا اور مزید انتشار پھیلے گا۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو امت مسلمہ کے اتحاد کے لئے امام خمینیؒ کی رائے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے مگر جذبات کی آگ سے کھیلنے والوں کو ایسی رائے سے کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔

استاد جمعہ خان نے بھی امام خمینیؒ کے اس قول کی تصدیق کی تھی مگر اس کا کتابی مواد مجھے میسر نہ آیا۔ مسگر کی یاسمین اور ہرنائی کے استاد جمعہ خان کا بھی یہی تجزیہ تھا کہ پاکستان ایک لبرل ملک ہے جہاں بسنے والی اقوام اور قبائل کی زبانیں اور مسلک تو الگ الگ ہیں مگر وہ بحیثیت مجموعی متعصب اور کٹر پن کا شکار نہیں۔ جو حالت ایران اور عرب ممالک میں سنی مسلک کے ماننے والوں کی ہے ایسی کوئی سوچ پاکستان میں نہیں۔ پاکستان میں اقتدار ہمیشہ ہی اہل تشیع اور دیوبندی مسالک کے ماننے والوں اور امریکہ کے منتخب کردہ اشخاص کے پاس رہا ہے۔ پاکستانی عوام نے کبھی مسلک کو سیاست اور ریاست پر ترجیح نہیں دی مگر موجودہ دور میں مسلک نے سیاست پر غلبہ حاصل کرلیا ہے اور ریاست کے وجود پر مسلکی نظریات مسلط کرنے کی جنگ جاری ہے۔ پاکستانی اور پنجابی طالبان سعودی عرب میں نافذ اسلامی اور شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں جس پر وہابی ازم کا غلبہ ہے۔ وہابی مسلک کا نظریہ شریعت جسے پاکستانی طالبان کے علاوہ جمعیت علمائے اسلام مولانا فضل الرحمٰن گروپ اور سمیع الحق گروپ بشمول جماعت اسلامی، جمعیت اہل حدیث اور اسی مسلک سے منسلک افغان طالبان کی بھی حمایت حاصل ہے۔

پنجابی اور پاکستانی طالبان کی بڑھتی ہوئی مسلح کاروائیوں کے پیچھے دنیا بھر کے سرکاری خفیہ اداروں کی حمایت اور مدد کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا چونکہ پاکستانی اور پنجابی طالبان کی اصطلاح بذات خود ایک بڑا ہتھیار اور پاکستانی قوم کے خلاف نفسیاتی جنگ کا اعلان ہے۔ اگر پاکستانی یا پنجابی طالبان میں شامل افراد کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں زیادہ تعداد پختونوں کی ہے۔ دوسرے نمبر پر افغان اور دیگر غیر ملکی ہیں جبکہ پنجابی طالبان میں کشمیر، ہزارہ اور قبائلی علاقوں سے لیکر کراچی تک کے لوگ شامل ہیں جو کہ ایک ہی مسلک کے ماننے والے ہیں۔ اس میں شک نہیں

کہ پاکستانی طالبان میں کثیر تعداد تو پاکستانیوں کی ہے مگر پنجابی طالبان میں سارے پاکستان کے لوگ شامل ہیں۔ پنجابی طالبان کی اصطلاح اس لئے گڑھی گئی تا کہ دنیا کو یہ تاثر دیا جائے کہ دہشت گرد صرف پنجابی ہیں۔ اس اصطلاح پر اے این پی اور پیپلز پارٹی کے نمائندے اور اراکین اسمبلی نے بھی خوب بحث کی اور پنجابی طالبان کی اصطلاح کو اپنے اپنے حق میں کیش کروانے اور پنجابیوں کو ملک دشمن اور دہشت گرد ثابت کرنے میں خوب زور لگایا۔ اس اصطلاح پر پاکستانی میڈیا نے بھی اپنی دانش بکھیرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ملک کے اندر پھیلی نفرتوں کی ہوا کو مزید تقویت دی تا کہ کشت وخون کا جاری سلسلہ کسی طور پر رک نہ پائے۔ کسی سیاستدان، عالم دین، دانشور اور میڈیا مینجر نے اس اصطلاح کو اغیار کی چال کہہ کر رد نہیں کیا بلکہ ان اصطلاحات کے پیچھے خفیہ ہاتھوں کو مزید تقویت دی اور معاملات کو مزید بھگاڑنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

اولیاء کرام کے درباروں پر حملے، قبروں سے ہڈیاں نکال کر انہیں درختوں اور چوراہوں پر لٹکانے، مساجد پر حملے کرنے کے علاوہ پاکستانی اور پنجابی طالبان نے عام لوگوں، سیکیورٹی فورسز اور خاص کر سنی وشیعہ عقائد کے ماننے والوں پر حملے کئے تو ملک میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے بعد سنی تحریک بھی وجود میں آ گئی جو کہ پاکستانی سیاست میں ایک نیا اضافہ ہے۔ اگر تحریک طالبان پاکستان اور ان کے حمایت یافتہ ممالک اور پاکستان کے اندر مذہبی حلقوں اور سیاسی جماعتوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو جلد ہی ملک کے اندر ایک مسلکی جنگ جس کا پہلے سے آغاز ہو چکا ہے مزید شدت اختیار کر جائے گی۔ لوگ اپنے پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے بھی بدظن ہو جائینگے اور یہ لڑائی گلی محلوں سے لیکر شہروں تک پھیل جائے گی جو پاکستان مخالف قوتوں کے لئے سودمند ہوگی۔

پاکستانی سیاستدانوں، دانشوروں اور ٹیلیویژن چینلوں پر بیٹھے طوطوں، میناؤں اور چڑیوں کو بھی احساس ہونا چاہئے کہ وہ کس طرح اغیار کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں اور خودغرضانہ سیاست اور سستی شہرت کی حامل دانشوری کا ڈھول پیٹ کر پاکستان مخالف قوتوں کے دست راست بن جاتے ہیں۔ طوطوں، میناؤں اور چڑیوں اور اینکروں میں کچھ فرق ہونا چاہئے۔ یہ تینوں پرندے سانپ، بلی، بندر، شیر اور لومڑی میں فرق محسوس نہیں کرتے اور زمین پر چلتے اور رینگتے جانوروں پر ملکر چیختے، چلاتے اور ڈال ڈال اڑتے تھک کر واپس پہلی جگہ آ جاتے ہیں۔

زمین پر چلتے اور رینگتے جانوروں کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ چیخ وپکار عارضی، بے ضرر اور عادت کی مجبوری ہے۔ پاکستانی اینکروں کو دیکھا جائے تو وہ بھی ایسے ہی پرندوں کی طرح ہیں جن کا کام جذبات میں بہہ کر چہچہانہ اور عوام کو تفریح مہیا کرنا ہے مگر ساتھ ہی یہ دشمن کے پھیلائے ہوئے جھال میں پھنس کر اور اس کے ماؤتھ پیس بن کر ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ جس جگہ کوئی حادثہ ہو ٹیلیویژن والے وہاں مورچہ لگا کر ان جگہوں کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں جو مستقبل میں دہشت گردوں کی منصوبہ بندی کا حصہ ہوتے ہیں۔ پاکستانی ٹیلیویژن اینکر اور رپورٹر اپنی لگاتار کمنٹری کے ذریعے دہشت گرد تنظیموں کے ہیڈ کواٹر والوں کو مکمل تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں تا کہ بھاگ جانے والے دہشت گردوں کو علاقے سے بحفاظت نکلنے میں آسانی ہو۔

اگر پاکستانی سیاستدانوں نے احساس ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کیا اور برادریوں، قبیلوں اور علاقائی نفرتیں پھیلانے کے بعد فرقہ واریت کی وبا پھیلا کر ذاتی اور سیاسی فوائد حاصل کرنے کا دھندہ زور پکڑ گیا تو ملک تباہ اور قوم بدحال ہو جائے گی۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ایران اپنے ہم مسلکوں کو پناہ تو دیتا ہے لیکن پنجرے سے باہر نہیں جانے دیتا۔ سعودی عرب میں بھی اتنے محل نہیں کہ چالیس پچاس مولانا حضرات کے لئے الگ الگ محل مختص کیا جائے۔ فرانس، امریکہ اور برطانیہ مولویوں اور مسلک کی جنگ لڑنے والوں کی مدد تو کرتے ہیں، پناہ نہیں دیتے۔ بہتر یہی ہوگا کہ احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے وطن سے پیار کیا جائے۔ اپنے ملک کو اغیار سے بچایا جائے اور مسالک کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اپنی ذات تک ہی محدود رکھا جائے۔ وہ لوگ جو اپنے ہم مسالک ممالک کی مدد سے اپنے ہی ملک کے اندر اپنے نظریات بزور شمشیر دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور مسلکی جنگ کو جہاد سمجھ کر لڑ رہے ہیں شائد انہیں احساس نہیں کہ وہ اس جنگ سے وہ کچھ حاصل نہیں کر پائینگے جو انہیں مفت میں ملا ہوا ہے۔ اگر عام پاکستانیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ان کے مسلک کا ہی صدر اور وزیر اعظم ہونا چاہیئے تو پھر تو سعودی عرب اور ایران کے فوجیں انہیں اقتدار پر مسلط کرنے نہیں آئینگی البتہ بھارت، امریکہ اور اتحادی اپنے اپنے حصے کا پاکستان بانٹنے ضرور آجائیں گے۔

ایک اور بات کی وضاحت کر دوں۔ نینا نے پوچھا۔

اتنا کچھ کہہ کر ڈرا رہی ہو تو اور بھی کہہ دو۔ میں نے کہا۔

میں نے کہا تھا کہ ایران بلوچستان کی تقسیم نہیں چاہے گا اور اس سے پہلے میں کہہ چکی ہوں کہ خدا نہ کرے اگر پاکستان امریکی منصوبے کے مطابق تقسیم ہوا تو ایران بھی حصہ داروں میں شامل ہوگا۔ اگر زرداری، گیلانی منصوبے کے تحت پاکستان لسانی اور قبائلی بنیادوں پر نئے صوبوں کی صورت میں تقسیم ہوتا ہے تو اگلا قدم مکمل علیحدگی اور تقسیم کا ہوگا۔ اگر ساری دنیا ان نئے صوبوں کو آزاد ریاستوں کی صورت میں تسلیم کرتی ہے تو ایران کو پاکستان سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے؟

کچھ سوچنے کے بعد نینا نے کہا۔

دیکھو۔ سیاست کی جڑیں گہرائی میں نہیں جائیں بلکہ پھیلتی ہیں اور ان کا پھیلاؤ مفادات اور مقاصد کے تحت پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ ملکوں اور قوموں کے مفادات اور ذاتی مفادات میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پاکستان کی سیاست ذاتی مفادات کی محافظ ہے۔ ذرا ماضی کی طرف دیکھو تو گاندھی، نہرو اور پٹیل کے اثاثے بھارت میں تھے اور یہی رسم آگے بھی چلی اور بھارتی ایک قوم بن گئے۔ قائداعظمؒ اور بھٹو کے اثاثے بھی ملک میں تھے اور ملک میں ہی رہے اور ملک کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ شاہ ایران کے اثاثے امریکہ اور فرانس میں تھے اس لئے شاہ بھی ملک سے باہر دفن ہوا۔ امام خمینیؒ کے اثاثے نظریات، علم اور اصول تھے جو فرانس اور برطانیہ کے مفاد میں نہ تھے اس لئے امام اپنے قیمتی اثاثوں سمیت واپس ایران لوٹ آیا اور اپنی دولت ساری قوم میں تقسیم کردی۔ ایرانی ایک قوم ہیں اور ان کے لیڈر ہر فیصلہ قومی مفاد میں کرتے ہیں۔ امریکہ اور اتحادی عربوں کی حمایت وتائید سے لیس عراق پر حملہ آور ہوئے تو ایران نے خاموشی اختیار کی اور بہت سے فوائد بھی سمیٹے۔ آج امریکہ اور اس کے اتحادی عراق پر قابض ہیں مگر کسی امریکی جہاز یا ڈرون نے کبھی ایران سرحد کی خلاف ورزی نہیں کہ اور نہ ہی کوئی فوجی کسی عراقی کو پکڑنے ایران کی سرحد پر آیا۔

وجہ کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

چونکہ احمدی نژاد کے بیرون ملک کوئی اثاثے نہیں اور نہ ہی اس کے ذاتی راز کسی رحمان ملک کے پاس ہیں۔ اسے کسی بلیک میلنگ کا خطرہ نہیں اور نہ ہی وہ کسی بابر اعوان اور حسین حقانی کے مشوروں کا محتاج ہے۔ وہاں امریکی فوجی جرنیل اور سینٹرائیر پورٹ پر اترتے ہی سیدھے ایوان صدر جاکر دھمکیاں نہیں لگا سکتے بلکہ ایران کے خلاف بیان دینے سے پہلے بھی سوچتے

ہیں۔احمدی نژاد کسی این۔آر۔او کی گارنٹی پر صدر نہیں بنا اور نہ ہی وہ اپنے ملک کی عدلیہ پر اپنی پالیسیاں مسلط کرتا ہے جبکہ یہ سب کچھ پاکستان کے مقدر میں لکھا ہے۔

دیکھو۔ ایرانی پاکستان کے بھارت اور افغانستان کی نسبت اچھے اور پرامن پڑوسی ہیں۔ ایرانی اپنے مطلب کو اولیت دیتے ہیں اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔ پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی اور مسلکی کشیدگی ایران اور سعودی عرب کی مدد اور حمایت کے بغیر ختم نہیں ہوسکتی۔ امریکہ، بھارت اور دوسرے ممالک دہشت گردی کو پاکستان کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ اگر ایران اور سعودی عرب نے پاکستان کی مدد نہ کی تو یہ ہتھیار آگے چل کر مزید مہلک ہو جائے گا۔

ایران اور سعودی عرب کو احساس ہونا چاہئے کہ پاکستان میں اقتدار ہمیشہ ہی اہل تشیع اور دیوبندی مسلک کے ماننے والوں کے ہاتھ رہا جنہیں سنی اکثریت نے ہی ووٹ دیئے اور بطور قائد قبول کیا۔ اگر اہل پاکستان ہر مسلک اور مکتب فکر کے ماننے والے مسلمانوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق انہیں عزت و تعظیم دیتے ہیں تو دوست اور مسلم ممالک کو بھی اہل پاکستان کی عزت و تعظیم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پاکستان میں اپنے مسالک کے تحفظ کے بجائے اہل پاکستان کے تحفظ و تکریم کا احساس کرنا چاہئے۔

میں نے قرآن کریم کی آیات کا حوالہ دیا ہے کہ اللہ نے اپنے منتخب رسولوں کو غیب کا علم دیا جو خدائی ٹاپ سیکرٹ ہے اس لئے اس پر بحث کی گنجائش نہیں۔محض فتنہ و فساد کا ماحول پیدا کرنے کی خاطر اور امت میں تقسیم اور تفرقہ پیدا کرنے کے لئے ایسے موضوعات سے پرہیز کرنے میں ہی عافیت ہے۔اگر کوئی شخص، عالم یا فرقہ یہ کہتا ہے کہ ان کے پیغمبر ﷺ بشر تھے اور نور نہیں تھے تو وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے چونکہ قرآن پاک میں ذکر ہے کہ پریوں، جنوں اور فرشتوں کو نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہی نبی اور رسول مبعوث کئے گئے جو خدا کی برگزیدہ اور منتخب ہستیاں تھیں۔ جو لوگ بشریت کے قائل ہیں اور اپنے نبی ﷺ کی بشری ہیئت سے آگے دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں انہیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نبی ﷺ بشر تو تھے مگر اللہ کے منتخب اور مقرب بشر تھے جبکہ کسی بھی طبقے اور مکتبہ فکر کے مسلمان کا کوئی بھائی نہ اللہ کا منتخب بندہ ہے اور نہ ہی مقرب ہستی ہے۔ کسی بھی شخص کے بھائی کی پیدائش سے پہلے دنیا کا ماحول ایسا نہ تھا جیسا نبی ﷺ کی پیدائش سے پہلے تھا۔ کسی کے بھی بھائی کی پیدائش پر آتش کدہ

ایران گل نہ ہوا اور نہ ہی قیصر کے محل کے کنگرے زمین پر آن گرے۔ کسی کے بھائی کو حلیمہ سعدیہ جیسی دائیہ نہ ملی جس کے کمزور اور لاغر جانوروں کو اللہ نے صحت دیکر اپنے نبی ﷺ کی پرورش کا سامان پیدا کیا۔

کون ہے جو دعویٰ کرے کہ جبرائیل اس کے بھائی کے لئے ربّ تعالیٰ کا پیغام لایا اور کس پر قرآن اترا اور معراج نصیب ہوئی۔ طائف کی مصیبتیں اور اہل مکہ کا رویہ اور پھر ہجرت کی صعوبتیں اور منافقین کے طعنے برداشت کرنے والا حلیم کون ہوسکتا ہے۔ کس کا بھائی رحمت العالمین ہوسکتا ہے اور کس کے دشمنوں کو ربّ اپنا دشمن کہتا ہے۔ اگر میں شان رسول ﷺ کا قرآنی اور طبعی بیان ذکر کروں تو یہ محفل کبھی ختم نہ ہوگی۔ وہ لوگ جو اپنے ہی نبی ﷺ کی شان میں کمی کرتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ اغیار انہیں سے شہہ پا کر کبھی کارٹون بناتے ہیں، کبھی فلمیں تصویریں اور کبھی سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسوں کو تحفظ اور انعامات سے نوازتے ہیں۔ کبھی قرآن جلاتے ہیں اور کبھی مسجدوں اور امام بارگاہوں پر حملہ آور ہو کر فتح کا جشن مناتے ہیں۔

نینا میں نے مستنصر حسین تارڑ کی کتاب ''غار حرا میں ایک رات'' میں پڑھا ہے کہ طائف میں اس مقام پر جہاں حضور ﷺ پر سنگ باری کی گئی ایک مسجد بتائی گئی تھی اور زائرین خاص کر اہل تشیع اس مسجد میں جا کر نوافل ادا کرتے تھے اور کچھ اپنے نبی ﷺ کے غم اور درد کو یاد کر کے آنسو بہاتے اور روتے تھے۔ مقامی حکومت کو زائیرن کا یہ عمل پسند نہ آیا اور مسجد کو جلا دیا گیا۔ تارڑ نے لکھا ہے کہ مسجد جل چکی تھی اور جگہ جگہ قرآن پاک کے آدھ جلے اوراق بکھرے تھے جنہیں دیکھ کر از حد دکھ ہوا مگر مقامی حکومت کے خوف سے ان اوراق کو سمیٹنا اور احترام سے کسی جگہ رکھنا ہمارے بس میں نہ تھا۔

تمہارے گاؤں میں بھی تو پیپلز پارٹی کے ایک جیالے کے حکم پر درجنوں قرآن جلائے گئے تھے جبکہ آزاد کشمیر میں تو شرعی نظام بھی نافذ ہے۔ تحصیل سے لیکر ہائی کورٹ تک جج اور قاضی مقرر ہیں مگر کسی جج یا قاضی نے از خود نوٹس نہ لیا اور نہ ہی حکومت کو آگاہ کرنے کے باوجود کوئی کاروائی ہوئی۔ اسی جیالے کے حکم پر علاقے کی مسجد میں مخالف برادری کو نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں اور مقامی بازار سے سودا سلف خریدنے والوں پر بھی پابندی عائد ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ڈوگرے اور سکھ بھی ایسا کرتے تھے۔ میں اکثر کتابوں میں پڑھتی ہوں کہ سکھوں نے مسجدوں کی

بے حرمتی کی اور مسجدوں کو اصطبل میں بدل دیا۔ آج مسلمان خود ہی مسجدوں کو قرآن اور نمازیوں سمیت جلا رہے ہیں چونکہ یہ نمازی اور مسجدیں ان کے مسالک سے ہم آہنگ نہیں۔ آزاد کشمیر جسے آزادی کا بیس کیمپ کہا جاتا ہے اور جس پر ایک ولی کامل کی جماعت کی اکثر حکمرانی رہتی ہے وہاں تو جنازہ گاہوں اور قبرستانوں کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ڈوگرے اور سکھ آزاد کشمیر کے نام نہاد جیالے اور متوالے سیاستدانوں اور بیوروکریسی سے بدرجہا بہتر تھے؟

نینا نے سوالیہ نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

موجودہ حالات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شہزادہ کرن سنگھ پیپلز پارٹی کے نو دولتیے بیوپاریوں اور مسلم کانفرنس کے صاحبزادوں اور خودساختہ سرداروں اور شہزادوں سے لاکھ درجے بہتر حکمران ہوتا۔ وہ منگلا ڈیم سے کروڑوں کا غبن نہ کرتا اور نہ ہی دولت کی ہوس میں اپنا ضمیر بیچتا۔ اس کے بیٹے اور بیٹیاں این جی اوز کے چکر میں دولت اکٹھی نہ کرتے اور نہ ہی کسی کے فرنٹ مین بنکر اپنے باپ دادا کی عزت و ناموس سرِ بازار بیچتے۔

میں نے نینا کے کڑوے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

دیکھو۔ ڈوگرے اور سکھ اتنے بے انصاف نہ تھے جیسا کہ تاریخ کو مسخ کر کے بتایا گیا ہے۔ مظفرآباد کے ڈوگرہ تحصیلدار نے مظفرآباد اور بوئی کے درمیان بننے والے پل کا میٹریل دریا برد کروادیا جس کی منظوری گورنر سرحد، وائسرائے ہند اور مہاراجہ کشمیر دے چکے تھے۔ مہاراجہ نے تحصیلدار کو جموں طلب کر کے اتنی بڑی حکم عدولی پر سرزنش شروع کی تو تحصیلدار نے کہا حضور بوئی کا خان بدکردار اور شرابی ہے۔ اس کے ظلم سے بوئی کی کوئی عورت محفوظ نہیں۔ اگر یہ پل بن گیا تو اس بدکردار کا مظفرآباد سے رابطہ ہو جائے گا اور آپ کی بیٹیاں بھی اس کے ہوس کا نشانہ بنیں گی۔

مہاراجہ نے کچھ سوچا۔ تحصیلدار کو شاباش دی اور وائسرائے ہند کو لکھا کہ آپ چاہئیں تو مانسہرہ سے بوئی تک سڑک بنوادیں ہم پل بنانے کا اجازت نامہ منسوخ کرتے ہیں۔

میں قدرت اللہ شہاب اور دوسرے دانشوروں کا احترام کرتی ہوں مگر ہر بات سے متفق نہیں ہوں۔ ڈوگرہ سپاہی، پٹواری اور تھانیدار ڈوگرہ ازم کرتے ہونگے اور یہ کام آج بھی برادری ازم اور جیالہ عزم کی آڑ میں جاری ہے مگر ڈوگرے جج اور اعلیٰ افسر موجودہ دور سے بدرجہا بہتر اور

ضرب المثل تھے۔

مہاراجہ کے نزدیک ساری ریاست کی خواتین اس کی بیٹیاں تھیں جبکہ بیرسٹر سلطان اور ان کے وزرائے کرام کا معاملہ الٹ تھا۔ شراب نوشی اور بدکاری کو مردانہ وجاہت سمجھا جاتا تھا اور مخالفین کی زمینوں اور قبرستانوں پر قبضہ حکومت کے فرائض میں شامل تھا۔

اس سے پہلے مسلم کانفرنس کی حکومت آئی تو پیپلز پارٹی کی حکمرانی کے سارے اسلوب وزیراعظم ہاؤس سے صدارتی محل میں منتقل ہوگئے اور وہ سارے امور جو اعلانیہ انجام دیئے جاتے تھے درپردہ ہونے لگے۔

اب تم ہی بتاؤ کہ مہاراجہ تو ہندو ڈوگرہ تھا مگر اسے سارے ریاست کی بہو، بیٹیوں کی عزت اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز تھی جبکہ بیرسٹر دور میں وزیر اور اعلیٰ افسر نوکریوں کے بہانے ریاست کی بیٹیوں کی عزتیں لوٹتے تھے۔ مہاراجے ننگے پاؤں درباروں اور مزاروں پر حاضریاں دیتے تھے اور آزاد کشمیر کے حکمران اوقاف اور زکوٰۃ کا مال لوٹ کر شرابیں پیتے اور مجرے دیکھتے ہیں۔ مہاراجوں نے قانون بنایا کہ ریاست کے باہر کا کوئی آدمی ریاست میں زمین وجائیداد نہیں خرید سکتا اور سردار قیوم کے بیٹے نے ہزاروں ایکڑ زمین وزیراعظم پاکستان کے بیٹوں کو لیز پر دے دی۔ میرپور کے سدا برتی جاٹوں کا خاندان ساری زندگی میرپور اور جموں کے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا اور اب میرپور کے سیاستدان برادریوں کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ہر حکومتی عہدہ خرید کر اپنی برادریوں کے نااہل اور متعصب افراد کے حوالے کر رہے ہیں تاکہ وہ دوسری برادریوں کا استحصال اور اپنی برادری کے مفادات کا تحفظ کریں۔ ڈوگرے جج عدالتوں میں بیٹھ کر انصاف کرتے تھے اور آج کچھ جج عدالتوں میں بیٹھ کر درخواست گزاروں اور سائلوں کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے ہیں۔ سیاستدان اور ان کے ہمنوا افسر قبضہ گروپ تشکیل دیتے اور پھر پولیس کی موجودگی میں قبضے کرواتے ہیں۔ جو کچھ آج آزاد کشمیر کی انتظامیہ اور سیاسی جنتا کر رہی ہے ایسی کوئی مثال سکھ اور ڈوگرہ راج میں نہیں ملتی۔ سکھ دور کے کرنل میاں سنگھ کی انتظامی اور عدالتی خوبیاں اور کارنامے تاریخ میں ضرب المثل ہیں جن کا مفصل ذکر محمد دین فوق کی تصنیف تاریخ کشمیر میں موجود ہے۔

تم پھر دور نکل گئی ہو۔ میں نے نینا کو روکتے ہوئے کہا۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر الیے کا ایک المیہ ہوتا

ہے۔جس طرح پھول بیشمار پتیوں کے ملاپ سے بنتا اور پھر کھلتا ہے اسی طرح کانٹے بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔جس طرح خوشیاں خوشیوں کی ہم آواز ہوتی ہیں ویسے ہی دکھ اورغم ایک دوسرے کے ہمراز ہوتے ہیں۔اس دنیا میں جہاں زندگی ہے وہاں جغرافیہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔جغرافیائی حالات تاریخ کا رخ موڑتے ہیں اور تاریخ کرہ ارض پر رونما ہونے والے حادثات اور واقعات کا ریکارڈ مرتب کرتی ہے۔جس طرح پھولوں کی پتیاں اور کانٹوں کے ڈانڈے باہم ملے ہوتے ہیں ویسے ہی واقعات اور حادثات کی کڑیاں ملکر تاریخ کا تسلسل قائم رکھتی ہیں۔

جغرافیائی تبدیلیاں قدرت کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں اور حالات انسانی رویوں سے بگڑتے اور بنتے ہیں۔ معاشرتی اور ریاستی بگاڑ سے چھوٹے چھوٹے واقعات جنم لیتے ہیں اور پھر حادثات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے پہاڑی علاقوں میں کھیتوں اور بستیوں کو بچانے کیلئے ڈھلوانوں پر گہرے نالے کھودیئے جاتے تھے اور بارشوں کے پانی کا رخ قدرتی نالوں، ندیوں اور دریاؤں کی طرف کردیا جاتا تھا۔ یہ کام گاؤں اور محلے کے لوگ مل کر کرتے تھےاوراپنے اپنے علاقوں سے پانی کی گزرگائیں بناتے تھے۔

گاؤں والوں کی اور بھی بہت سے باتیں ہیں جواب نہیں رہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر گاؤں ایک ریاست ہے۔گاؤں والے سب سے شاطر اور تیز ترار آدمی کو چوکیدار منتخب کرتے تھے اور ضلعی حکومت اس چوکیدار کو ماہانہ تنخواہ دیتی تھی۔ چوکیدار کے پاس شادی بیاہ،موت اور پیدائش کے رجسٹر ہوتے تھے جن میں وہ شادی۔طلاق،موت اور پیدائش کا ریکارڈ رکھتا تھا۔چوکیدار کو علاقہ پٹواری،گرداور، فاسٹ گارڈ اور علاقہ کے تھانیدار کا معاون سمجھا جاتا تھا۔گرداور، پٹواری، فارسٹ آفیسر اور پولیس آفیسر علاقہ کے نمبردار کی بیٹھک میں آتے اور علاقہ پنچائت کی موجودگی میں سرکاری امور اور شکایات نبھاتے۔کوئی بات خفیہ نہ ہوتی اور نہ ہی کھلے عام رشوت اور سفارش کا بازار گرم ہوتا۔

جنگل میں آگ لگ جائے یا کوئی اور ناگہانیت برپا ہو چوکیدار فوراً حرکت میں آجاتا ہےاور لوگوں کو جمع کرکے آفات کا مقابلہ کیا جاتا۔تقسیم سے پہلے جب ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے تو بھائی چارے کی بہترین روایات، اخلاق وآداب کا رواج تھا۔انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کی فضا میں لوگ جیتے اور مرتے تھے۔مسلمانوں کی شادیوں پر ہندو اور سکھ اپنے

عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرح شرکت کرتے اور ایک ہی پنڈال پر الگ الگ کھانے پکا کر کھاتے۔ مسلمانوں کو موت پر ہندو اور سکھ خشک راشن جمع کر کے موت والوں کے گھر بھجواتے تاکہ تعزیت کے لئے آنے والوں کا کھانا پک سکے اور گھر والوں پر بوجھ نہ ہو۔ ہندو یا سکھ مر جائے تو مسلمان کریا کرم کے لئے لکڑیاں جمع کر کے شمشان گھاٹ پر پہنچاتے اور جب موت کی رسمیں شروع ہوتیں تو دور ہٹ جاتے۔ مسلمان، سکھ اور ہندو عورتیں بھی خوشی اور غم میں ایک دوسرے کے گھروں میں ایسے ہی جاتیں جیسے ان کے اپنے قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شرکت کرتے۔

تقسیم کے بعد بھی روایات، آداب و اخلاق میں کمی نہ آئی اور لوگ ایک دوسرے کا جینے کا حق تسلیم کرتے رہے۔ محرم کے جلوسوں کے راستوں پر سنی پانی اور دودھ کی سبیلیں لگاتے اور راستوں کی صفائی اور حفاظت کو یقینی بناتے۔ محرم کی آمد سے پہلے مسجدوں اور امام بارگاہوں میں معززین علاقہ اور علماٗ کی میٹنگ ہوتی اور دس محرم تک ہونے والی تقریبات کا جائزہ لے کر سارے بندوبست کئے جاتے۔

مجھے یاد ہے کہ جہلم شہر میں ایک ریٹائیرڈ پولیس آفیسر ایس پی زیدی ہوا کرتے تھے جو محرم سے پہلے شیعہ سنی علماٗ پر مشتمل ایک کمیٹی بناتے جسے امن کمیٹی کہا جاتا۔ یہ کمیٹی سنی نوجوانوں کا چناؤ کرتی جو سارے محرم میں جلسے جلوسوں اور امام بارگاہوں کا تحفظ کرتی اور شہر میں امن رہتا۔ میں نے یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں اس لئے دی ہیں کہ بظاہر چھوٹی اور سادہ روایات جن کی بنیاد سچائی، سادگی، امن، بھائی چارے، انسانی ہمدردی اور خلوص پر استوار تھیں بڑے حادثات کو روکنے کا باعث تھیں۔ محلوں، گاؤں اور قصبوں کی سطح پر نہ مذہبی منافرت تھی اور نہ ہی کسی کو فرقہ واریت کا مرض لاحق تھا۔ لوگ انسانی رشتوں میں منسلک تھے اور پڑوس سے لیکر علاقہ کی سطح پر فلاحی کام کرتے تھے۔ آج چوکیدار کا کام ایم این اے حضرات کرتے ہیں جو کہ چوکیدار جتنی صلاحیتوں کے مالک بھی نہیں ہوتے اس لئے وہ ہر طرف گند پھیلاتے ہیں۔ چوکیدار کا موت، زندگی اور شادی بیاہ کا اپ ٹو ڈیٹ رجسٹر نادرہ کے پاس چلا گیا ہے اور اب اپ ٹو ڈیٹ نہیں رہا۔ چوکیدار کے رجسٹر پر سچائی لکھی ہوتی تھی جسے پٹواری اور تھانیدار چیک کرتے تھے۔ اب نادرہ کے افسروں کے پاس جدید سہولیات کی بھرمار ہے مگر کارکردگی انتہائی ناقص، تکلیف دہ اور کرپشن سے بھرپور ہے۔ شناختی کارڈ کے حصول کو مشکل سے مشکل تر بنایا جا رہا ہے اور عام آدمی کو ذلت و

خواری کے بعد شناختی کارڈ ملتا ہے۔عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے سارا سارا دن گرمی اور سردی میں لمبی قطاروں میں لگے دھکے کھاتے ہیں تب جا کر کہیں شناختی کارڈ والے بابو کی شکل نظر آتی ہے۔اگر بابو تک رسائی ہوجائے تو اکثر بجلی چلی جاتی اور سائل کو دوسرے روز کی ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔سرکاری دفتروں میں چائے، کھانے اور نماز کے لمبے وقفے ہوتے ہیں جن کا بوجھ بھی غریب عوام برداشت کرتے ہیں۔نادرا اور پاسپورٹ آفس کا ماحول ایک ہی جیسا ہے جبکہ بینک، قومی بچت کے ادارے، بجلی، گیس کے دفتر اور ڈاکخانے بھی تھانوں، کچہریوں اور جیلوں جیسا ماحول پیش کرتے ہیں۔

ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ کلرک سے سیکرٹری تک کی ایک ہی ذہنیت ہے۔سیکرٹری کو کلرک اور کلرک کو سیکرٹری بنا دو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا چونکہ دونوں ایک دوسرے کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔دونوں کا مقصد قومی خزانہ اور قوم کو لوٹنا اور آسان کام کو مشکل اور پیچیدہ بنانا ہوتا ہے۔بداخلاقی، تکبر اور دھونس دونوں کی سرشت میں ہوتی ہے اور دونوں ہی عوام کو رعایا سمجھتے ہیں۔یہی حال عوام کے منتخب نمائندوں کا ہے۔کونسلر اور وزیر میں بھی کوئی فرق نہیں۔دونوں منتخب ہوکر فرعونیت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور عام آدمی سے دور ہوجاتے ہیں۔کونسلر، ممبر پارلیمنٹ اور وزیراعظم کا ایک جیسا مزاج ہوتا ہے۔سبھی اپنے اردگرد اخلاق باختہ، قانون شکن، عوام دشمن اور کرپٹ لوگوں پر مشتمل ایک گروہ جمع کر لیتے ہیں جو پولیس، پٹواری اور دیگر محکموں کو کنٹرول کرتے، اپنی مرضی کے کام نکلواتے اور عام آدمی کا استحصال کرتے ہیں۔ملکی میڈیا ان لوگوں کو جمہوریت کے علمبردار، ملک کا مستقبل، آئین کے محافظ اور عوامی امنگوں کے ترجمان قرار دیکر ان کے بدافعال اور گھناؤنے کردار کی اپنے انداز میں تشریح کرتا اور مال کماتا ہے۔

میں کہہ رہی تھی کہ ایک شاطر اور تیز وطرار چوکیدار کا کام کتنے لوگوں نے سنبھال لیا ہے۔چوکیدار لڑکے کی پیدائش کا اندراج آٹھ آنے لے کر کرتا تھا جو کہ خوشی کی علامت اور اچھے شگون کی روایت تھی۔یہ اٹھنی صرف آسودہ حال لوگ دیتے تھے عام لوگ چوکیدار کو خوشی کے موقع پر ایک مرغی، لسی یا دودھ کا گلاس یا میٹھی روٹی پیش کرتے تھے۔محلے کی مسجد کا امام اور تقسیم سے پہلے گاؤں کا پنڈت اس موقع پر موجود ہوتے اور بچے کا نام تجویز کر کے اندراج کروایا جاتا۔

آج کل نادرا والے یہی کام ہزاروں روپے میں کرتے ہیں۔خاص کر افغانیوں کے دو نمبر پیدائشی سرٹیفکیٹ، جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بھاری رشوت کے عوض بنتے ہیں۔جن دنوں

لوگ اپنے گھروں اور کھیتوں کو بچانے کے لئے کھالے، تالاب اور جوہڑ بناتے تھے اور مل کر بناتے تھے تو تب یہ سب کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ ان کی حفاظت بھی کریں۔ان کے گرد سایہ دار اور پھلدار درخت لگائیں تاکہ زمین کٹاؤ سے بچ جائے۔ یہ درخت ٹاہلیوں، کیکروں، پھلائیوں، برگد، آم، جامن اور پھگواڑوں کے ہوتے تھے اور سب کے سب مفید اور طویل العمر تھے۔ٹاہلیوں، کیکروں اور پھلائیوں سے بکریوں کا چارہ اور بالن آتا تھا۔ برگد کے سائیہ دار درختوں کے نیچے مال مویشی اور چرواہے گرمیوں میں ٹھنڈی چھاؤں کے مزے لیتے تھے۔آم اور جامن سائیہ اور پھل دیتے تھے۔ ہماری روایات میں احساس ذمہ داری اور امداد باہمی کا عنصر بھی شامل تھا جو اب مٹ گیا ہے اور یہ سب جمہوریت اور سیاسی لیڈروں کی کارستانی ہے۔

میں کراچی سے اسلام آباد جارہی تھی اور میرے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھی جو کسی این جی او سے منسلک تھی۔ دوران پرواز خاتون نے بتایا کہ اس کا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور اس کی نند صاحبہ کا نام شہزادہ کوثر گیلانی ہے اور وہ پیپلز پارٹی کی اہم رکن ہیں۔آزاد کشمیر کی سیاست اور شہزادہ صاحبہ کی سیاسی زندگی کے بعد خاتون نے بتایا کہ سردار عتیق کی بیگم اور بیٹی کی اپنی اپنی این جی او ہیں جنہیں بھاری بھرکم فنڈز آلاٹ ہوتے ہیں۔ کہنے لگیں کہ سردار عتیق صاحب نے ہمیں ایک سکول کی تعمیر کے سلسلہ میں اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی اور جو زمین سکول کے لئے مختص کی گئی تھی وہ جنگلات کی تھی جس پر چیل کے بلند و بالا خوبصورت درختوں کا جھنڈ تھا۔ سردار صاحب نے فرمایا کہ آپ یہ درخت کاٹ دیں اور ہماری این جی او کی مدد سے سکول تعمیر کریں۔ خاتون کہنے لگیں کہ ہم نے سردار عتیق کے اس پروپوزل پر کام کرنے سے انکار کردیا چونکہ خوبصورت درختوں کا قتل ہمیں اچھا نہ لگا۔ان درختوں کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ تھی جبکہ تین این جی اوز نے ملکر دس لاکھ سے کم لاگت کا ایک سکول تعمیر کرنا تھا اور اس سکول کی آڑ میں سردار نے نوے لاکھ سے زیادہ کمانے تھے۔۔

ہمارے ملک میں این جی اوز مال کمانے، کام خراب کرنے اور سکینڈل بنانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ ادارے عوام دشمن ہیں جنہوں نے معاشرے اور ریاست کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے بجائے معاشرتی آداب اور روایات کو تباہ کیا ہے۔جس ملک میں چوکیدار کا کام پارلیمنٹ کا ممبر اور وزیر کرتا ہے اور کلرک کا سیکرٹری وہاں قانون کی حکمرانی اور آئین کی پاسداری کی بات

کرنا مذاق کے سوا کچھ نہیں۔

اگر ملک میں چوکیدار انظام ماضی کی روایات کا حصہ سمجھ کر برقرار رکھا جاتا تو آج ملک میں ایک کروڑ افغان، ڈیڑھ کروڑ بھارتی اور بنگالی چھپ کر نہ بیٹھتے اور نہ ہی ریمنڈ ڈیوسوں کی فوجیں پاکستان کے گلی کوچوں میں گھومتی پھرتیں اور پاکستانیوں کا شکار کرتیں۔ اگر ایبٹ آباد میں چوکیدار اور تھانیدار ہوتے تو وہاں کوئی اصلی یا نقلی اسامہ بھی چھپ کر نہ بیٹھتا اور نہ ہی پاکستان اور پاکستانی دنیا بھر میں رسوا ہوتے۔

تھانیدار کا کیا رول تھا؟ میں نے پوچھا۔

چوکیدار اپنے علاقے کے رہائشیوں کا اندراج رکھتا تھا تو تھانیدار دوسرے علاقوں اور شہروں سے آنے والوں پر نظر رکھتا تھا۔ باہر سے آنے والوں پر لازم ہوتا تھا کہ وہ مقامی چوکیدار، نمبردار یا پھر تھانیدار کو اپنی عارضی یا پھر مستقل سکونت سے آگاہ کریں۔ ایوب خان کا بی ڈی سسٹم آیا تو باہر سے آنے والوں کے لئے ایک سکونتی سرٹیفکیٹ (ریذیڈنٹ سرٹیفکیٹ) متعارف کروایا گیا کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے اور وہ موجودہ جگہ پر کس مقصد کے لئے رہائش رکھنا چاہتا ہے۔ طالب علموں کا ریکارڈ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہوتا تھا جہاں وہ داخلہ فارم کے ساتھ ڈومیسائل بھی جمع کرواتے تھے جبکہ مل مزدوروں کا ریکارڈ مالکان کے پاس ہوتا تھا۔ اگر ایبٹ آباد کے متعلقہ تھانیدار اور چوکیدار کے پاس ریکارڈ ہوتا تو بے نام لوگوں کو چار چار کنال کے مکان بنانے کی جرأت نہ ہوتی اور نہ ہی سانحہ ایبٹ آباد برپا ہوتا۔

میں کہہ چکی ہوں کہ یہ سب نادرا اور وزارت داخلہ کے کارنامے ہیں جو پیسہ لے کر کسی کو بھی شناختی کارڈ جاری کر دیتے ہیں۔ افغانی، ایرانی، بھارتی اور بنگالی تو درکنار خود پرویزی دور حکومت میں تین کروڑ سے زائد جعلی ووٹروں کو قومی شناختی کارڈ جاری ہوئے اور لوگوں نے ووٹ بھی کاسٹ کر دیئے۔

تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ میں نے پوچھا۔

میں کہنا چاہتی ہوں کہ جدید سہولیات کو روایات، اخلاقیات اور آداب سے الگ نہ کرو۔

میں کہنا چاہتی ہوں کہ اپنی مٹی سے محبت کرو اور نام نہاد آزادیوں کی آڑ میں غلامی کا طوق نہ پہنو۔

میں کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ انسانی مساوات، بھائی چارے

اور امن سے رہ سکتے تھے تو شیعہ سنی کے جھگڑوں میں الجھ کر اپنے دینی تشخص اور عظمت کو برباد نہ کرو۔

میں کہنا چاہتی ہوں کہ اپنے اندر جرأت انکار پیدا کرو اور نام نہاد سیاستدانوں کو مسترد کردو۔ تمہیں کسی زرداری، نواز شریف، گیلانی۔ الطاف بھائی، اسفندیار ولی، فضل الرحمٰن اور شجاعت حسین کی ضرورت نہیں۔ کسی طیب اردگان، مہاتیر محمد یا احمدی نژاد کو تلاش کرو جن کی تمہارے معاشرے اور ملک میں کمی نہیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو اور مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ سیاست کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دو ورنہ تمہاری ہستی ہی مٹ جائے گی۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ جرم، جبر، کرپشن، جھوٹ اور فراڈ کے خلاف بغاوت کرو اور مجرموں، جابروں، فراڈیوں کو چن چن کر انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرو۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ اپنے دین پر کاربند ہو جاؤ اور قرآن و حدیث سے رہنمائی لو۔ مسلک کو اپنی ذات تک رکھو اور مسلک کی آڑ میں نفرت نہ پھیلاؤ۔ وہ جنہیں تم یہود و ہنود کہتے ہو وہ بھی تمہاری کتاب سے ہی رہنمائی لیتے ہیں۔ کبھی وہ اسے پڑھ کر تم پر حملہ آور ہونے کا راستہ تلاشتے ہیں اور شیعہ سنی، وہابی، دیوبندی اور بریلوی بن کر تمہیں تمہارے ہی ہاتھوں قتل کرواتے ہیں اور کبھی اپنے لئے اچھائی اور بھلائی کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔

میں کہنا چاہتی ہوں کہ اپنے دین اور عقیدے میں الجھاؤ پیدا نہ کرو اور اپنے ہی نبی ﷺ کی ذات کو موضوع بحث نہ بناؤ۔ علم غیب کے جاننے کی تصدیق خود علم غیب والے نے ہی کر دی کہ وہ اپنے نبیوں میں سے جسے چاہتا ہے علم دیتا ہے۔ اللہ نے کسی نبی یا رسول کا نام لیکر نہیں کہا کہ فلاں نبی کو اس علم کی نعمت سے نوازا گیا۔ ہر مسلمان کا یقین ہونا چاہئے کہ اللہ نے جس علم کا ذکر قرآن میں کیا ہے اس علم سے صاحب قرآن کو بھی نوازا ہوگا۔ علم غیب خدائی ٹاپ سکرٹ ہے اس لئے اس پر فضول بحث سے بچو اور اپنے نبی ﷺ کی عظمتوں کو پہچانو۔

میں نے بہت سے علماء سے سنا ہے کہ مرنے کے بعد ہر انسان کو عالم برزخ میں نبی ﷺ کا چہرہ مبارک دکھایا جائے گا اور فرشتہ پوچھے گا کہ یہ ہستی کون ہیں۔ وہ جن پر اللہ کا کرم ہوگا اور زندگی میں حب رسول ﷺ سے سرشار ہونگے وہ آپ ﷺ کو پہچان لینگے اور گواہی دینگے کہ یہ اللہ کے آخری رسول ﷺ ہیں اور میں ان کی رسالت و نبوت پر ایمان رکھتا ہوں۔ وہ جو منکر رسول ﷺ ہونگے اور جن کے دل حب رسول ﷺ سے خالی ہونگے آپ ﷺ کو پہچاننے سے عاجز

ہونگے۔

شاہد اسی لمحے کے خوف کی وجہ سے اللہ کے برگزیدہ بندے بھی لرزاں تھے اور عاجزی سے کہتے تھے کہ یارسول اللہ ﷺ اگر ہم اپنی کوتائیوں اور غفلتوں کے اندھیروں کی وجہ سے آپ ﷺ کو نہ پہچان سکے تو آپ ﷺ ہی اپنے گنہگار امتیوں کو پہچان لینا۔اسی طرح درود پاک کی فضیلتوں کی وجہ سے علماً کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ کی حدیث ہے کہ جو کوئی مجھ پر دورد پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچتا ہے۔ میں نے اہل حدیث علماً سے پوچھا تو ان کا بھی کہنا تھا کہ جو درود پاک روضہ رسول ﷺ پر پڑھا جائے وہ آپ ﷺ خود سنتے ہیں اور جو باہر سے یا دنیا کے کسی بھی کونے سے پڑھا جائے وہ فرشتے آپ ﷺ تک پہنچاتے ہیں۔

میں نے غیر مسلم محققین سے بات کی تو ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی ہستی قبر کے باہر پڑھے جانے والے درود کو سن سکتی ہے تو وہ یہی درود لاکھوں میل دور سے بھی سننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات سے ثابت ہے کہ فضا میں موجود قدرت کے برقی نظام جسے الیکٹرانک ویوز کہا جاتا ہے ہر آواز کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں اور یہ آوازیں برقی لہروں میں ارتعاش پیدا ہونے سے برق رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر، سٹیلائٹ، راڈار، ٹیلیویژن اور ٹیلیفون کا نظام اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے کہ زمین کی تہوں سے لے کر فضاؤں تک ہر چیز ہی حاضر و ناظر ہے تو وہ خالق و مالک جس نے یہ سب کچھ پہلے سے بنا کر رکھا ہوا ہے اور جسے انسان اپنے ظاہری مادی علم سے کھوج کر مصرف میں لا رہا ہے کیا کچھ اور نہیں بتایا ہوگا جس کا علم انسانی عقل کے دائرے سے باہر ہے۔

دوسرے مذاہب کے عالم اور سائنسدان سائینسی علوم کی روشنی میں متشابہات کی کھوج لکھا رہے ہیں اور اللہ ان منکرین کے ذریعے اپنے کلام کی سچائی انسان پر ظاہر کر رہا ہے۔فرعون کی لاش سے لیکر شہر ارم کے آثار اور نوحؑ کی کشتی کا سراغ ان منکرین نے ہی لگایا جس کا ذکر قرآن میں کچھ اس طرح ہوا۔

وہ اللہ ہے جس نے یہ کتاب (قرآن) تم پر نازل کی اس میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہات اور جن کے دلوں میں فتور ہے وہ فتنے کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہر وقت متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کا علم صرف اللہ کو ہے۔لیکن جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہمارا

(متشابہات) ان پر ایمان ہے یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے اور عقلمند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

سائنسی تحقیقات تو اس بات کا کھوج بھی لگا رہی ہے کہ اگر آواز ارتعاش کی بنا پر ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ سکتی ہے اور ساتھ ہی بولنے والے کی تصویر کا مشاہدہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ایک شخص کنیڈا کے کسی کونے میں بیٹھا انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے مختلف مقامات پر بیٹھے لوگوں سے بیک وقت بات بھی کرتا ہے انہیں دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے تو کائنات میں ایسی لہریں بھی ضرور ہونگی جو انسان کو ان واحد میں بحفاظت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیں۔اس امر کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے کہ اگر میں (اللہ) چاہوں تو تمہیں کسی دوسری دنیا میں بھجوا دوں اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آؤں تو تم کیا کرسکتے ہو۔

سائنسدانوں نے اس کا بنیادی نقطہ بھی معراج النبیﷺ سے ہی آٹھایا ہے کہ کس طرح ربّ اپنے بندےﷺ کو ایک ہی رات کے کچھ حصے میں مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک اور پھر سدرۃ المنتہیٰ اور قاب وقوسین تک لے گیا۔کیا کوئی تصور میں بھی لاسکتا ہے کہ صدیوں پر محیط یہ سفر چند سکینڈوں یا اس سے بھی کم لمحے میں کیسے طے ہوا۔ظاہر ہے کہ اس پر بحث کرکے اپنی طرف سے تاویلات نکالنا سوائے خبط کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔قرآن ہی میں اللہ نے حضرت الیاسؑ کا واقع بیان کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک زمان ومکان کی کچھ حیثیت نہیں۔دن اور رات کا ظہور اور فاصلوں کی منازل ربّ کی عظمت کی نشانیاں اور انسانوں کی سہولیات کے لئے ہیں ۔اس کی ایک اور مثال حضرت سلیمانؑ کا ہواؤں پر تیرتا تخت تھا جو ایک ماہ کی مسافت ایک دن میں طے کرتا تھا۔

بجائے اس کے کہ مسلمان اللہ کے احکامات پر سرتسلیم خم کریں انہوں نے معراج النبیﷺ کو بھی نہیں بخشا اور اسے نبیﷺ کے خواب سے تعبیر کیا ہے جبکہ مستشرقین نے اپنے سائنسی علم کی روشنی میں اسے ایک فزیکل جرنی یعنی حقیقی اور جسمانی سفر مان لیا ہے اور اس پر مزید کھوج بھی جاری ہے۔

قرآن میں ذکر ہے کہ زمین نرو مادہ کے جوڑے اگاتی ہے۔آج ماہرین نباتات نے سائنسی تحقیق سے بھی یہی جانا کہ جو کچھ زمین پر موجود ہے اور زمین سے پیدا ہوتا ہے وہ نرو مادہ

کی شکل میں ہی ہوتا ہے۔

اس سے قبل کہ میں سائنسی تحقیقات پر کچھ مزید کہوں میں واپس اپنی بات پر آتی ہوں کہ اللہ کے نبی ﷺ نور تھے یا بشر اس موضوع کو بنیاد بنا کر اور ہر جمعے کے خطبے سے پہلے اپنے ہم مسلکوں کو یہ باور کرانا کہ دیکھو بھول نہ جانا حضور ﷺ بشر تھے کوئی احسن بات نہیں۔ میں نے بیشمار مساجد کے امامین کو یہ کہتے سنا ہے تا کہ لوگ بھول نہ جائیں اور مسلک کے اسباق سے جڑے رہیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک مصری سکالر سے بات کی جن کا کہنا تھا کہ نور و بشر، حاضر و ناظر، علم غیب، ولی، ولائت اور معراج نبی ﷺ جیسے موضوعات میں الجھ کر امت مسلمہ اپنے حقیقی مشن سے ہٹ کر مغلوب، محکوم اور معذور ہوگئی ہے۔ اللہ نے قرآن کے ذریعے ہمیں بتایا کہ اللہ انسانوں ہی میں سے نبی اور رسول مبعوث کرتا ہے مگر یہ لوگ اللہ کی مخصوص اور برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کا موازنہ عام انسانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی خلیل اللہ ہے تو کوئی کلیم اللہ، کوئی روح اللہ ہے تو کوئی ذبیح اللہ اور سب سے آخر آنے والی ہستی کی صفات ہی بیان سے باہر ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ تحقیق اللہ اور فرشتے اس کی رحمت بھیجتے ہیں اوپر نبی ﷺ کے، اے ایمان والو درود بھیجو اوپر ان کے اور سلام بھیجو بہت سلام۔ آپ ﷺ کو رحمت العالمین کے لقب سے نوازا گیا جو آپ ﷺ کی عظمت و بزرگی کی ایسی شان ہے جو کسی اور پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اللہ کے نبی اور رسول ایسی بزرگ و برتر ہستیاں ہیں جو مخلوق تو ہیں مگر دیگر مخلوق کی طرح نہیں۔ اللہ نے انہیں انسانوں ہی کی طرح پیدا کیا مگر ان کے درجات اور صفات کو کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا چونکہ ان کی پیدائش کا مقصد دیگر انسانوں کی رہنمائی ہے۔

مصری سکالر نے کہا کہ ہمیں صرف اس بات پر سر تسلیم خم کر لینا چاہئے کہ آپ ﷺ ساری کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ اللہ ساری مخلوق کا خالق ہے تو آپ ﷺ ساری مخلوق کے لئے باعث رحمت ہیں۔ اگر کوئی عقیدت اور احترام کی اس حد تک جاتا ہے کہ آپ ﷺ کو نور کہتا ہے تو یہ اس کا ظرف اور اپنے نبی ﷺ سے پیار ہے۔ اگر کوئی سائینسی اصول کے تحت معراج النبی ﷺ کے مشائدے اور روشنی میں آپ ﷺ کو نور کہتا ہے تو یہ اس کا روحانی تجربہ اور مشائدہ حقیقی ہے جس کا ادراک بے نور دل اور آنکھیں نہیں کر سکتیں۔

میں حضور ﷺ کی شان اور رحمت العالمین کی عظمت کو دلورام کے اس شعر کے ساتھ اختتام پذیر کرتی ہوں چونکہ یہ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ آپ ﷺ کے مقام و مرتبے پر بحث

کرے۔ وہ لوگ جو آپ ﷺ کی ذات مبارکہ پر طرح طرح کے حرف اٹھاتے ہیں آج دنیا میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہیں۔ سندھ میں محمد بن قاسم آیا اور چلا گیا۔ سندھ فتح تو ہوا مگر مسلمان نہ ہوا۔ عبداللہ شاہ غازی آئے اور سندھ کے ہوگئے اور سارے سندھ میں اسلام کی شمع روشن ہوگئی۔ اسی طرح میدان عرفات سے لے کر ہمالیہ کی چوٹیوں اور ان کے پیچھے چھپی تہذیبوں تک اسلام کی کرنیں پھیل گئیں اور ظلمت کے اندھیرے اجالوں میں بدل گئے۔ دین کی شمع اٹھانے والے یہ وہ مشعل بردار بوریا نشین اور خرقہ پوش تھے جنہیں حضور ﷺ نے آخری حج کے عظیم خطبے کے بعد دنیا میں پھیل جانے اور ان تک دین کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا۔ جنہیں آپ ﷺ کی زندگی میں پیغام حق سننے کا موقع نہ ملا۔

اسلام کے یہ مشعل بردار آپ ﷺ کے اصحاب اور اللہ کے ولیؒ تھے جن کی زندگیاں عشق حقیقی سے لبریز تھیں۔ یہ وہ ہستیاں اور ان کی اولادیں تھیں جنہوں نے بدر کے میدان میں یک جان و زبان ہو کر آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت لی اور کہا! اے اللہ کے نبی ﷺ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو اپنے پیغمبروں کو یہ کہہ کر چھوڑ جاتے تھے کہ اپنے اللہ سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ خود لڑے۔ اگر اللہ واقعی قوت والا ہے تو پھر ہمیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے اللہ سے کہو کہ وہ دشمنوں کا خاتمہ کردے۔ یا رسول اللہ ﷺ ہم اللہ کے حکم پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے آئے ہیں۔ ہم آپ ﷺ کی قیادت اور رہنمائی میں لڑتے ہوئے شہید ہونگے یا پھر اللہ کی مدد و نصرت سے فتح یاب ہونگے مگر آپ ﷺ کو تنہا نہیں چھوڑینگے۔

یہی وہ منظر ہے جسے اقبالؒ نے اپنے اس شعر کی نذر کیا کہ اگر بدر جیسا ماحول پیدا ہو جائے تو پھر قطار اندر قطار فرشتے بھی اترتے ہیں اور حق غالب آجاتا ہے۔

آج دنیا میں جہاں جہاں اسلام ہے وہ ان ہی ہستیوں کی شیریں زبان اور اعلیٰ کردار کی مرہون منت ہے۔ ان کے ساتھ نہ زر و جواہر کے لدے اونٹ اور نہ ہی ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار فوجیں تھیں۔ یہ لوگ اپنے سینوں میں قرآن کا نور بھر کر لائے اور جدھر رخ کیا خدا کی زمین نور ایمان سے منور ہوگئی۔

ایسے ولیؒ اور عالم حق ہر پیغمبر کے دور میں ہوئے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ایک شخص تھا جن کا نام علماً نے آصف لکھا ہے۔ قرآن میں ذکر ہے کہ پھر وہ شخص بولا جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ اے نبیؑ میں پلک جھپکتے ملکہ سبا کو تخت

سمیت تیری خدمت میں حاضر کردونگا۔ یہ شخص ظاہر ہے پیغمبر نہیں تھا بلکہ حضرت سلیمانؑ کا امتی اور ولی اللہ تھا جسے کے پاس کتاب (زبور) کا علم تھا۔

ایسے ہی آپ ﷺ کے اصحاب جن کے سینے نورحق سے روشن تھے جب آپ ﷺ کے حکم سے کتاب کا علم لے کے نکلے تو دنیا کے کونے کونے تک علم کی روشنی پھیل گئی۔ آج بھی مبلغین کی جماعتیں نکلتی ہیں جن کے پروموٹر اور فنانسر بھی ہوتے ہیں مگر وہ اپنے فرقے اور مسلک کی تبلیغ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا روشنی سے محروم ہوکر اندھیروں میں گم ہورہی ہے۔ علم کی روشنی سے نہ دل منور ہو رہے ہیں اور نہ ہی دماغ معطر۔ فتنے اور فساد کو جہاد کہہ کر جہاد کی روح کو مجروع اور مقصد کو پائیمال کیا جارہا ہے۔ 9/11 اور 7/7 کی گھتیاں شائد کبھی نہ سلجھیں مگر پاکستان میں کوئی کونہ ایسا نہیں جہاں اس جہاد کے حقیقت عیاں نہ ہو۔ پاکستانی طالبان اور پنجابی طالبان کی تخلیق اور تربیت کون کرتا ہے۔ سب جانتے ہیں مگر بولنے پر پابندی ہے۔

9/11 اور 7/7 کے بعد جہاد کا فوکس پاکستان بنا۔ ایک طرف ڈومور کا حکم ہے تو دوسری طرف ڈاؤن ود ڈرون کی مشق جاری ہے۔ فرقہ واریت کو جہاد کا نام دیا گیا ہے اور پاکستان کو ان جہادیوں کی جنت قرار دیا گیا ہے۔ مزاروں اور قبروں کو دھماکوں سے اڑانے کی کاروائیوں پر بعض دینی اور سیاسی حلقے رسمی تنقید اور مذمت تو کرتے ہیں مگر اندر سے خوش ہیں کہ بدعت کے مراکز مٹ رہے ہیں۔ آج کل پاکستان پر چاروں اطراف سے حملے ہورہے ہیں مگر بچاؤ کرنے والے نیم خوابیدہ ہیں۔ ہمارے عرب دوست اور بھائی ہمیں بدعت سے پاک کرنا چاہتے ہیں تو ایرانی اپنے نظریات کے تحفظ میں کوشاں ہیں۔ افغانی رہتے اور کھاتے پاکستان سے ہیں اور بدلے میں بھارت اور امریکی کی حمایت میں پاکستان کو ہی برا بھلا کہتے ہیں۔ بھارت پاکستان کا پانی بند کر کے اسے صحرا میں بدلنے کی کوشش میں ہے اور اے این پی کالا باغ ڈیم کی تعمیر کو پاکستان کی سلامتی سے مشروط کئے ہوئے ہے۔ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ کالا باغ ڈیم جیسے منصوبے کی عدم تکمیل کی صورت میں اس ملک کا کیا حشر ہوگا اور جو تھوڑا بہت پانی بھارت اپنی مرضی سے چھوڑے گا وہ سمندر میں چلا جائے گا۔

دیکھا جائے تو پاکستان کو بنجر بنانے کے منصوبے میں بھارت، اے این پی اور دیگر قوم پرست برابر کے شریک ہیں۔ نواز لیگ مصلحت کا شکار ہے اور ق لیگ پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر قوم پرستوں کے ایجنڈے کا حصہ بن چکی ہے۔ عدلیہ الجھاؤ اور حکومتی حکم عدولی کا شکار ہے جبکہ

فوج این آر او کی حفاظت اور جمہوریت کی علمبرداری کا فیصلہ کر چکی ہے۔

جہاں تک قیادت کا سوال ہے تو اس کے ضمن میں ایک مشہور کہاوت ہے کہ ہرنوں کی فوج جس کی قیادت ایک شیر کر رہا ہو ایسی فوج سے بہتر ہے جو شیروں پر مشتمل ہو مگر قیادت ہرن کے ہاتھ ہو۔ ایسے ہی ایک کہاوت ہے کہ ہر گاؤں میں ایک بدھو ہوتا ہے جو کہ ایک اچھی بات ہے چونکہ اگر سارے بدھو ایک ہی گاؤں میں آ جائیں تو گاؤں کا حشر ونشر ہو جائے۔ ایک بدھو گاؤں کے لئے قابل برداشت ہوتا ہے اور بدھوؤں کا گاؤں سارے شہر کے لئے باعث زوال بنتا ہے۔ ایسے ہی ہر گاؤں کے لئے ایک ہی عقلمند کافی ہوتا ہے۔ زیادہ عقلمند بھی زوال کا باعث بنتے ہیں۔ عرب کی ایک کہاوت ہے کہ صحرا میں اونٹ ایک جیسی رفتار سے ایک ہی لائن میں چلتے ہیں چونکہ ان کی نکیل ایک دوسرے کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور سب سے اگلے اونٹ پر ایک حدی خواں بیٹھا گیت گاتا ہے جس کی لے اور ردم پر اونٹ ایک ہی رفتار سے چلتے ہیں۔ ایک دن کسی عقلمند نے دیکھا کہ ایک قافلہ جا رہا ہے مگر اونٹ بے ترتیبی سے چل رہے ہیں۔ کبھی کوئی اونٹ رک جاتا ہے اور اگلا اونٹ اسے کھینچتا ہے۔ کبھی قطار ٹوٹ جاتی ہے اور پچھلا اونٹ اگلے سے جا ٹکراتا ہے۔ عقلمند پریشان ہوا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا سب سے اگلے اونٹ تک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ سب سے اگلے اونٹ کی نکیل ایک گدھے کی دم سے بندی ہے اور حدی خوان کی جگہ ایک کمہار گدھے پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ عقلمند نے اونٹ کو گدھے کی دم سے آزاد کیا تو اونٹوں کی رفتار درست ہو گئی اور قطار بھی سیدھی ہو گئی۔

کسی نے پوچھا کہ اے عقلمند تو نے اونٹوں کو گدھے کی قیادت سے تو آزاد کر دیا مگر یہ قافلہ بغیر حدی خوان اور گائیڈ کے منزل تک کیسے پہنچے گا۔ عقلمند نے کہا کہ گدھے اور کمہار کی قیادت سے اونٹ کی قیادت بہتر ہے۔ اونٹ عقلمند، بردبار، ذہین اور مستقل مزاج جانور ہے۔ وہ جس منزل کو ایک بار دیکھ لے اسے بھولتا نہیں۔ اگلا اونٹ قافلے کو منزل پر لے جائیگا فکر کی بات نہیں۔

آج کل پاکستان کا بھی یہی حال ہے۔ کئی گدھے قیادت کے لئے میدان میں اترے ہوئے ہیں اور کئی بدھوؤں میں قیادت کا مقابلہ ہے۔ خودساختہ عقلمندوں اور خوش فہم دانشوروں کی بھی کمی نہیں۔ مغرب نواز، بھارت نواز اور امریکہ نواز دانشوروں کا ملک میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ خوش فہمی اور دانشوری کے میدان میں سابق فوجی بھی کسی سے کم نہیں اور شوخ و شٹرنگ اینکروں

کی ہاں میں ہاں ملا کر دانشوری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے امریکی ویزوں اور بیرون ملک اثاثوں کو محفوظ بنا رہے ہیں۔

تم نے عائشہ صدیقہ کی ''ملٹری انک'' پڑھی ہے؟ نینا نے پوچھا۔

ہاں پڑھی ہے اور عائشہ سے ملا بھی ہوں۔ کیوں؟ میں نے پوچھا۔

اس کتاب کی تیاری میں عائشہ کا ساتھ دینے والے سبھی حضرات فوجی ہیں جن کی ذہانت اور عقلمندی کا معیار کتاب کے مطالعے سے جج کیا جاسکتا ہے۔ نینا نے بددلی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا جیسے اس نے کھٹا آم چوس لیا ہو۔

پھر کہنے لگی۔ اس کتاب میں بھارت، امریکہ اور دنیا کے دیگر ممالک کی افواج کے ویلفیئر پراجیکٹ کی تفصیل کے بعد فوجی فاؤنڈیشن، سی ایس ڈی اور دیگر ویلفیئر پراجیکٹ کا ذکر اور موازنہ ہے جس میں نفع، نقصان، کاروباری حجم، کرپشن اور دیگر پیچیدگیوں کا ذکر ہے جو کہ ایک روٹین کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں من پسند لوگوں کو تعینات کیا جائے وہاں نفع ونقصان اور کرپشن ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر فوج کی زیرنگرانی چلنے والے اداروں میں یہ بات نہ چھپ سکتی ہے اور نہ ہی زیادہ دیر چل سکتی ہے۔ جنرل طلعت مسعود اور ان کے ہمنوا افسروں کی جرنیلی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جن اداروں کے سربراہ رہے ان ہی کی دھوتی کھینچنے سے بھی نہیں ہچکچائے۔ جہاں تک تجزیے اور موازنے کا تعلق ہے تو ایسی کتاب سی ایس ڈی کا کوئی منیجر یا پھر سی او ڈی، سپلائی ڈپو، فوجی فاؤنڈیشن، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی یا آرمی ہاؤسنگ سکیم کا ہیڈ کلرک بھی لکھ سکتا ہے چونکہ جن سمریوں اور اعداد وشمار کو اس تجزیہ نگاری اور موازنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے یہ ان ہی حضرات کے پاس ہوتی ہیں۔ کتاب کا موضوع اس بات پر فوکس ہے کہ فوجی ادارے کرپشن کے مراکز ہیں اور ہر طرف نیپوٹزم اور لاقانونیت کا ہنگامہ ہے۔ اس کتاب کا مقصد سویلین کرپشن بمقابلہ ملٹری کرپشن ہے تاکہ دنیا کو بتایا جائے کہ سیاستدان اور سول بیوروکریٹ ہی نہیں بلکہ فوج بھی کرپٹ ہے۔

دیکھو میں فوج کی وکالت نہیں کررہی اور نہ ہی اس بات سے اتفاق ہے کہ فوج کے اداروں میں کرپشن نہیں مگر جن اداروں کا ذکر عائشہ صدیقہ نے کیا ہے وہ ذیلی اور ویلفیئر کے ادارے ہیں۔ ان اداروں کا فوج کی کارکردگی پر براہ راست اثر نہیں۔ اس کے مقابلے میں جو لوٹ مار پٹواری سے سیکرٹری اور یونین کونسل سے ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس تک ہوتی ہے اس کا اثر

براہ راست ملک اور قوم پر ہوتا ہے چونکہ یہ لوگ ملکی خزانہ لوٹتے ہیں اور دولت ڈنکے کی چوٹ پر بیرون ملک منتقل کر دیتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ تم انیکروں کے متعلق کچھ پوچھو اور میں جواب دیتے دیتے کئی اور نکل جاؤں اور میرے لئے واپسی مشکل ہو جائے تم سے کہونگی کہ کمپیوٹر پر آل مائیٹی نامی کتاب ڈھونڈ کر پڑھ لو تو تمہیں کافی ساری باتیں سمجھ میں آجائیں گی۔ شائد حالات، واقعات اور طریقہ واردات میں کچھ تبدیلیاں ہوں مگر کہانیاں، تبصرے، تجزیے اور مائنڈ سیٹ وہی ہے جس کی بنیاد اغیار کی خوشنودی، ذاتی مفادات، تشہیر اور ذہنی خلفشار ہے۔

تم دلورام کی بات کر رہی تھی۔ میں نے نینا کو یاد دلایا۔

ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ آپ ﷺ کی شان کا بیان کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ سمجھ کی بات ہے مگر جس پر ربّ کی عنایت ہو وہی سمجھتا ہے۔ دلورام پر بھی ربّ کی عنایت ہوئی اور اس نے رحمت اللعالمین کا راز پالیا۔ دلورام نے ان الفاظ میں اس راز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رحمت اللعالمین کے حشر کو معنی کھلے خلق ساری شافعی روز جزا کے ساتھ ہے
لیکے دلورام کو جنت میں جب حضرت گئے غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے

ذرا تصور کرو کہ میدان حشر میں جب دلورام جیسے عاشق رسول ﷺ کے ساتھ جنت کی طرف جا رہے ہونگے تو مسجدوں میں بیٹھ کر آپ ﷺ کی شان پر تنقید کرنے والے آپ ﷺ کا سامنا کیسے کرینگے۔

میں یہ یہی پر ختم کرتی ہوں اور تم سے گزارش کرتی ہوں کہ اس پر مزید کچھ نہ پوچھنا۔ میں جانے سے پہلے اپنے وطن کے متعلق صرف یہی کہونگی کہ پاکستان نعمت خداوندی ہے اور یہ نعمت ناشکروں کے ہاتھ ہے۔ جس کارواں کا کوئی حدی خواں نہ ہو اور ڈور گدھے کی دم سے بندھی ہوئی ہو وہ صحرا میں بھٹک کر فناہ ہو جاتا ہے۔ آج پاکستان کی یہی حالت ہے۔ ہمارے پاس شیروں کی فوج تو ہے مگر قیادت امریکی ہرنوں کے ہاتھ ہے۔ ہمارے شہروں اور گاؤں میں عقلمندوں اور بدھوؤں کی بہتات ہے اور دونوں میں مفاہمت ہے کہ عوام کو ہر حال میں رعایا بنا کر رکھا جائے۔ عقلمندوں کے پاس امریکی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں اور لوٹ کھسوٹ کے تجربے ہیں اور بدھوؤں کے پاس دولت کے انبار اور جعلی ڈگریاں ہیں۔ عقلمند بدھوؤں کی رہنمائی کرتے

ہیں اور جمہوریت کے نام پر انہیں حکمران بنا کر ملک لوٹتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ کوئی سچا حدی خوان آئے اور قافلے کا رخ منزل کی طرف موڑ دے۔کوئی شتر سوار آئے اور گدھے کی دم سے کارواں کی نکیل کھول دے۔

تمہار کیا خیال ہے کوئی آئے گا؟ میں نے پوچھا۔

ضرور آئے گا۔سچا ربّ سب دیکھ رہا ہے۔ نینا نے کہا۔

ہرنائی والے استاد جمعہ خان نے ایک بولتی تحریر لکھی تھی جو میں نے سنی ہے۔نینا نے کہا۔

بولتی تحریر۔ میں نے پوچھا۔

ہاں بولتی تحر۔ میں کہہ چکی ہوں کہ سچے حرف بولتے ہیں۔اور جھوٹے پڑھے جاتے ہیں او ربکتے ہیں۔نینا نے جواب دیا۔

پھر کہنے لگی۔

دیکھو سچے حرف بولتے ہیں جیسے الہامی کتابوں میں لکھے حرف، آیتیں، سورتیں اور سپارے سننے والے کے دل اور دماغ پر اثر کرتے ہیں اور پڑھنے والے کی روح میں سما جاتے ہیں۔جیسے عارفانہ کلام کے حرف، شعر، سطریں اور ورق بھی بولتے ہیں۔مگر کمرشل حرفوں پر مشتمل کتابیں بے زبان اور گونگی ہوتی ہیں اور صرف بکتی ہیں۔پاکستان میں چالیس سالہ شاعر کی چالیس کتابیں بازار میں موجود ہیں اور بک رہی ہیں چونکہ پبلشر کو کتاب بیچنے کا ہنر آتا ہے۔سیکرٹریوں، جرنیلوں اور کچھ کاروباری مصنفوں کا بھی یہی حال ہے۔ان کی کتابیں بھی ہزاروں کے حساب سے چھپتیں اور بکتیں ہیں اور الماریوں میں سجتی ہیں مگر بولتی نہیں بس بکتی رہتی ہیں۔کتاب اور ماڈل میں فرق نہیں رہا۔اچھی اور نخریلی ماڈل کی مارکیٹ بھی اچھی ہوتی ہے اور آمدنی بھی۔ وہ دن میں دس دس بار بکتی ہیں۔ وہ عورت تو ہوتی ہے مگر کمرشل ہوجاتی ہے اس میں شرم وحیا باقی نہیں رہتی۔ ماڈلیں اور فنکارائیں ہر لباس پہن لیتی ہیں جیسے کمرشل کتاب کی جیکٹ۔تم کسی حسین لڑکی کی تصویر کتاب کی کاٹھی پر لگا دو تو کبھی نہیں بکے گی۔ اگر کاٹھی پر چغتائی، گل جی، حنیف رامے یا کسی ولائتی یا بھارتی مصور کا نیم برہنہ برش یا پنسل ورک لگا ہو تو کتاب دس روپے کی اور کاٹھی سمیت پندرہ سو دس کی ہوجاتی ہے اور خوب بکتی ہے اور الماری میں سجتی ہے۔

پڑھی نہیں جاتی۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔

اکثر پیش لفظ وغیرہ پڑھے جاتے ہیں۔ نینا نے کہا۔ پھر کہنے لگی۔

اگر پیش لفظ کسی مشہور شخصیت اور اچھے کمرشل رائیٹر یا شاعر وغیرہ نے لکھا ہو تو کتاب کی نہ صرف اہمیت بڑھ جاتی ہے بلکہ بکری میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کتاب اور ماڈل گرل کی حیثیت اب ایک جیسی ہے۔ کتاب میں کیا لکھا ہے اس کی اہمیت نہیں ہوتی چونکہ سب کو پتہ ہوتا ہے کہ مصنف کون ہے اور اس کا رجحان، میلان اور کردار کیسا ہے۔ وہ کس سکول آف تھاٹ سے تعلق رکھتا ہے اور کسی قسم کے خیالات کا پرچار کرتا ہے۔ کتاب کی کمرشل ویلیو کے لیے ضروری ہے کہ کسی اچھے پبلشر کی ایک بار قدم بوسی کی جائے اور پھر اسی کے در پر ڈیرے ڈال دیئے جائیں۔ پبلشر کے بعد سرورق اور پھر پیش لفظ بھی کتاب کی کمرشل ویلیو میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اس کی بکری سے ہوتی ہے پڑھنے سے نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کا پہلا ایڈیشن تو سرکاری لائبریریوں، دفتروں اور اداروں میں ہی کھپ جاتا ہے چونکہ سکولوں، کالجوں، دفتروں اور کچھ اداروں اور سرکاری محکموں کے پاس لاکھوں روپے کا فنڈ ہوتا ہے اور یہ فنڈ بڑے شاعروں اور ادیبوں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے لئے رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو پہلے دو تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں اور شاعر اور مصنف کے لئے عمرہ، حج اور پھر امریکہ کی سیر کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ یہی حال ماڈل کا ہوتا ہے۔ وہ دن میں کئی بار نیم برہنہ ہوتی ہے اور کبھی اس سے بھی آگے ہو آتی ہے۔ گھر سے جو کپڑے پہن کر آتی ہے انہیں اتار کر دن میں کئی کئی لباس زیب تن کرتی ہے مگر جن کپڑوں میں گھر سے آتی ہے انہی میں لوٹ جاتی ہے۔ وہ کئی طرح کے پروڈکٹ بیچنے کا باعث بنتی ہے اور خود بھی پروڈکٹ بن جاتی ہے۔ ماڈلوں اور اداکاراؤں کو بھی کسی بڑی اشتہاری کمپنی، پروڈیوسر اور فنانسر کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ بے جان جسموں کو مصنوعی زبان دیکر اشتہاروں میں سجایا جائے۔

سچے معنوں اور معصوم حسن کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔ استاد جمعہ خان کاکڑ کی تحریر سچے اور بولتے حرفوں پر مشتمل تھی مگر ایسی تحریروں کو کوئی پبلشر ہاتھ نہیں لگاتا اور نہ ہی اخبار والے اسے چھاپتے ہیں۔ کوئی بڑا اور کمرشل قلمکار اس کا دیباچہ اور پیش لفظ بھی نہیں لکھتا اور نہ ہی کوئی اسے پڑھتا ہے۔

وجہ۔ میں نے پوچھا۔

جمعہ خان نے سارے بلوچستان کا دورہ کیا۔ وہ جھالاوان اور ساراوان کی بستیوں اور کھیتوں میں گیا۔ اس نے ندی نالوں اور پہاڑی ڈھلوانوں کو دل کی آنکھ سے دیکھا اور پھر ایک تحریر لکھی

کہ بلوچستان کس طرح پاکستان کی خوشحالی کا باعث بن سکتا ہے۔اس نے لکھا کہ چھوٹے ڈیم کہاں بن سکتے ہیں اور کون سے علاقوں کو نخلستانوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔کونسے درخت اور کس علاقے میں لگائے جاسکتے ہیں۔ بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کے فارم بنانے کے لئے کونسے علاقے موزوں ہیں۔انگور، انار، بادام، سیب، خوبانی، شہتوت اور چیری کے باغات میں جدید طریقہ باغبانی سے کیسے اضافہ کیا جاسکتا ہے اور ان پھلوں سے کروڑوں روپے زرمبادلہ کیسے کمایا جاسکتا ہے۔ گندم، باجرے، چنے اور کپاس کے لئے بلوچستان کے کونسے علاقے موزوں ہیں۔آلو، پیاز، مونگ پھلی اور کالا زیرہ کس خطے میں ہر سال بمپر کراپ دے سکتا ہے۔ استاد نے لکھا کہ اگر بلوچستان کی زمین اور پانی کا دیانتداری سے استعمال کیا جائے تو زمین میں چھپے خزانوں کے علاوہ بھی بلوچستان میں خوشحالی آسکتی ہے اور اس سے پاکستان کی معیشت بھی مضبوط ہوسکتی ہے۔

استاد جمعہ خان نے سندھ، پنجاب، سرحد، قبائلی علاقوں، آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں کا چپہ چپہ دیکھا اور زمینی پیداوار کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور انہیں محفوظ کرنے کے طریقہ کار پر مفصل تحریر لکھی۔ کیا تم بتاسکتے ہو کہ کسی کمرشل شاعر، ادیب اور امریکہ پلٹ دانشور کو بلوچستان کی زمین کا علم ہے۔نینا نے پوچھا۔

میرا خیال ہے کہ نہیں۔

تمہارا خیال صحیح ہے۔نینا نے کہا اور پھر کہنے لگی۔

ہمارے زرعی ماہرین کو یہ بھی علم نہ ہوگا کہ قلات کے علاقوں میں بہترین کپاس ہوتی ہے۔ اتنی چمکیلی اور سفید کہ تازہ برف لگتی ہے۔ بلوچستان میں پیاز کی ایسی فصل ہوتی ہے کہ آدمی دیکھتا ہی رہے۔ اتنے بڑے سائز کا پیاز شائد ہی دنیا میں کہیں ہوتا ہو۔ ہرنائی، خوست، زیارت اور ملحقہ علاقوں میں چیری، سیب اور انار کی درجنوں اقسام پیدا ہوتی ہیں مگر جدید سہولیات کی کمی کے باعث اندرون ملک اور بیرون ملک منڈیوں تک پھل نہیں پہنچتا۔ ہمارے تاجر بھی اس سلسلے میں منفی رول ادا کرتے ہیں اور زیادہ تر پھل افغانستان سے آتا ہے۔ قلات اور کوئٹہ ڈویژن میں انگور کی بہتات ہے مگر پیداوار بڑھائی نہیں جاتی چونکہ پانی کی کمی حائل ہوتی ہے۔ چھوٹے ڈیموں کی صورت میں یہ کمی پوری ہوسکتی ہے مگر کسی کو اس کا خیال ہی نہیں۔

کوہلو اور ملحقہ علاقوں میں سیب، انار اور بادام پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ قلات اور مری کے علاقوں

میں زیرہ اور ایسی جڑی بوٹیوں کی بہتات ہے جس پر ریسرچ سے ادویات تیار ہو سکتی ہیں۔

سندھ اور پنجاب میں بنجر اور بیکار زمین کی کوئی حد نہیں۔ اب یہ زمینیں جو شہروں کے گرد و نواح میں ہیں فوجی جرنیلوں اور لینڈ مافیا کے قبضے میں آرہی ہیں۔ زیادہ تر رقبہ خالصہ سرکار اور شاملات دیہہ پر مشتمل ہے یا پھر جنگلات کا ہے۔ پاکستان میں ایسے قوانین موجود ہیں جو لینڈ مافیا اور صاحب اختیار لوگوں کے مددگار ہیں۔ شاملات کے قوانین تو ایسے ہونے چاہئے کہ جب تک علاقہ بھر کے لوگ متفق نہ ہوں کوئی اسے بیچنے یا خریدنے کا مجاز نہ ہو چونکہ شاملات دیہہ اور مقبوضہ مالکان محلے، گاؤں یا پھر کسی خاندان یا قبیلے کی ملکیت ہوتی ہے۔ موجودہ قانون کے مطابق گاؤں کی کوئی بھی شخصی قبضہ مافیا کی ایما پر محکمہ مال کی اجازت اور تقسیم کے فیصلے کے بغیر ہی اپنے حصے کی زمین بیچ دیتا ہے۔ چونکہ اس زمین کا کوئی تعین نہیں ہوتا اور نہ ہی مروجہ طریقہ کار کے تحت متعلقہ شخص کے حصے کی زمین باقاعدہ تقسیم کے دعوے کے تحت نشاندہی ہوتی ہے اس لئے قبضہ گروپ صرف پٹواری اور تحصیلدار کی طرف سے کی گئی جعلی کاروائی پر سینکڑوں کنال زمین کے عین درمیان میں قابض ہو جاتا ہے اور پھر حکومتی اہلکاروں کی مدد سے چاروں اطراف پھیل کر سارے علاقہ پر قابض ہو جاتا ہے۔ بحریہ ٹاؤن راولپنڈی اور اسلام آباد اس کی بدترین مثالیں ہیں جہاں قبضہ گروپ کی معاونت کے لئے ملک کے صدر اور وزرائے اعظم بھی میدان میں آئے اور کئی گاؤں اور دیہات اجڑ گئے۔ ملک اور حکومت کے سربراہان کے ساتھ مسلح افواج بھی شامل ہو گئیں اور بحریہ ٹاؤن جیسے قبضہ گروپ کے ساتھ مشترکہ پراجیکٹ شروع کر دیئے۔ شاملات کے علاوہ خالصہ سرکار اور جنگلات کی زمین بھی مشترکہ پراجیکٹ میں شامل ہو گئی اور ہر طرف بحریہ ٹاؤن کی ہمسائیگی میں جرنیل پورے آباد ہونے شروع ہو گے ہیں جہاں بحریہ ٹاؤن والے ہی جرنیلوں کے محل تعمیر کر رہے ہیں۔ بحریہ ٹاؤن کی صورت میں پاکستان کے اندر ایک نیا اسرائیل آباد ہے جہاں ملکی قوانین کا اطلاق نہیں۔ بستیاں محصور ہیں اور آئے دن بحریہ کے بلڈوزر کسی نہ کسی بستی کو مسجدوں، مزاروں اور قبرستانوں سمیت مسمار کر کے مکینوں کو دربدر کرتے ہیں مگر ان کی کسی عدالت میں شنوائی نہیں ہوتی۔ کہنے کو تو پاکستان میں ایک آزاد میڈیا بھی ہے مگر بحریہ ٹاؤن کا نام لینے کی کسی میں جرأت نہیں جسکی وجہ ایک نئے اور جدید پاکستانی اسرائیل میں ہر صحافی کا مفت پلاٹ یا گھر ہے۔ یہی حال پارلیمنٹ کے ممبروں، سیکریٹریوں اور ججوں کا ہے جنہیں پاکستانی اسرائیل میں مفت کے محل عنایت کئے گے ہیں۔ اگر اسی زمین کو گاؤں والوں

میں تقسیم کیا جاتا اور انہیں حکومتی امداد دیکر جدید فارم ہاؤس بنائے جاتے تو بڑے شہروں کے لئے دودھ، گوشت اور سبزیوں کے مسائل حل ہوجاتے اور شہروں کے قرب و جوار میں سرسبز ماحول کی وجہ سے آلودگی کم ہوتی اور موسموں کی شدت میں بھی کمی آتی۔

استاد جمعہ خان کاکڑ نے کشمیر اور شمالی علاقوں کے باب میں لکھا ہے کہ میرپور، بھمبر اور کوٹلی کے اضلاع میں جنگلی زیتون کی بہتات ہے اگر اسی زیتون پر پیوندکاری کی جائے اور ان تین اضلاع کے علاوہ جہلم، راولپنڈی، چکوال، میانوالی، ڈیرہ غازی خان اور نوشہرہ کے اضلاع میں زیتون کاشت کی جائے تو پاکستان یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی نسبت دوگنا زیادہ زیتون پیدا کرسکتا ہے اور اس زیتون سے ملک کے اندر ایک نئی صنعت متعارف ہوسکتی ہے۔ ایک کروڑ کے قریب لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے اور کروڑوں ڈالرز زرمبادلہ بھی کمایا جاسکتا ہے۔

گلگت، بلتستان، آزاد کشمیر کے ضلع باغ اور راولاکوٹ میں دنیا کا بہترین آلو اور لوبیا پیدا ہوتا ہے مگر اسے باقائدہ صنعت کا درجہ حاصل نہیں اور نہ ہی اس پر ریسرچ ہوئی ہے۔ اگر محکمہ زراعت کسانوں کی حوصلہ افزائی کرے انہیں اچھے بیج اور کھادیں مہیا کرے تو ان غذائی اجناس سے نہ صرف ملک کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے بلکہ دیگر ممالک تک بھی یہ فصل بھیجی اور بیچی جاسکتی ہے۔

شمالی علاقوں میں پیدا ہونے والی پھلوں میں شہتوت، سیب، اخروٹ، ناشپاتی اور خوبانی شامل ہے جس کا بڑا حصہ ضائع ہوجاتا ہے۔ شمالی علاقوں کے ویرانوں میں ان پھلوں کے جنگل اگائے جاسکتے ہیں۔ مگر ہماری حکومتوں اور حکمرانوں کو نہ اس کا شعور ہے اور نہ ہی اپنے ملک کے عوام کی مصیبتوں کا احساس۔ استاد جمعہ خان نے سارے پاکستان کی مٹی کی خاصیت کے مطابق وہاں پیدا ہونے والے پھلوں، سبزیوں اور فصلوں کا حساب لگایا اور ان کے انداز کے مطابق پاکستان کی مٹی اپنی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے بعد تین گنا پیداوار دوسرے ممالک کو بیچنے کے قابل ہے مگر اس کے عوام بے حس، حکمران نااہل اور بیوروکریسی کرپٹ ہے۔ جبر، ظلم، استحصال اور غنڈہ گردی کو قانونی تحفظ حاصل ہے اور جعل سازی کو جمہوریت تصور کیا جاتا ہے۔ جعلی جمہوریت ناکام ہوتی ہے تو عیش و عشرت سے مزین آمریت آتی ہے جسے جعلی جمہوری اور کرپٹ سیاستدانوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ گجرات کے چوہدری ایسی سیاست کے ماہر ہیں۔ یہ لوگ ہر آمر اور جابر کے ہراول دستے میں شامل ہوتے ہیں اور جمہوریت کے علمبردار

بھی ہیں۔ ان کا شمار پاکستان کی اشرافیہ میں ہے اور بیرون ملک بھی ان کے غم خواروں اور دوستوں، یاروں کی کمی نہیں۔ آصف زرداری اور دیگر سیاستدانوں کا بھی یہی حال ہے مگر عوام میں مقبول ہیں۔ جس ملک کے عوام کی شعوری کیفیت ایسی ہو وہاں استاد جمعہ جیسے لوگوں کے خیالات کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ پاکستانی پبلشرز کو سکینڈل، سکس، چربے اور چاپلوسیاں چھاپنے سے دولت اور شہرت ملتی ہے اور ایسا مواد منوں اور ٹنوں کے حساب سے پاکستانی معاشرے میں موجود ہے۔ بڑے بڑے لکھاڑی منافقت کے کھلاڑی ہیں۔ وہ جو کل تک افتخار احمد چوہدری کے گیت گاتے تھے آج زرداری اور گیلانی کا کھاتے اور خوب ناچتے اور گاتے ہیں۔

لوگ انڈیا سے آیا ہوا جھٹکے والا اور مرے ہوئے جانوروں کا گوشت کھا لیتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اپنے ملک میں سستا، حلال اور صحت مند گوشت بھی دستیاب ہوسکتا ہے۔ آلو، پیاز، ٹماٹر بھی بھارت سے آتا ہے مگر کسی کو خبر ہی نہیں کہ شمالی علاقوں اور بلوچستان میں اس کی بہتات ہے۔ پاکستان میں اب اچھا پھل صرف ایوان صدر، وزیراعظم ہاؤس اور پارلیمنٹ لاجز میں ہی کھایا جاتا ہے۔ اگر کشمیر، شمالی علاقوں، سرحد اور بلوچستان میں پھلوں کی پیداوار بڑھائی جائے اور دستیاب سٹاک کو منڈیوں تک رسائی مل جائے تو عام آدمی کو بھی اچھا اور سستا پھل مل سکتا ہے۔

استاد جمعہ خان نے درہ آدم خیل، کرک، لکی مروت، ڈنڈوت، کٹھ سگرال، منارہ سمیت بلوچستان میں ایک سو بارہ مقام کی نشاندہی کی جہاں کوئلے سے چلنے والے چھوٹے اور درمیانے پلانٹ لگا کر سستی بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر حکومت چاہئے تو پرائیویٹ سیکٹر کی مدد سے سستی بجلی پیدا کر کے اس بحران سے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا حاصل کرسکتی ہے اور ملک میں صنعتی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ استاد جمعہ خان کاکڑ کے مطابق بلوچستان میں دوسو مقامات پر بارشوں اور برفوں کے پانی کو روک کر وافر مقدار میں پانی ذخیرہ کیا جاسکتا ہے جس سے بلوچستان کو سرسبز اور پیداوار کے لحاظ سے خود کفیل کیا جاسکتا ہے مگر ایسے منصوبوں کے مکمل ہونے سے کمیشن مافیا اور لوٹا مارکہ سیاسی مافیا اور بیوروکریسی کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ رینٹل پاور پراجیکٹ، بھارت سے بزنس اور آسٹریلیا سے فنگس لگی گندم جیسے منصوبوں سے جن لوگوں کو اربوں ڈالر کمانے کا چسکا لگا ہے ان کے منہ سے سونے کا چمچہ نکل جائے گا۔

اگر میں استاد جمعہ خان کے مسودے کا بیان کرنے لگی تو یہ محفل لمبی ہوجائے گی اور پھر جس

مسودے کو کوئی پبلشر چھاپنے کو تیار نہ تھا اس کا رونا رونے کا کیا فائدہ۔

شائد تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے کہا۔

میری دادی کہتی تھی کہ دروازہ بچے بھی کھول دیتے ہیں مگر بند کر کے تالہ لگانے کے لئے کسی بڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہیں ملنے آئی تھی اور باتوں کے در کھول کر بیٹھ گئی۔ اب میں یہ دروازہ بند کرتی ہوں۔

جانے سے پہلے دو سوالوں کے جواب دیتی جاؤ۔ میں نے کہا۔

پوچھو۔ نینا نے جواب دیا۔

تمہارا مذہب کیا ہے اور پاکستان کو موجودہ حالات کے بھنور سے نکالنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ میں نے پوچھا۔

میرا مذہب انسانیت ہے۔ ہر مذہب کی بنیاد سچائی، خالق کی پہچان، اس کی حکم کی تعمیل اور اس کی مخلوق سے محبت ہے۔ جب انسان اپنی زندگی میں ان بنیادی احکامات کو اولیت دیتا ہے تو اپنی ذات کی اہمیت کو پہچان لیتا ہے۔ جو شخص جتنی گہرائی سے اپنے آپ کو پہچانتا ہے اس کے تخیل میں اتنی ہی لطافت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے خالق کے قریب اور دنیا کی آلائشوں سے دور ہو جاتا ہے۔ ربّ نے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے یہی پیغام دیا ہے اور میں یہ پیغام اپنے علم و عقل کے مطابق دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں۔

تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ عدالتیں ہر کرپٹ سیاستدان اور بیوروکریٹ کو قرار واقعی سزا دیکر ملک کو سیاسی آلائشوں سے پاک کریں۔ پاکستان میں عدلیہ آزاد تو ہے مگر دو ٹوک اور بولڈ فیصلوں سے کتراتی ہے۔ چور وزیر ہو یا وزیر اعظم یا پھر اس کا بیٹا۔ جو سزا ایک عام چور کی ہے وہی سزا ان خاص چوروں کو بھی ملنی چاہئے مگر بد قسمتی سے انہیں نہ صرف چھوٹ ملتی ہے بلکہ ان کی طرف سے بے دھیانی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے۔ اگر صدر وزیر اعظم اور وزیروں کو چھوٹ ہے تو عدالتیں عام لوگوں کو بھی چھوٹ دیں اور خاموشی سے اپنا وقت پورا کریں۔ بصورت دیگر ہر دولت مند سے اس کی دولت کا حساب لیا جائے۔ جج مصلحتوں کا شکار نہ ہوں اور لوٹ مار کی دولت واپس خزانے میں آنے تک صدر اور وزیر اعظم سے لیکر پٹواری اور تھانیدار تک سب کو جیل میں ڈالیں۔

آرمی چیف جرنیلوں کی کرپشن اور شاہانہ مراعات کا خاتمہ کرے اور جرنیلوں کو درجنوں پلاٹ

اور عالیشان محلات آلاٹ کرنے کا سلسلہ بند کر کے سادگی اور مساوات کا عملی ثبوت دے۔ آرمی چیف عدلیہ کا ساتھ دے اور جعلی جمہوریت کی پاسبانی چھوڑ کر عوامی جمہوریت کو فروغ دینے میں عوام اور عدلیہ کی پاسبانی کا فریضہ انجام دے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ جو کچھ آج پاکستان میں ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی ہے اور یہی اسے موجودہ حالات سے نکالنے کی ذمہ دار بھی ہے۔ اگر عدلیہ اور فوج پر جعلی جمہوریت کا سائیہ رہا تو آنے والا دور بھیانک اور بدتر ہوگا۔

آج پاکستان کا اصل حکمران رحمٰن ملک ہے اور اس کا مشن ملک کا حلیہ بھگاڑنا ہے۔ اگر رحمٰن ملک کی حکومت مزید دو سال تک قائم رہی تو شائد پاکستان موجودہ شکل میں نہیں رہے گا۔

نینا نے توقف کیا اور پھر بولی۔

مجھے پتہ ہے کہ تم آخری جواب کی وضاحت چاہتے۔ ہو مگر میں دروازہ بند کرنا چاہتی ہو۔ رحمٰن ملک کی حکمرانی پر فوج کیوں خاموش ہے اس کا جواب جنرل اشفاق پرویز کیانی سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ رحمٰن ملک کی جاسوسی کرنے والی کمپنی جسے آج کل رحمٰن ملک کا خاندان چلاتا ہے وہ کن ممالک اور کونسی شخصیات کو ٹارگٹ کرتی ہے اور کس ادارے کو معلومات فراہم کرتی ہے اس کا جواب جنرل پاشا کے پاس ہونا چاہئے۔ افغان مہاجرین اب تک پاکستان میں کیوں بیٹھے ہیں اور انہیں قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کیوں دیئے جارہے ہیں اس کا جواب شیر پاؤ اور پرویز مشرف سے لینا چاہئے اور یہ جواب لینے کا حق پاکستانی عوم کو ہے مگر انہیں اس کا شعور ہی نہیں۔

جب تک رحمٰن ملک کی پاکستان میں حکمرانی ہے، افغان مہاجرین پاکستان میں موجود ہیں، کرپٹ سیاستدانوں اور نوکرشاہی کے معاملے میں عدالتیں مصلحتوں کا شکار ہیں اور اسے عدلیہ کا صبر کہہ کر جج اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں، طالبانائیزیشن بڑھے گی، لاقانونیت اور جرائم میں اضافہ ہوگا، ملکی معیشت مزید تباہ اور ادارے برباد اور دیوالیہ ہونگے، فرقہ واریت خانہ جنگی کی شکل اختیار کرے گی، میڈیا کا کردار مزید منفی اور اغیار کا مددگار ہوگا اور سیاستدان فوج اور عدلیہ کی تضحیک میں اضافہ کر کے ان کے رول کو مشکوک کر دینگے۔

فوج اور عدلیہ جتنا جلدی رحمٰن ملک جیسے کرداروں کو سمجھ کر ان کے عمل کو روکنے میں کامیاب ہوگی اتنا ہی جلد پاکستان محفوظ ہوگا ورنہ دو سال بعد موجودہ سکرپٹ پر نئے کرداروں کا کھیل

شروع ہوگا اور اگلے سکرپٹ میں کردار امریکی، بھارتی، سعودی، ایرانی، افغانی اور برطانوی ہونگے۔

کیاتم نے جوناتھن کی تصنیف سیون پلرز آف وژڈم اور ہمسفرے کے اعترافات پڑھی ہیں؟ نینا نے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے کہا۔

وقت ملے تو ضرور پڑھنا تمہیں بہت سے سوالوں کے جواب مل جائینگے۔

نینا کچھ دیر خاموش رہی اور کھلے دروازے کی چوکھٹ پر نینا کی نظر ٹھہر گئی۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے چھلک کر سرخ وسفید گالوں سے پھسلتے ہونٹوں تک آ گئے جیسے ترچ میر کی ڈھلوانوں سے بہتا پانی گلیشئر کی دراڑوں میں گم ہوجاتا ہے۔

نینا خاموش سے اٹھی اور چلی گئی مگر اس کے جسم وروح میں رچی پاکستانیت اور وطنیت کی خوشبو سے ماحول معطر ہوگیا۔ میں نے دروازہ کھلا رکھا اور دیر تک اس راستے کو تکتا رہا جدھر نینا کا وجود انسانی بھیڑ میں جذب ہوکر گم ہوگیا تھا۔ میں نے ٹیلیویژن آن کیا تو آصف علی زرداری قوم سے خطاب کرر ہے تھے اور کسی لوہار کے وژن پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ دوسرے چینل پر بابر اعوان نے طنزومزاج کی محفل سجارکھی تھی۔ تیسرے چینل پر نواز شریف فوج پر تنقید کرر ہے تھے اور چوہدری برادران نواز شریف کو کوسنے دے رہے تھے۔ آگے الطاف بھائی تھے اور پھر مولانا فضل الرحمٰن تھے۔ میں نے ٹیلیویژن کا بٹن آف کیا تو پاکستان سے ایک دوست نے فون پر بتایا کہ آزاد کشمیر میں وٹو فارمولہ اور کائیرہ پلان کامیاب ہوگیا ہے۔ تازہ ڈرون حملوں میں پچاس اور کراچی میں ٹارگٹ کلنگ میں دوسو سے زیادہ لوگ مارے گئے ہیں۔ رحمٰن ملک سعودی بادشاہ سے ملنے چلا گیا ہے اور وزیراعظم نے آرمی چیف سے ملاقات کی ہے اور حالات کو تسلی بخش قرار دیا ہے اور ایرانی وزیر خارجہ پاکستان کے دورے پر تشریف لا رہے ہیں اور امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف اگلی جنگ پاکستان میں لڑنے کا عندیہ دیا ہے۔ لاہور میں پاکستان پائندہ باد کانفرنس منعقد ہورہی ہے اور حامد کرزائی بھارت کے دورے پر جارہا ہے۔

میں نے کوئی جواب دیئے بغیر کال منقطع کردی اور نینا کی بات پر عمل کرتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

مصنف کی چند دیگر کتب

1	تمہارے بعد	شعری مجموعہ
2	سر بکف	
3	ہلال کشمیر	
4	لینٹھا	
5	صائمہ	
6	میری وزارت عظمیٰ	(زیر طبع)